

از لقاء



moablib.org



مطبوعات

پروفیسر سید احتشام حسین نمبر

ادارہ

حسن عابد ، واحد شیر
راحت سعید ، ڈاکٹر محمد علی صدیقی

معاونین

زیبا علوی ، رؤف نظامانی ، محمد مظاہر

مجلس مشاورت

فارغ بخاری ، عبداللہ ملک ، ظہیر کا شمیری ، طہیق ابراہیم طہیق
عبداللہ جان جمال دینی ، رضا ہمدانی ، خالد علیگ ، اسلم رسول پوری
شاہ فقیری

فہرست

۷	راحت سعید	ہمارا موقف
۱۲		رپورٹ
۱۷	سید محمد نصیر	ارتقاء کی کمانی
۲۳	حسین محمد جعفری	تقارنی خطبہ
۳۱	رواک لطافتی	اردو ادب کی عقیدہ تدریج
۳۳	سحر انصاری	احشام حسین بحیثیت شاعر
۵۵	ڈاکٹر آغا سہیل	احشام حسین اور بالمشافہ
۶۱	ڈاکٹر محمد من	کلام احشام
۶۷	ڈاکٹر فکیل نواز رضا	احشام حسین اور جدید ترقی پسند فکر
۸۳	سید غور شید عالم	احشام حسین کے بعد عقیدہ کاکری سطر
۸۸	ڈاکٹر سلیم اختر	احشام حسین کا قصہ و ادب فکر

احشام حسین کے اثرات ترقی پسند تحریک

۹۷	عقین احمد	اور ادب پر
۱۱۹	ڈاکٹر فریدان فطہدی	ترقی پسند تحریک اور احشام حسین
۱۲۵	سید محمد عقیل	سید احشام حسین کی عقیدہ نگاری
۱۵۵	سید عاشور کاظمی	جس تک جو سکا ہے
۱۶۵	ڈاکٹر محمد علی مدنی	زمانہ حال کا ادبی حاضر اور احشام حسین
۱۸۱	خلیق ایراہم خلیق	محمد حاضر کا ادبی اور نگاری حاضر
۲۲۹	حسین النجم	بدو آدمی احشام حسین
۲۳۱	قریشی	ماہم یکہ شہر آرزو
۲۳۲	محمد رئیس علوی	احشام صاحب
۲۳۳	عقیدہ نقوی	احشام حسین کی بدو میں
۲۳۵	عقیدہ رازی	سفرنامہ نگار
۲۵۱		کوائف
		نگارشات سے انجمن
۲۵۲	احشام حسین	خود نوشت
۲۵۵	احشام حسین	بیلری کی خبر (علم)
۲۵۷	احشام حسین	تکثیر (افسانہ)
۲۶۰	احشام حسین	ادب اور تنقید
۲۶۷	احشام حسین	ادب کا ادبی تصور
۲۷۱	احشام حسین	موتور ادبی سورجوں
۲۸۷	احشام حسین	اردو افسانہ - ایک شکو
۲۹۱	احشام حسین	اردو میں ترقی پسندی کی روایت
۲۹۸	احشام حسین	اردو عقیدہ کا ارتقاء

۲۵۷

احسان حسین

میں کیوں لکھتا ہوں

۲۶۸

احسان حسین

نئی گراہد تحریک کے سیاسی پسو

۲۶۷

راحت سعید

پاکستان کی سیاسی صورت حال

لکھنے کے معزز و معزوت خدا

جناب ڈاکٹر قمر رئیس

کی اولرت میں طالع پوسے والا

نئی قہروں کا ترجمان سہ ماہی

نیاسفر

C-156 ورکس ہاؤس

دہلی-۱۱۰۰۹۵

بہا شکریہ

کاسمک ٹیکسٹائلز (پرائیویٹ) لمیٹڈ



دفتر: ۳ - امبرٹاورز - فرسٹ فلور

۲۲-۷/۶ پی ای سی - ایچ - ایں - شارع فیصل

کراچی ۷۵۴۰۰ پاکستان

فون نمبر: ۲۲۴۵۹۱ - ۲۲۳۰۷۸

کسیل COSMIC TEX

ٹیکس 23328 COSMIC PK

فیکس (92-21) 436867

ہمارا موقف

پروفیسر سید احتشام حسین سیدنا

ارقاء کا پلہ محسوس شدہ اردو کے جید ماہر کسی ادیب و فکرو، محترم استاد اور ہر معزز شخصیت پروفیسر سید احتشام حسین کے نام مکتوب ہے۔

ارقاء کے پلے شمارے علی سے خصوصی گوشوں کے صفحات میں ہم نے ان شخصیتوں کی پلہ تازہ کرنے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے جنہوں نے اپنی تحقیقات کے ذریعے علم و آگہی کے چراغ روشن کیے، سائنسی سوچ اور معروضی فکر کے دریچے دکھائے، مسن و فرد اور زندگی کی مثبت اقدار کو فروغ دیا اور انسانوں پر سیاسی، سماجی، فکری، تخلیقی اور جذباتی استحصال و مبرو قلم کے صفحات جاری عالمی جدہ حد میں پیا شعوری و جملہ ملی کردار ادا کیا۔ لیکن اردو ادبیات میں پروفیسر سید احتشام حسین ایک منفرد حیثیت کے حامل تھے چنانچہ ان کے فکر ہائے نمایاں کا احترام، ان کی خدمات کو حقیقت اور ان کی شخصیت کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ارقاء نے اس سال ۱۱ اور ۱۲ افروری کو ایک شہدائے زمین الاقوامی سیمینار منعقد کیا۔ اس سیمینار کی غایت بیان کرنے کے لیے دعوت نامے میں جس منظر کے طور پر

عرض کیا یا تھا کہ "مک کے اپنی، علی اور ٹھری حلقوں میں اس مسئلہ پر دو کرا، نہیں ہیں کہ اس وقت ہمارا سامان ایک ایسے دور سے گزر رہا ہے جب ہماری علی اور اپنی لکڑیوں میں زیادہ گہرائی کی ضرورت ہے۔"

"اگر اہل کے لوگ نے مسئلہ کو یہاں صورت حال کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا کہ موجودہ اپنی صورت حال، تحقیق و تنقید کے باہمی رشتے اور ادب و سماج کے باہم فعال حریت کے مسائل پر غور کرنے کے لیے قیدی اہمیت کے نگاہ اور منکر پروٹیسر سید احتشام حسین کی اعلیٰ پروکار، تین اور متواہن شخصیت اور فکر کے حوالے سے آج کی اپنی صورت حال کی فہم کا بڑا اظہار ہے۔"

"پروٹیسر احتشام حسین ایک ہر جہت شخصیت کے مالک تھے۔ شاعری اور انسان نگاری سے بدیہا احترام دست کش ہوئے۔ ان کے سفر نامے اس صنف محرم کے معرکہ آرا نمونے ہیں۔ اپنی تیار آواز میں ان کی محرموں نے اظہار بکثرت۔ اپنی تنقید کو ہر گیر نقد مہیات کے طور پر متعارف کرانے اور مستحکم بنانے والے رجحان ساز نگار کے طور پر سید احتشام حسین کا نام نہ صرف اردو ادب بلکہ بالواسطہ طور پر ہندوستانی ادبیات میں ایک دائمی نقش ہے۔ بزرگوں، ہم عصریوں اور نوروں میں یکساں ہر دور اور ہر محترم ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اسناد کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جس نے حقیقی معنوں میں اپنے شاگردوں کے ساتھ مثالی و شخصیتی موانست اخلاقیہ اور سیاسی جب ہے کہ آج ہر عصر کی جہاد کے کئی اسناد اور نگاروں سے یہ امر است یا بالواسطہ رشتہ تعلق رکھتے ہیں۔"

"جمہوری اپنی صورت حال کو ایک ہر جہت ادب کے حوالے سے سمجھنے کا عمل اس لیے بھی مفید اور ضروری خیال کیا گیا ہے کہ آج کے اپنی اقلیہ پر جو کچھ بھی ہو رہا ہے یا انکی موت کے بعد سے اب تک جو کچھ بھی ہو چکا ہے، اس بارے میں پروٹیسر احتشام حسین نے بہت واضح اشارے کیے ہیں۔ ان کی محرموں میں ہمارے لیے آج بھی ہم عصری مثبت یا ساتھ وقت فنی ہیں۔"

"پروٹیسر سید احتشام حسین میں اخلاقی سیمپار ایک دور آرمید، محترم و معجز نگار کے بارے میں محض بحث و تحقیق کا موقع ہی نہیں فراہم کرے گا بلکہ ادب کے حوالے سے ہمارے وقت کے معجز نام نگاروں اور نو قیدی کے سفر میں نئی راہیں کھائیں گے اور اس طرح شاید ہمارے سفر میں وہ احساس مسافت پیدا ہو سکے جو مفقود ہے۔"

"پروٹیسر سید احتشام حسین سیمپاری سماجی حقیقتوں کے ہنگام ادب کے ہم عصری کردار کے مصعب اور ثابت کے فہمی طوف ایک نام ہے اور ان نگاروں سفر میں اس حقیقت کے ساتھ گامزن

ہوے گا۔ اور دیکھتا ہے کہ ترقی پسند وہ دور فکر کے تابع عزت و تکریم منہ پر۔ پھر سید احتشام حسین کی بازیافت تخلیقی اور تخلیقی ادب کی سہولتوں میں سرگرمیوں ہم عصر ہوں گے۔ بچے میں اور مثلاً سید کی بازیافت ہے جو۔ صرف اپنی تخلیق کے میدان میں ملے نہ تھے کے کارور میں ان کی راہوں کو ملو کرے گا

”پروفیسر سید احتشام حسین نے یاد آوری جدید اور جدید کے ایک بہت بڑی طرز فکر بازیافت کی لکری تخلیق اور تخلیق کی طرف ایک قدم ہے سید احتشام حسین سہادی صوفی سے اٹھ چکے کے باوجود بھی ہماری تحریروں اور دہائیوں میں گہری صمیمیت کے طور پر رہا ہیں اور یہ دور۔ سید سید سادات خواجہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ سید احتشام حسین وہاں ناقص نظر آتی تھی ہم اور موثر ہے“

سید میں پیش کیے جانے والے مقالوں کے ساتھ ساتھ سید احتشام حسین صاحب کی تخلیقات میں سے ایک مختصر انتخاب اس شملے میں آپ کی مدد ہے۔ ان انتخاب کے بارے میں ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ یہ سب کی سب تخلیقات میں مگر ان کی کئیوں کی تائید کے اس حد میں یہ چند تحریروں ادب کے مختلف رجحانات اور زندگی کے بہت سے گوشوں کے بارے میں احتشام صاحب کی سوچ اور انداز نظر کے دراک میں سبوں بھی سوں کی اور ہم عصر تخلیق کاروں کے ہے نقد ادب کا ایک سہارا، سخت مدد تخلیقی رجحان کے ہے پھر اور ادب میں اسل دوسری اور ترقی پسند سوچ کے حصار اور کامی کامی کی

مقدمہ کا خاکہ سے پڑھیں۔

۱۹۹۲ء ۲۰۰۰ء ”ازنگاہ“ نے ابتدائی رفاہ میں سے ایک سہارا سے عزیز دوست اور ہم سفر، خیر محمد لاشاری بہت کچھ اپنی مدد سے ”ازنگاہ“ نے ترقی اور مدد سے ”ازنگاہ“ کے ہے Cover کے لاہور سے سلام، ”نیشی“ میں مانتے ہوئے مدد کے ہے کے سب حالات سے دوچار ہوئے اور میں ان میں میں دیکھتا ہوں کہ سب کے ہے رخصت ہوئے

جو بہت اچھے اور ان کے بہت دور شخصیت کے حامل انسانیت اور ان کی تخلیق میں اسل دوسری اور ان کی مدد سے ”ازنگاہ“ نے خیر محمد لاشاری کی رخصت کے ساتھ ہی سہارا کا ایک روشنی پرانے بھی کچھ کیا اور ملو کی، جس اور ”تخلیق“ میں سے وہ امکانات بھی معلوم ہو گئے جو ان کی ذات میں موجود تھے ان کی موت۔ صرف سندھی شاعرین، سہارا نگاری سطر

بہر نگاری مضمون نویسی اور امید نویسی کے لیے ایک ناقابل غفلت حصہ ہے بلکہ اس قوی تصویر نگاری کے لیے مکی شہید و چمکا ہے جس کے لیے ارتقاء کوٹلے ہے۔ اور ارتقاء اس مانعہ پر ان کے ہمراہ ہیں اور حبیب کے قلم میں شریک ہے۔ غیر عمدہ لائبریری سے ہمیں غالب کی زبان میں مکی شکایت کرنی ہے کہ

تم اپنے کلموں کے حقے کھرے داد و سہ کے
کرتا ملک الموت کھسا کوئی دن اور

(صفحہ ۳۳ سے ۳۴ خطہ ۱۰۰۰)

راحت سعید

تمنا از افسانہ نگار و معروف اذیب
ڈاکٹر آغا سہیل کے کتابیدے

بدست ہے رنگ آسمان، اسفند خبار کوچہ جاناں نالہ
شہر ناپرساں • دیستان بگھنو کے داستانی ادب
تل برابر آسمان • کلا ارتقا تنہید

ہے • ارتقا مضبوطیات

ارتقاء و حیات ہے کوٹلے

گوشتِ ارب

چلچل رہا

بک لینڈ

جناح رہا



ان کے بارے میں سب سے زیادہ معلومات کے لئے پروفیسر حسین احمد قاسمی سے رابطہ کیا گیا۔
 پروفیسر حسین احمد قاسمی (پیدائش: ۱۹۲۵ء) ایک ممتاز محقق اور اسکالر ہیں۔
 ان کے بارے میں مزید معلومات کے لئے پروفیسر حسین احمد قاسمی سے رابطہ کیا گیا۔

پروفیسر سید اقصیٰ حسین بین الاقوامی سیمینار

۱۱-۱۲ فروری ۱۹۹۳ء

احتشام حسین کی شخصیت اور اہمیت پر روشنی ڈالی۔ احلاس ختم ہوئے سے پہلے پروفیسر حسن عابدی
 قلم سرائی گرائی کا حکم دیا تھا۔

بجلی پہلے جاتے کے باعث چاہئے گا کہ وہ کتنی احلاس کے احتشام سے پہلے ہی کر دیا گیا تھا۔
 اس کے بعد جب گہرونی دلدرد شروع ہوئی تو گزشتہ احلاس کی تکمیل کے فوراً بعد دوسرا احلاس شروع
 کر دیا گیا۔

دوسرا احلاس اس کا عنوان ”پروفیسر سید احتشام حسین شخصیت اور جنس“ تھا۔ اس
 کہو سے آئے ہوئے محترم و معزز ڈاکٹر اور پروفیسر احتشام حسین کے شاگرد حبیب ڈاکٹر عقیل رضوی کی
 مدد و اثرات میں شروع ہوا۔ اس احلاس کی مجلس صدارت کے دیگر رکنی ملک شاہ الحق حقی، جناب
 حسن عابدی، ڈاکٹر سلیم حق اور جناب ماشور کاظمی تھے۔ اس کی علامت کے فرائض سندھی کے
 معروف شاعر، سید نازک حسین نے ادا کیے۔

سب سے پہلے جناب شاہد حقوی نے منظوم تراجم عقیدت پیش کیا۔ اس دور میں سندھی
 کے اہم ادیب و عقیدہ نگار جناب ریاض طاقانی، اردو کے ممتاز شاعر اور سید عتیقہ فخر پروفیسر عمر اصدادی،
 بلوچ سے تشریف لائے والے مولیٰ مصطفیٰ ادیب، انیسٹریٹ ڈاکٹر اور پروفیسر احتشام حسین کے شاگرد
 ڈاکٹر قاسم اکرچی پوچھوٹی کے شعبہ اردو کے سابق صدر و شاگرد، احتشام حسین ڈاکٹر شاہ علی اور علی
 سے تشریف لائے والے ممتاز محترم ڈاکٹر ”ادیب و دانشور“ احتشام حسین کے شاگرد رشید ڈاکٹر محمد
 حسن نے پروفیسر احتشام حسین کی شخصیت کی تواناؤں، محنتوں اور اس کے گہری اور علمی کارناموں پر اسے
 گراں قدر مقالے پیش کیے۔

آخر میں صدر مجلس ڈاکٹر عقیل رضوی نے اپنے صدارتی کلمات کے ساتھ احلاس میں
 پڑھے کے مقالات کا ایک مختصر جارویہ حاصل دینی کا جے ضرور احتشام پیش کر دیا۔ ملاقات و آراء سے
 رات دس بجے تک سرد منہ ہو کر بار بار رعاست مجلس کے صدر صاحبوں سے عشاء کے میٹھے میں شرکت کی اور
 یوں میدان کے پہلے دن کی کارروائی اختتام پزیر ہوئی۔

دوسرے روز ۱۲ مہدی حقی اور محمد کادون تھا سید کا عبیر احلاس بجلی پہلے جاتے کے
 باعث قدرے تاخیر سے شروع ہوا۔ اس کا عنوان تھا ”اردو ادب اور ترقی پسند تحریک پر پروفیسر سید
 احتشام حسین کے اثرات“۔ اس احلاس کی صدارت ڈاکٹر عبیدت بریلوی نے کی۔ مجلس صدارت
 جناب سید لکھنوی، جناب شوکت مدحتی، ڈاکٹر امجد احمد اور ڈاکٹر حسین محمد عقیل پر مشتمل حقی
 اس کی علامت کے فرائض معروف محقق و ادیب جناب افضل احمد نے انجام دیے۔

اعلاں کی حد، معروف شاعر حبیب قریشی کے منظوم خراج عقیدت سے بنی اجنب
قریشی کا جون ۱۹۶۳ میں انتقال ہو گیا اس دور میں ڈاکٹر نواز رشید، کینڈا سے آنے والے حبیب
خورشید عالم، لاہور سے تشریف لائے والے مشہور نقاد ڈاکٹر سلیم احقر، پروفیسر عتیق احمد، ڈاکٹر فرہین
لجھپوری اور ڈاکٹر حفیظ صوفی نے اپنے فکر و تحیر مقامات میں اردو ادب اور ترقی پسند تحریک پر پروفیسر
سید احتشام حسین کے دور رس اور گہرے اثرات کا جائزہ پیش کیا

یوں تو حاضرین سے تمام مقالوں کو موردِ اور دلچسپی سے سنا اور ان نکات کی جو اہمیں پسند
آنے لگیں کی صورت میں داد دی مگر ڈاکٹر فرہین لجھپوری کے شگفتہ انداز و تحریر وہاں کو لوگوں سے
خصوصی طور پر پسند کیا۔ محمد عکس کی تقریر کے بعد چائے کے وقفے کا اعلان کیا گیا

یہ تھا اور آخری اجلاس تقریباً بجے تمام شملہ ۲۰۱۱ اجلاس کا عنوان ”حدِ عامہ کا
ادبی اور فکری تناظر“ تھا اس مجلس کی صدارت معروف سماجی شخصیت حبیب حکیم محمد سعید اقامت
مقام کو رہ سہہ) نے کی جناب ڈاکٹر محمد مسن، جناب جمیل الدین علی، جناب فرہین لجھپوری اور
جناب حسین محمد جعفری مدنی کرسیوں پر مقرر تھے۔ اس اجلاس کی عظمت کے مراسم مقبول شاعرہ
فاطمہ مسن نے انجام دیے۔

سب سے پہلے رئیس علوی نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا اس کے بعد ڈاکٹر محمد علی
مدنی، ماسٹر کاظمی، ڈاکٹر افتخار احمد اور خلیق، ابراہیم خلیق نے اپنے مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر محمد علی
مدنی کا مقالہ سب سے حاصل مجلس تھا کہ اس میں عالمی عصری ادب میں پائے جانے والے تنقیدی
ظہوریت کا جائزہ لیا گیا تھا اور اردو ادب میں ان کے اثرات کے تحت پائے جانے والے رجحانات کا
تھاکہ کیا گیا تھا۔

اقامت سے قبل ڈاکٹر مسن محمد جعفری سے پورے سید کا ایک مختصر جائزہ اور احتشام
حسین پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

بعد میں حکیم محمد سعید نے بی ضروریات کے سب درمیان ہی میں صدارتی کلمات
پیش کیے اور صدارت کر کے چائے کے سب آخر میں ڈاکٹر محمد مسن نے اس اجلاس میں پیش کردہ
مقالات کا جائزہ اور ترقی پسند تحریک اور احتشام حسین کے ظہوریت کے حوالے سے بعض اہم نکات
پیش کیے

ارتقاء سید کسینی کے سیکرٹری پروفیسر مس عابد سے ملنے سے آئے ہوئے صاحبان گرامی،
مقامی فاضل مقالہ نگاروں اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا جس کے بعد تقریباً بجے عشاءِ بجا اور یوں

یہ دور دردمیدار ہے، اختتام کو پہنچا جس کو مصروف شاعر اور کامیاب میں جناب قسطل الدین علی سے اپنے کام میں اکتے شکر اور میدار اور ایک اہم ایونٹ (Event) قرار دیا

میدار کے ماحول کے اختتام اس کے صدر کو اور دارقادر کے اراکین مقررہ رہا علوی، جناب داحد بشیر اور جناب رونق مظاہر سے باقرتیب ارتقاء کے شہروں کا ایک جیتہ طور محدود پیش کیا جناب حکیم محمد سعید چونکہ احباب کے درمیں تشریف لے گئے تھے ان سے جناب محمد مظاہر انکس یہ جیتہ پیش کر کے۔

ان میدار میں تقریباً سیم سو ۴۰۰۰۰ ادیبوں، شاعروں اور ماحول رونق کی شرکت، اس کی دلچسپی، اس سے علوی مسائل کی جناب کوؤں کے برحقے ہوسے رکان کا مقررہ ہے پر دلیسر مسید، احتشام مسیس کی ترقی پسند فکر اور دانش جیل نظریات کے حواسے سے ان حلاسوں میں جو پطر مقامات پڑھے گئے اس سے صرف یہ کہ ان کامیابیوں میں اجاڑ ہو سکے ایک ایسی لک کی تخلیق میں بھی کامت ہوئی جو ایک ترقی پد ماحول سے میں سمائی اس و علوی طور پر، اور جن اس کو خصوصی طور پر جدید حد سے مسائل سے رانگی ہوئی کے ساتھ صدر، آہوسے میں مدافق ہے

ہجرت کی دھوپ میں نرپانے والی نرہجرت شاعری کے خالق

عابد جعفری

کا جیسوئے کلام

”سپنے جاگتی آنکھوں کے“

پبلشرز، انسٹی ٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ اینڈ ڈیولپمنٹ، لندن۔ پاکستان: مکتبہ دانیال، وکٹریز چیمبرز - ۲ عبداللہ ارون، دہلی۔ کراچی

ارتقاء کی کہانی کچھ اپنی کچھ اس کی زبانی

پروفیسر سید محمد نصیر

مدد محترم خواجین و حضرات

ارتقاء کی کہانیاں ۱۹۸۱ء سے شریعت سنائی ہے اور برابر ان کے بڑھ رہی ہے۔ اور وہاں میں اس سے پہلے یا تو اہل رہے لگتے تھے یا محرم حکم ہند سے پہلے "علم اللہ" کی طرح کے کچھ رسالے یہ پرچہ اپنی وجہیت کا پہلا پرچہ ہے وہاں آپ کو وہ آئینہ بھی ملے گا جس میں آپ کو اپنے محبوب کی تصویر بھی دکھائی دے گی اور دنیا کی عورتوں کی بھی یہاں آپ کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ آئینہ سازی کیسے عمل میں آتی ہے آپ۔ صرف یہ جانیں گے کہ آئینہ ساز کے دھنسی عمل کا قانون کیا ہے بلکہ آپ کے اندر اس آئینے کو ستر بے کی تربت بھی پیدا ہوگی گویا عمل آئینہ ہی۔ دیکھیے بلکہ آئینہ سازی کی کرشمہ سازوں کا جادو بھی دیکھیے

ارتقاء کی کہانی کو یہ روپ دیا جاتا تھا کہ کام سب سے یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں ارتقاء کی تعلیم دیکھا آتی ہو، جس کا انداز فکر سائنسی ہو، جو چاہتے ہوں کہ کائنات اور سماج میں وقت

کے ساتھ تغیر و تبدل لازماً ہوتی ہے اس میں دھماکی تو ہمیں بدقت کار قرار دینی چاہیے۔ مگر خلقِ حوی
شعور اور حواس سے کام میں چلتا کائنات کو سیراب کرنے کے لیے بہروں پر آجیلے ڈالے پڑتے ہیں
نہیں دل سے دیے طلبہ کی صورت ہوتی ہے وہ حدِ شیر کا ہی یہ شعر ہے

کنجِ ہمدانی سے مہمیِ حاصلِ تنک
غونِ دل سے دہے طالعیں گے

(واحدہ بشریہ ارقاء، شمارہ ۴۰)

لڑائیوں کی اس دنیا میں جہاں چند ملکوں کی خاطر دہائیوں کی جاں تک لے لیا گیا کہ وہ کھانا
اسے جہنم کھتے ہیں اور وہی کھتے ہیں، ہاگس پر کھتے ہیں۔ ب سے جس میں پہلے کی بات ہے میں
ایک کام سے سوچا چلا گیا (انہوں سے پوچھا کہ سرحدِ مصویٰ کس شخصیت میں کسے گئے کون مصویٰ
لہذا مصویٰ یا ہاگس مصویٰ میں جلتا تھا میں سے مسکرا کر کھانگے ہاگس رضوی ثابت آپ بھی جان گئے ہوں
کے کہ ہاگس مصویٰ کون ہے اس میں ایک شخص مصویٰ اور کھانگے ہاگس کھانا ہے اس پر پڑے کو کھانا
اور جلتا بھی ایسے ہی ہاگس کے بس کا کام ہے اور اس کے ہم ارقاء کی پیشکش پر لکھے ہوئے ہیں
جو کام ہماری جماعت کو کرنا چاہئے تھا وہ جوہر بنی کے پروفیسر کا فرض تھا وہ یہ حضرات ہاگس
ہاگس ۱۹۴۱ء سے رہے ہیں اور یہ لوگ پہلے ہاگس کے ہزار پر ہلائی کر کے جھنڈ کر رہے ہیں۔
روایت ہی میں ہے۔ "ڈاکٹر عبدالسلام لکھتے ہیں "ہمد سے حکمران (اور ان کی فوجی حکومتیں)
ہمد سے ماننے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ حکمت کو بے قائم کرنے میں ان کی تو تمام تر قوت و حرارت
تعمیر کرانے کے لیے وقف تھیں تاکہ ان کی سلطنت کی یوگیا بنی رو ماننے انہوں سے کہ یہ روایت آج
میں قرار ہے " (پاکستان میں ماتمی کی حیثیت۔ ارقاء، شمارہ ایک)

اور لیکن جوہر بنی کے پروفیسر میکمل سوارد چک کے تجزیے کے مطابق جب ترقی پزیر
ممالک میں تحقیقی مقامات کی اشاعت میں ہر سال ۲۰ فیصد کا اضافہ ہوتا ہے پاکستان میں ایسی حالتوں
میں بین طور پر کی ہوئی ہے۔ ہلائی وجہ بھی آپ سن لیجئے ڈاکٹر عبدالسلام نے منصوبہ ہندی کمیشن
کے ایک مائل جبرین سے جب کہ پاکستانی ماننے وقت ساتھیوں انہوں سے بھی مشورہ کر لیا کیجئے تو
جانتے ہیں موصوف کے کیا فرمایا "میں ساتھیوں انہوں سے مشورہ کیوں کروں؟ اب میں اپنے ہلائی
سے تو نہیں پوچھتا مگر تاکہ اچانک کیسے چلتی۔ " سماجی سائنس میں حالت اور بھی زیادہ بری ہے۔

اس مسئلے میں ارقاء ہمد و ہمد و ہمد میں مصروف ہے اور اپنی منزل بس طے کر رہا ہے۔



مطالعہ لڑائی کو بھی استعمال میں کی مسجد، گوجرانوہ

اپنے پہلے لوہارے میں اس نے لکھا "ہم اللہ کے تعلیمی عمل کے اپنی علی اور گہری مظہر کو اپنی بسلا حرکت جا کر کے آپ کے سامنے پیش کرنے کے لیے ارتقاء کے ساتھ حاضر ہو رہے ہیں۔" اس منزل پر پہنچنے کے بعد اس نے اپنی منزل پر عملی سن ۱۹۱۰ء سے اس نے ارتقاء سیمینار کا انعقاد شروع کیا اور ارتقاء کے تحت ۱۵ اور ۱۶ اگست کو پہلا سیمینار منعقد کیا گیا۔ موضوع تھا "اشتراکیت کا بحران نظریہ اور عمل" بیسویں صدی کے اوائل میں سب سے بڑا دھماکہ ۱۹۱۷ء کا اشتراکی انقلاب تھا اور ۲۰ مراد دھماکہ ۱۹۹۱ء میں ہوا، جب سویت یونین کے بددینہ دیکھ کر کے اس کا حق سرور تھا اور "مراد ارتقاء کے سر ہے کہ اس نے دانشور مشر من سو محو کیاں چھ دلی رضا کا علم اور اجمل خلک سے منکالت لکھوا ڈالے۔ سیمینار راجی میں اپنی دانش کا اہم ترین اجتماع تھا اس سیمینار کی ایک اہم بات یہ تھی کہ اس رجحان میں روسی رہاں کا خط جو رہاں رد ہوا اپنی گھوس ڈاسٹ (کشورہ جلیلی) اور اس سیمینار میں لکھ رہا رہی اس بات کو بڑے محی کا تھا Let hundred flowers bloom and let hundred schools of thought contened ہر نوع، ہر محووں کو کھیلے دو اور تمام مکتب فکر کو ایک دوسرے کا سامنا کرے دو۔ شاید گریز کی ایک اہم وجہ یہ بھی رہی ہو کہ اشتراکی جمہوریت کو سراہے دارانہ جمہوریت سے آگے جاتا تھا جیسا سین نے کہا تھا لیکن یہ معاشرے نے تریں آمریت بن

سوئے منزل جو
منزل میں جا رہی
کوئے دلدل کی منزل
دوش پہ اپنی سسلیں اٹھائے جو

(حصہ ۱، ارتقاء شمارہ ۲)

کوئے دلدل کی جانب ارتقاء کا یہ فائدہ اس میں اس ہے ارتقاء سے ایک اور ریت ڈالی
ہے اور وہ ہے پندرہ ورہ سیمپر پئے مانگے مانگے کی جگہوں پر مسجد بنانا تھا یہ ایک دستور ہے
ہم لوگ دنیا دہی کی بہت تو کرتے ہیں لیکن خود کو بدلنے سے کتراتے ہیں۔ ہماری یہ روایت ہے کہ
وقت کو اہمیت میں دیتے لیکن یہ سیمپر وقت مقررہ کے دس منٹ کے بعد بعد شروع ہو جاتے ہیں
پئے تو شترائیت کے بھران پر ہی سیمپر ہوتا رہا، پھر اس وقت کے اہم ترین موضوع سسلی تلاوت
پر متواتر مضامین پڑھے جاتے تھے اور بحث ہوتی رہی اگر آپ تسلیم اور پاکستان میں سسلی تلاوت
کی اہمیت سمجھنا چاہتے ہیں تو اپنا چاہتے ہیں تو ارتقاء صوبہ پڑھیے۔ اس سلسلے میں ارتقاء سے پئے
پڑھیے دہلی کے نئے شمارہ ۵۰-۵۱ اور ۸۱ میں مقررہ سواد پیش کیا ہے اور اس سلسلے پر کل چودہ مضامین
شامل ہیں۔ جرنل سولی کہتے ہیں کہ "جمہوری اقتدار کی عدم موجودگی اور طویل جاہلانہ طرز حکومت کی وجہ
سے بد اثرات اور معائنہ سازی کا عمل جاری۔ روئے اس کے نتیجے میں کم تر افادات یا لڑنے علاقائی گروہوں
میں حساس اجمیت اور سنگائی میں شدت پیدا ہوئی۔" حمایت اقتدار کا مہا ہے کہ نسلی قوم پرستی کے
سے کہ اس فہم سے جیسری دنیا کے ساتھ ساتھ دوسری دنیا اور پہلی دنیا میں قائم دشن مہال صورت کو
بھی کسی قسم کی تقویت ملنے کے بجائے شدید خطرہ میں (ارتقاء شمارہ ۵) اس مضامین کو پڑھیے
محسوس ہے آپ اور ستر جرنل کریں افغان نکاح اور صلہ پیش کریں

ارتقاء پلا پڑھ رہے ہیں آپ کو تصویر کائنات بھی ملے گی۔ کھیلانی کائنات بھی دکھائی
دے گی، محل، ماسٹر اور طاقت کے درمیان رشتے تلاش کیجیے دشن مہال کی گہری ساس پر نظر ڈالیں
، آزادی، علم اور اس پر مایہ پائندہ یوں ہی روئے اوئے۔ آزادی موجود کمزور بھی آپ کی نظریں اور واضح
ہوگا غرض کہ کائنات و حیات کا کوئی کونسا ایسا سس ہے جس پر روشنی پڑتی ہو کل کو سمجھ کر ہی
نظر سے میں دھند دکھائی دتا ہے اور جہ میں کل دکھائی دتا ہے اسی طرح زندگی کی بلک سولی ہے اور
روح میں بلیدگی آتی ہے



لاہور میں قسطنطنیہ میں احمدیہ لٹریچر کے شائع ہونے پر

تعارفی خطبہ

ڈاکٹر حسین محمد جعفری

پروفیسر سید احتشام حسین صاحب کے فن و شخصیت پر اس دورہ سمیڈار کے اس اعلیٰ اجلاس میں تعارفی خطبہ پیش کرنے کا عرض میرے دے کیا گیا ہے۔ یہ فرض جس قدر خوش گوار ہے اعلیٰ مشکل اور دشوار بھی خوش گوار تو اس لیے کہ احتشام حسین صاحب کی شخصیت ہمہ جہت بڑی خوش گوار اور پر کشش تھی مشکل اور دشوار اس لیے کہ ان کے فن کی گہرائی اور گیرائی بلند ہوں گا کہ خطبہ تعارف کرنا ایسا ہی ہے جیسے ملا ادب کے عظیم سہارے اس کے عروج و موسوعات اور اس سے متعلقہ سلیقہ معاشرے اور اقدار کا یکدم وقت تعارف کرانا اس لیے کہ اصنام حسین صاحب کا فن ایک جداگانہ انداز اور منفرد حکیمانہ بصیرت کے ساتھ اس سب پر محیط ہے ایک ایسے دانشور کا تعارف جس کے فن کی وسعتیں مشرق و مغرب کے اہل ماحول و سمندر کو پہنچے ہوئے ہوں مشکل تو ضرور ہے لیکن سب کی سب خصوصیت شعل راہ بھی ہیں اور اس بات کا جواب بھی دیا کرتی ہیں کہ "ارتقاء" ہے اپنے اس سمیڈار کے لیے پروفیسر احتشام حسین صاحب کا انتخاب کیوں کیا

دوسرے تمام ادبیات کی طرے اردو کا ادب تھا اور دانشور آج ایک دور ہے پر سکر ہے مروجہ دہانے ظاہر نوجھے ظہر کرے ہیں نظریاتی دستکیں ایک ہی تعبیر اور تشریح کا مطالبہ کر رہی

اب ارکھاء یف و سج و عربیوں ہیث فارم ہے ملک یف جانب شمس بالنگ کے ساتھ
 ہندو عہد اسلام و آتشہ و ہودھان ایم یوحی و آتش مشر حسن ہتتر آتسریدی ہتتر آتسر ایس
 مد عارفی خود و آتسر مد علی پردھیم اقبال و نقد علوم و سماجی مسائل کی رہیں کھولتے
 تھیں گے اور پڑھنے والے و نصیرت عطا کرتے و اصل اس کے دوسری جانب و آتسر کر رہیں،
 دانش سہیل و آتسر مد علی مد علی اور دانش شارب علی، تھیں، حتر مہیں، اسے پوری، احتشام
 مہیں ممتاز مہیں اعلیٰ کی رویت کو گے رہا ہے میں اہمیں میں اور المدی شہ و آتسر پھیل،
 ہاں یہ، تہی، و آتسر مصلیٰ، ایم، راہ و ما و شاعری میں احمد مدیم اہل نگاری، کشور تہیہ، آتسر پاز،
 آتسر، ہاں، مہید و راج، اہوں، یلیا، اسی، تھی، ہتتر و مہید اور بہت سے دوسرے محفل جاتے ہوئے

تھیں

ارکھاء کی یہ کن کو کہہ سکتا ہے جس کا یہودی قصہ سماجی محل اور سماجی فکر آفرین ہے
 جس کی کہانی کئی پانوں پر تصویر کی ہے جس میں کہانی میں شعور کی راہ جاری و جاری ہے وہاں وہ ایم
 رہا، اسی جاگرتے کے میں ہوں سے اس اپنا ہتتر دیا میں تھیل کرے میں اپنا خون بھر دیا ہے
 ارکھاء میں ان کرداروں کی علیحدہ گیری ہے، دیکھیں میں گیری میں سٹے محفل کھڑے میں جس کے
 بارے میں ایک قاری نے اہیں لکھا کہ گریس مد میں بہت پر مٹی حرام۔ ہوتی تو میں آپ کو
 اپنا دیا تا جا کر پوجا کرتا، دیکھیں لکھا سہیل اور تھیل، پل ایک گوشے میں کھڑے ہیں اور ان کے
 مد و جان پوری طفت اچا کر ہیں کہل مد مد جی تھی و مدی، مانے، مٹھے میں ایک کوئے میں
 تھیں، ہاں مدیم ایک آس میں راس سے سزا آ رہا میں اور ہم سے کہ رہے ہیں کہ "اوسہاری خود تھیں کی
 کو تھ میں جو دیا تا سونے میں "اوسہاری طرف دیکھتے ہیں "ارکھاء شہد (۲) اور ارکھاء انہیں ہتتر دیا
 دیے کے لیے اس کارر رہتی میں مصروف مد ہے ارکھاء کی بھی کہانی ہے

تھیں

میں بہت کچھ نوٹ، محنت ہو چکی ہے اور، میرا اس شکست و ریخت میں سے ایک نئے راستے کی تلاش اور پرانے نظریات کی نئی تشریح کی جستجو ہے لیکن چار راستوں کو دکھانے کا، روشنی مکمل سے آگئی، مئی محل میں شمع محفل کون جلتے گا، سرحدوں کے اس پار کے سوتے حلق بھی ہو چکے اور نوٹ، محنت کے پتھر بھی، سنی، دو سو اہت ہیں جس کے جواب کے لیے ہم اپنے اہل سراے کی قد آور، شخصیتوں کی طرف دیکھ رہے ہیں، اس شخصیتوں میں احتشام حسین ہم کو ایک سید، شہنشاہ، ایک اور، ایک استاد، ایک منکر اور ایک معلم کی طرح، اپنے دھیرے دھیرے ابرم راج، لمبے اور مضطرب منکر، انہوں کے ساتھ، اہتمام، اعتبار، کنوین کی علامت بن کر نظر آتے ہیں، عہد و فکر اور تلاش کی اس محفل کے لیے ہم نے احتشام حسین صاحب کا، عجب اسی لیے کہا ہے، احتشام حسین صاحب کے حوالے سے اس سید کے لیے ہیں موضوعات کو خاص طریقے سے موضوع فکر بنایا ہے

۱۔ پروفیسر احتشام حسین، شخصیت اور جنس

۲۔ ادیب اور ادبی پسند، محرک پر پروفیسر احتشام حسین کے اثرات

۳۔ عہد حاضر کا ادبی و فکری مناظرہ

حال تک پہلے موضوع یعنی، احتشام حسین، شخصیت اور جنس کا تعلق ہے، مجھے طرز ہے کہ اگر میں پہلو، میں متعلق کے ساتھ بھی کچھ کہنا چاہوں تو میرا عہد، وقت، عہد ہو جائے گا اور میں چند صدی، شاید، مئی۔ رکتوں کا میری طرف بدل سکتا ہے، اور حضرات، شریف، فرما دیں جس کو احتشام صاحب سے شرفِ حمد حاصل ہے، انہوں سے بہت قریب ہے، ان کو ایک استاد کی شکل میں دیکھتے ہیں جو محنت، مشقت، طویل اور انشائیہ کا مجسمہ تھے، ان کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ان سے سب سے زیادہ قریب ہے، وہ ان استادوں میں سے تھے جس کا یہ اندازہ بہ انشاد و تاج، شخصیت، یاد ہوتا تھا، وہ جس قدر اپنے الفاظ سے متاثر رہتے تھے، یہی جی، خاموش اور پر محسوس محبت، بھری نظر میں ہے۔

ذات و صفات ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم میں، اسلئے جب سے پہلے کہ کو اور ایک دوسرے کو پہچانا شروع کیا اس وقت سے ذات کو صفات ہی کے ذریعہ پہچاننا اور پختہ صفات محدود انداز میں پس منظر کو سمجھنے کے لیے صفات کو سمجھنے کے لیے ذات یا شخصیت کی معرکوں میں حیثیت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے، پہلی تھیں کڑی میں ان دونوں کا امتزاج، تخلیق کو اختیار، عقل اور مضمون، بحث سے، اگر ادیب کی شخصیت اس کے صفات کی آئینہ دار ہے، تو خوش کن الفاظ، تھوڑی اور

کے ہے گاؤں کو بھنے نو مہر لگتے ہیں لیکن اثر پذیر نہیں ہوتے یا ان کی عمر بہت مختصر ہوتی ہے لیکن جب ذات وصفت ہم آہنگ ہو کر اپنی تھمیں کے عمل کو بروئے کار لاتے ہیں تو اس کے من کو اعتبار مل جاتا ہے اس کی تھمیں عمل اپنی کوشش ہی نہیں رہتی بلکہ معاشرے اور مسلح کے اقدار کی مظہر اور ترجمان بن جاتی ہے۔ اہتمام حسین صاحب یہاں ذات وصفت کا استخراج اور ہم آہنگی کچھ اس طرح نظر آتی ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی شخصیت اور من کی یک وحدت ہے جو ان کے من کو محسوس جب اور چلتی نکلتی ہے ایک ایسی چلتی جو کلمہ کے معانی سے آگے بڑھ کر دلوں کی گہرائی تک اتر جاتی ہے۔ یہی وہ صفت ہے کہ ان کے اعلیٰ رجحانات اور میلانات سے بعد انشراح رکھے والے بھی اس طرح ان کے قدرواں وہ ہے کہ معلوم ہوتا تھا کہ خیالات و نظریات کے دریاؤں کی دوری کے باوجود بھی سنگم کا پیدہ ہونا ممکن ہو سکتا ہے۔ شاید یہ اہتمام حسین صاحب ہی تھے جن کی موت پر ان کے نظریات یا دوسرے فکر سے نکتہ اختلاف رکھے والے مولانا صاحب الدین عبدالرحمن اور مولانا عبدالجبار دریا آلودی جیسے حضرات نے لکھا "اہتمام حسین صاحب کو مرحوم کہتے ہوئے قلم تھرا جاتا ہے۔ وہ روٹا ہے۔ آنکھیں مہم ہو جاتی ہیں ان کی موت پر دواں دواں سو گوار ہے۔ صبر بھی یاد آتے ہیں ان کو چوٹ لگتی ہے کسک محسوس ہوتی ہے" اعلیٰ تحقیق کتب فکر کی طرف سے اس طرح کے تاثرات اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اختلاف آراء کے باوجود ایک



پیراہ قلم ڈاکٹر سعید علی شاہ بخاری اور ڈاکٹر محمد عسکری لہذا ہیں

ادب اپنے مسک پر سختی سے قائم رہتے ہوئے کس طرح معاشرے میں سخت مندر روایات قائم رکھ سکتا ہے۔

کسی مغربی صاحب سے کہا تھا کہ "ہندی میں ہم بہت بڑے آدمیوں کو پائے گئے اور کچھ چھ آدمیوں کو لیکن بہت تھوڑے ایسے دو ہو گئے جو بڑے مہم ہیں اور اپنے مہم " اعتقاد صاحب سے بہت تھوڑے ایسوں میں سے ایک تھے

ان کی شخصیت کے مسئلے میں ایک بات اور کہے بغیر میں یہ کہتا ہوں کہ قوم معاشرہ یا سماج اپنے آدمیوں، دانشوروں، اور صاحبانِ قلم کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا جس کی وہ فکری جماعت ہے جو قوموں کی رہنمائی، انہوں کی ترقی، معاشرے کا ذہن اور سماج کا ضمیر ہوتی ہے ان کے طبع، توفیق، ہندو رہ سکتی ہیں۔ ان کی پہچان ہو سکتی ہے۔ لیکن ہر قوم، ملک، معاشرے اور سماج میں کچھ ایسی شخصیتیں بھی ہوتی ہیں جو اس کے آدمیوں اور دانشوروں کے لیے Inspiration اور وجدان فراہم کرتی ہیں۔ اعتقاد صاحب کا شمار ان لوگوں میں ہی تھا جو بڑے چند شخصیتوں میں سے تھا ہے جو نہ صرف اپنے ہم عصروں بلکہ اپنے بعد کے آنے والے دانشوروں کے لیے Inspiration فراہم کرتی ہیں۔

پسے موضوع کے متعلق شاید اتنا ہی کافی ہے

اس سلسلہ کے سلسلے کے احاطے کا موضوع اردو ادب اور ترقی پسند تحریک پر پردہ فیس اعتقاد حسین کے اثرات ہے۔ اس کے علاوہ دانشور اس موضوع پر سیر حاصل مقالات، مباحث، ٹرانسکریپٹس اور شاید کئی دو موضوعات پر جو پردہ فیس اعتقاد حسین کی پہچان اور اردو ادب میں ان کا مقام متعین کرتا ہے۔ اعتقاد صاحب نے شاعری، مہم کی اور النساء نگاری، مہم ایسوں سے سیاسی، سماجی اور مذہبی موضوعات پر مہم معائنہ کئے۔ لیکن ان کی ذہنی صلاحیتوں، علمی رجحانات اور انسان دوستی کے اظہار کے لیے عقیدہ ہی وہ میدان تھا جس میں وہ پوری شہرہ کے ساتھ ابھر کر سامنے آئے۔ عقیدہ ان کے لیے محض ادب کے حوالے اور لٹریچر میں کی تلاش کا ذریعہ تھی بلکہ وہ ان کی پوری وجدانی، جذباتی اور ذہنی زندگی کی ترقی کا ذریعہ بن گئی تھی۔ اعتقاد حسین صاحب نے اردو ادب و عقیدہ میں جس وقت قدم رکھا وہ اردو ادب کا انقلابی دور تھا اس دور میں مذہبی کاہر شعبہ انقلاب پذیر تھا۔ پرانی قدریں ٹوٹ رہی تھیں اور نئے اقدار جنم لے رہے تھے۔ یہ دور تھا جب اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کو زیادہ تر جوشیلے اور جذباتی تھیں پسند مسلح ملے شاید یہ کسی تحریک کی ابتدا کا نظری عمل تھا یا یہ طریقہ جسوی صدی کی جیسوی اور جو تھی باتوں کا مزاج کہ ترقی پسندی کے ان جوشیلے مسلمانوں نے ترقی پسندی کا مطلب پرانی قدروں کی بے اعتدال توڑ، بھونڈی کھاد اور نتیجہ ایک ناقص پانچا اور تنگ صوب

بعض مرتبہ کر یا اگرچہ اس طوطی دور میں بھی حشر میں رہے پوری انہوں کو رکھ پاری اور محلو
ظہیر و غیرہ جیسی قد آور شخصیت بھی مائے آئیں مسوں سے ترقی پسند حرکت کو تقصیری محضت اور
تجیدہ طرہ فکر دیا اور پھر اس غلط فہمی کی مرست میں اشتہام میں صاحب مکر رہا ہے اسے اسے اور مت
محلہ اس تحریر کی فلسفہ۔ اس میں اور محضت و متوہد ہوا ہے اس کے

اشتہام میں صاحب کے رذیلہ عقیدہ۔ وہ بھی چار پسندوں کا نام ہے۔ وہ بھی وہ
کے کھائی مطالعہ کا۔ محض فطری حقیقتات کا۔ وہ تو فلاسفی اور دہلی موصوفیت میں تقسیم کر کے
جو ظاہر یا ادب کو کسی ایک درجہ میں رکھ رہا ہے کہے کا اور۔ وہ ب کے نصیب مطالعہ کا اس کی نظر
میں عقیدہ بے قوت حسن و حیر اور حقیقت کی جستجو کا اور ہم تھا اس جستجو میں وہ مختلف علوم سے مدد
لیے اور اپنے واضح مطالعہ اور کمرے حورہ آفاق سے تلخ حد کرتے تھے وہ زندگی کو ایک مکمل وحدت
کی حیثیت سے دیکھتے ہیں جس کی تشریح مختلف علوم کرتے ہیں اور ادب بھی زندگی کا ایک شعبہ ہے
اور ایسا شعبہ ہے جس میں زندگی کے تمام مسائل سمیٹ کر آجاتے ہیں

زندگی کو ایک وحدت کی حیثیت سے دیکھنے کے ساتھ ساتھ اشتہام میں مشرقی فلسفہ کے
بر خلاف اسلام کو فاضل محمد اور ماحود بھی مانتے ہیں اس لیے کہ بغیر اس کے قوت عمل پر اختیار اور
حکمت اسلامی کا تصور ممکن نہیں۔ اور یہ مکر اس طرہ فکر کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ زندگی کو مقصد بھی مسلم
کیا جائے اور یہ مکر تمام اہل حیات کو اسی مقصد کا تابع قرار دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جو ادب اس نقطہ
نظر کا حامل ہو گا وہ ب کو مقصد سے مستقل قرار میں دے سکتا چنانچہ اشتہام میں پورے یقین و
اعتقاد کے ساتھ کہتے ہیں کہ مقصد ایک طرح کا لہجہ ہے۔ ادب کا مقصد کسی نہ کسی طرح اس
کے تحقیقی یا توہمگی کارناموں میں داخل ہوتا ہے

تجیدہ کو مقصد قرار دینے کے بعد صراحتی تھا کہ اشتہام میں تمام صاحب قلم میں سے
کسی ایک کا اہم کر میں چنانچہ اسوں نے پوری راجت داری کے ساتھ ہر کسی عقیدہ کو اختیار کیا اس
لیے کہ وہ ان کی نظر میں سب سے زیادہ مقصد قرار دے اور مضحک تھی اور اس لیے اسوں نے اپنے
تجیدی مقامات میں بار بار ہر قسم کے اصولوں کو دہرایا بھی ہے۔ ہر کسی عقیدہ کو اختیار کرنے کی وجہ
بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ ایک ایسے فلسفہ حیات کو تلاش کر رہے تھے جس میں انی وسعت ہو کہ تمام
اعتدائی، سماجی اور تجیدی مسائل پر اس کا یکساں طور پر اطلاق ہو سکے اور یہ وسعت و جامعیت ان کو
ہر کسی تجیدی میں نظر آتی اس کے علاوہ اشتہام میں اس کی عظمت پسند تھا اور حدائی حیثیت سے

ان کی زندگی کا محور انسان دوستی تھا۔ ان دنوں ناقص ہے ان کو ہر کسی حمید کو قبول کرنے پر آمادہ کر دیا۔
 قیس احتشام حسین کی عظمت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی جتنی راحت اپنے ذہنی توازن اور انفرادی قوت
 مثیاز کو بند رکھا اور ہر کس کے لئے انہوں نے۔ تو انکے مدبر کے قبول کیا۔ عام ترقی پسند
 نظروں کی طرح انہوں نے ہر کسی انہوں خدا کا دہ پر مہنگی مطابق کیا اس کے برخلاف انہوں نے
 جہاں جہاں ضرورت ہوئی ہر کسی حمید کی خاصوں کی مشددی کی۔ جہاں تک ممکن ہو سکے انہوں نے ان
 رخصتوں کو مہرے کی وائش کی منزل کے طور پر وہ ادب کو معاشی ارتقاء سے مہنگی طور پر ہم آہنگ
 کر کے ان کو شش کر دے اور جتنی صورت کے انہوں پر ادب کو اس کی سابقہ دے داری سے
 محدود کر دے ہر کسی نظروں کی تائید میں کرتے بلکہ وہ ادب کو ایف با شعور اور حامل مختار انسان
 کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور اس سے یہ امید کرتے ہیں کہ انہوں سان کو بہتر ماسے کی جدہ حد میں وہ
 مہر اور حصہ لے گا۔ اس طرح عام جنگ نظریہ کسی نظروں کی طرح احتشام حسین ہر دور کے اہلی عظمت
 کو جدہ انہوں سے باپ ان کی قدر و قیمت انہیں کرے کو صحیح میں سمجھتے بلکہ ہر دور کے ادب کا
 ہر طرح سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے ماسے کے مخصوص حالات کے مطابق اپنے رہے کا قبول کرے۔
 ادب کی تخلیق میں اگر معاشرے اور سان کا دخل ہے تو ہر کسی ایک حد سے انہوں کا ہند میں بنایا
 جاسکتا۔ احتشام حسین کے ماسے ہر کسی حمید کی تمام انہوں کے ساتھ ان کی کچھ میوئی حاصل بھی
 ہیں اور ان کی امتیاز و امتدادی کے ساتھ ہمیشہ نظروں بھی رہتے ہیں۔

میں جہاں تک کچھ پتا ہوں احتشام حسین کو ہر سوسے میں قدر و جہتی اور واسطی جہی
 ہر سوسے میں شاید اتنی ہی دلچسپی تھی جسکے بہت سے سرحد ہر سوسے میں ایک متعذر بات
 تھیں۔ جنگ نظریہ میں ان کو سوسے میں لا دیا۔ اور سوسے میں انہیں یہ بھی پتا چھوٹا
 سوسے میں تھیں جیسا کہ انہوں کو ان کی مدنی میں شاید پتا چھوٹا۔ لیکن سوسے میں جنگ نظریہ
 سوسے میں یہ مدنی انہوں کے یہ دونوں الزامات غلط ہو گئے۔ ان سے یہ اعتقاد حسین کی فکر و شخصیت میں
 اس طرح کا کوئی تضاد تھا ان کے سوسے میں ہر سوسے میں انہوں سے دلچسپی یہی کے میوئی سبب ایک ہی
 تھے۔ یعنی ان کا علمی اور جہتی نظریہ ان کی انہوں معاشرے میں نظام بدل و اصلاح لاسے کی
 خواہش ان کی وجہیت پسندی ان کا انسان کے حامل مختار ہوسے کا تصور نہ نہ ہر سوسے میں جہت کا
 قیدی ان کی خاتم سے نفرت اور معلوم سے محبت اور سب سے اہم یہ کہ ان کا انسانی اقدار میں

تسلسل کا تصور چلی بات تو یہ کہ سچے مدعی انسان، احتشام حسین ہی تھے وہ محض بھولی طبیعت اور
 عینیت پسندی کے مخالف تھے جو روح انسانی کو ادیب کے سلسلہ عشقوں میں محسوس کر کے طغیانی
 کے اقتدار کی تائید کرتی ہے اور مظلوم کی اپنے حیوانی اسبق حقوق حاصل کر کے کی جلد حد میں نہ
 راہ پٹی ہے۔ وہ اسی ادیب کو پامادہ سمجھتے تھے جو روح انسانی کی وحدت کی مٹانے لگے اور انسانی
 معاشرے میں نظام عدس و مساوات قائم کرنے کی دعوت دے۔ اور سچے کیوسٹ بھی احتشام حسین ہی
 تھے اس لیے کہ وہ سکندریہ کیسٹوں کی اس تنگ نظریوں سے بھونکا تھے جو دوسروں کے فلسفہ نظر کو
 سمجھنے کی صلاحیت کو محدود کرتی ہے۔ احتشام حسین کے ادیب اور کسٹرم دو ادیبوں میں حرکت زندگی
 اور انسان کو حاصل تھی زندگی سے رابطہ نوٹ جانے کے بعد ادیب لادیت میں، اخلاقی بہ اخلاقی
 میں، فلسفہ محسوس و عقلی جراثیمک میں اور ادیب تفریح و مشاغل میں بسر کرتا ہے

احتشام حسین صاحب نے اسبق مدعی کی قدر قیمت کا صحیح انداز لگایا، انسان کی آفاقی اور
 دائمی عظمت کا احترام کیا، اس کی سخیہ طہرت کی طاقتوں کو سراہا، اس کے حوصلوں کو تقویت
 پہنچائی، اس کے مسلکی کو سمجھے۔ اور ان کا مظاہرہ کر کے کی دعوت دی اور اس کے ارتقائی شعور اور خود
 اختیاری عمل کی اہمیت پر زور دیا، انہوں نے اس انسانی قدروں کی اہمیت کو تسلیم کیا جو ادیب، فلسفہ
 اور ادیب کے وسیلوں میں انسان نے صدیوں کے عہد فکر اور تلاش و جستجو کے بعد جمع کیے ہیں

ثانیہ احتشام حسین کے یہاں جو چیز سب سے زیادہ اہم ہے وہ یہ کہ اپنے فن و نظریات میں
 سچے اور پرمکوس تھے۔ وہ سچے تھے اور ہمیشہ چلتی کی تلاش کرتے رہے۔ انہوں نے اپنی عقل و عقلی
 زندگی کو روح انسانی کا ایک جزو بنایا تھا۔ اور روح کے مطابق کو پاسنگو سمجھا۔ انہوں نے انسانیت کی
 خدمت کو اپنا ادیب بنایا اور اس پر مثبت قدم رہے۔ انہوں نے جس فلسفہ ادیب کو ادیب میں اور
 جس فلسفہ حیات کو زندگی میں تلاش کیا اسے پایا۔ ان کا فلسفہ ادیب ان کے فلسفہ حیات سے الگ نہ
 تھا اس لیے وہ محض ادیب میں نہیں بلکہ زندگی کے بھی فلسفہ میں تھے۔ زندگی کی تنہی ہی اس کی تنہی نگاری
 کا مقصد تھا اور اس میں نہیں پوری پوری کمالی، وہی وہ ادیب کے فلسفہ کی حیثیت سے زیادہ زندگی کے فلسفہ
 اور انسانیت کے ترجمان کی حیثیت سے زندہ رہینگے

حضرت میں سے جو کچھ عرض کیا اس کا مقصد یہ وضاحت ہے کہ ارکھام سمیاد کیٹی نے
 احتشام حسین پر یہ سمیاد کیوں منہ نہ کیا ہے جیسا کہ شروع میں اشارہ عرض کیا گیا جو کہ ۱۹۹۱ء سے ۱۹۹۰ء
 تک کی ایک مخصوص پریسی نظریاتی دنیا میں رہ کر ترقی پسند ادیب کی بائیں کر رہے تھے۔ ۱۹۹۰ء کے
 حالات اور توڑ بھوڑے ان میں ایک عظیم ہیرو اکر رہا ہے۔ وہ ایک دور اپنے پر سکڑے ہیں اور کئی

ق م کے نس پس شروع ہوئی اس دور میں پالی، گاندھی، شوہر سہی اور دوسری رہائیں ہندوستان کے مختلف حصوں میں اپنی جڑیں بچھیلنے لگیں۔ ابھی ۱۹۴۷ء تمام مکی سیں ہوا تھا کہ ۱۹۵۰ء شروع ہوا جسے بہترین سہیت محفلوں کا عہد کہتے ہیں اسے ۱۹۵۰ء بعد کی گہری ہوی رہاں مکی کہہ سکتے ہیں۔ ۱۹۵۰ء کی سو رہاں تک چلتا رہا۔ چودھویں صدی تک نہیں ۶ سلسلہ ملتا ہے لیکن ۱۰۰۰۰ء کے تک محکم ہندوستان کی حد یہ رہاں کی ترقی شروع ہو گئی اور ۱۹۵۰ء میں اور ادب کے سلسلے میں مکی سیں عہد خصوصاً اہمیت کا حامل ہے۔ اختتام مکیس اور ادب کی اس ہزار سالہ تاریخ کے بے کہتے ہیں کہ یہ ایک طبع سے ہندوستان کے ہزار سالہ دور کی تاریخ ہے کیونکہ اس ہزار برس میں ہندو متی معاشرہ عروج و زوال اور تہذیب کے جن ادوار سے گزرا اس کا اثر یہاں کی ہزاروں پر پڑا مکی ۶ رہاہہ کسی ۶ کم بہترین سہیات اس بات پر متعلق ہیں کہ موجودہ آریہ رہائیں ۱۰۰۰۰ء کے قریب وہاں کی شکل اختیار کرے لگیں اور ان کے بننے میں خاص کردار سہی اور پنجاب کی رہاں کے بننے میں غازی رہاں درمیل جوہ نے بڑی مدد کی حالانکہ پانچویں سے ساتویں صدی تک عرب بحر جنوبی ہند میں مللا کے ساحل پر آتے رہے لیکن ان کی عربی رہاں کا اثر وہاں کی رہاں پر زیادہ سیں ۶ اسی طرف عرب کے مسلمان آنھوں صدی کی ابتدا میں سندھ میں آئے لیکن انھوں سے مکی ہندوستان کی سہی زندگی پر کوئی گہرا اثر نہیں چھوڑا لیکن اس کے بعد جو مسلمان ایران کی طرف سے دسویں صدی کے آخر سے یہاں آئے لگے ان کی آمد سہی سکتہ نظر سے بڑی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ جو مسلمان دسویں سے ایران میں رہتے تھے ان میں مکی شافعی و حنابلے ملتے ہیں ان کا مذہب تو صمد مانی تھا لیکن ان کی تہذیب میں اور تہذیب ہندی اور مسیحی مذہب کے عناصر مکی و کھلی پڑے ہیں ان میں سے اکثر کی مابں چال یا وہی اظہار کی رہاں غازی تھی جو خود ایک بڑی با اثر اور قدیم آریہ رہاں ہے

مصطفیٰ اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ چونکہ مسلمان پہلے پہل پنجاب میں آکر بسے اس لیے وہاں خاص کر مغربی شمشادوں کے پارے ۱۰۰۰ء میں کے دور حکومت میں اچھا خاصہ تہذیبی مین دین ہوا مزید ۶ کہ باہر سے آنے والوں سے پہلے پہل پنجاب میں راج رہاں سے ہی کام لیا ہوگا البتہ پہلی سے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ اس وقت مسکرت کی ست ی کتابوں کے ترجمے عربی اور غازی میں ہوئے اس عہد کے بڑے بڑے غازی شعراء کی تخلیقات میں مکی ایک آدھ ہندوستان کی زبانوں کے ملتے ہیں مصطفیٰ کی دامتے خواجہ مسعود سعد طہی ہندی کے پسندیدہ شاعر ہیں۔ یہ لاہور کے رہنے والے تھے اور عربی اور غازی کے متعدد عالم اور شاعر تھے

اس سلسلے میں مصنف نے بجا طور پر اس بات کی جانب مشاہدہ کی ہے کہ "مستند رہبان" سے دلچسپی لیے، لوگ کو یہ بات نہیں سمجھ سکتے تھے کہ کسی ملک یا قوم کو کسی دوسرے ملک یا قوم پر فتح حاصل ہوتی ہے تو فوج پتی رہبان مملوہ قوم کے لوگوں پر بیس لادتا تاکہ پتی رہبان کے کچھ سروری اور کام دے دے۔ لفظ اس زبان میں ملا کر خود ہی مغلای رہبان لکھتے اور اچانک لکھتا ہے "یہ وہی کہتے ہیں اردو کی پیدائش کا حال جاتے کے ہے شور مچا رہا ہے پھر ش کے علاقے میں پیدا ہوئے وہی جدید گریبان لایوں کا مطالعہ سروری ہے۔ پنجاب و دہلی نو اس سلسلے میں بڑی اہمیت حاصل ہے وہی شمالی ہند میں ایک ہی جگہ پر ہے جس شور مچا رہا ہے کرت کی کوکھ سے پیدا ہوئے وہی کئی لایاں اگر ملتی ہیں۔ وہی کے ایک طرف ہریانہ تھی اور دوسری طرف سکھوں بولی "پنجاب" میں پنجاب کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا اور سکھوں پر رب میں مروج تھا۔ یہ لایاں انگ انگ ہوئے تھے بھی اپنی اصل میں ایک تھیں۔ سکھوں جو وہی کے بار میں، راج تھی مہنہ ورفاری کے الفاظ داخل ہوتے رہے جس سے پہلے تبدیل ہو کر وہ زبان پتی جسے ہندوستانی کہا جاتا ہے اس ہندوستانی کی دو دین ششیں ہیں

۱۔ اردو جس میں عربی، فارسی الفاظ زیادہ ہوتے ہیں اور فارسی رحم الحظ میں لکھا جاتا ہے اور
۲۔ ہندی جس میں سنسکرت الفاظ کا استعمال ہوتا ہے اور جسے دیوناگری میں لکھتے ہیں

دکھ میں اس زبان کے پھیلاؤ کے متعلق مصنف دو باتوں کی جانب اشارہ کرتے ہیں، ۳۷
۱۔ محمد شاہ ظفر نے اپنا پورا تختہ دہلی سے منتقل کر کے جنوبی ہند میں دیوناگری کر دیا اور وہی کے سب
شعروں کو حکم دیا کہ وہ ایک ایک کر کے وہاں جائیں اور جب یہ فرماں ماسب معلوم ہوا تو سال بھر
بند میں رہی واپس لوٹنے کا حکم ہو۔ بہت سے لوگ واپس نہیں ہوئے اور وہیں رہ گئے جنہوں نے آگے
چل کر وہاں اردو کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ دوسرے یہ کہ اس وقت جو صوفی، فوجی ملازمین اور دوسرے
اہلکار یا ان کے اہل خانہ وغیرہ دکن گئے وہ یا تو وہاں مہنت اور ڈوڑی رہائیں۔ عثمان کر سکتے تھے جو بہت
ترقی یافتہ شکل میں تھیں اور یا شمالی ہند کی زبانوں جو پنجاب، ہریانہ اور سکھوں بولی کا سہل تھی اور جس میں
عربی اور فارسی کے بھی بہت سے الفاظ شامل ہو گئے تھے۔ بعد میں انھوں نے اسی زبان کو استعمال
کیا جسے اپنی مورخوں نے سکھی زبان ہندی، سکھی ہندوستانی اور سکھی دکنی کہہ کر کیا ہے

اس طرح، عثمان حسین نے صرف اس بات کو رد کرتے ہیں کہ اردو فارسی پر مبنی ہے بلکہ
اس بات سے بھی اتفاق نہیں کرتے کہ اردو کا ارتقاء سندھی زبان کے توسط سے ہوا ہے یا اس کا اردو
زبان سے کوئی رشتہ ہے۔ دکن میں اردو کے حوالے سے دیکھتے ہیں کہ "در اوڑی لایاں نے تو اردو فارسی

بڑے شعراء کو عمر دیا ان میں میں سے کچھ یہ تھے وجدی ادبی عزت اور عاجز تھے ان میں سے ادبی خاص طور پر اس بچے بھی قابل ذکر ہیں کہ انھوں نے شمل اور جوب کے ادبی دوروں کو ملے کا رسیاں کام انجام دیا حالانکہ وہ مدت میں کہ دن روز شاعری کے بلاؤں میں جیسا کہ کافی عرصے سے کہا جاتا رہا۔ لیکن وہ ایک بڑے شاعر ہیں اور اس کا یہ ٹکڑا بہت بڑا ہے کہ انھوں نے ادبی دوروں کو اس کے سواد کی رود سے قریب لائے کی کوشش کی

شمل میں خاص طور پر ادبی میں اردو ادب کے ارتقاء کے بارے میں مصنف بتاتے ہیں کہ " اردو ایک بڑی چال کی شکل میں ترقی کر رہی تھی مگر شاعری مکتوبوں میں جاری تھی جس پر پھل پھل رہی تھی کہ لوگ بڑی چال کی رہیں و شاعری میں اشتغال کرنے ہوئے تکلف کرتے تھے " سر حال سرسبزوں حدی کے اوپر سے اردو شعراء کے نام مسلسل ملے گئے ہیں اس سلسلے میں انھیں پانی پتی، جگر، رشتی اور اعلیٰ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں

اردو ادب کے سواد میں شملی جہ میں اردو ادب کا پتلور مغل بادشاہ محمد شاہ کے عہد حکومت سے شروع کرتے ہیں جو ۱۷۰۱ء میں تخت نشین ہوا تھا وہ پہلے مغل بادشاہ ہیں جس کا اردو کام ملتا ہے محمد شاہ کے عہد حکومت کے دور میں واقعات یہیں کیے جاتے ہیں ان میں سے ایک تو تلوں کا شہ کا مہم تھا اور دوسرا اردو شاعری کا وہی میں قدم چلتا تھا اس دوروں واقعات سے مغل راج کے تزلزل کا پتہ چلتا ہے اگر سلطنت طاقتور ہوتی تو یہ طور شاعری کو لوٹا اور۔ قاری نو دیا کہ عوام کی رہیں انہیں کی شکل اختیار کرتی، فائر، آئرو، ہائی، حاتم، یک رنگ، منظر جلیں جلیں، مضمون، مغل تباہی و حیرہ اس دور میں شمل کیے جاتے ہیں

یہ بات ظاہر ہے کہ اس وقت مغل راج ایک بچتے چراغ کی طرح رات کے آخری اندھیرے سے راز با تھا جس میں اس اعلیٰ طاقت میں تھی کہ وہ کسی طرح کا اور بچھا سکتا، سکھ، جاٹ، مرہٹے، سبھی اپنی طاقت پر مہم تھے دور دور کے مغل سوادے خود مختار ہو رہے تھے اور ایسٹ انڈیا کمپنی ایک سبزیل کی مہم زندگی پر چھانی مہم تھی پور شاہ کے دس برس بعد احمد شاہ ابدالی سے بد دوستی کی طرف منہ کیا اس میں بڑے بڑے جاگیردار اقتدار حاصل کرے کے لیے اپنی ٹوپیوں جاتے ہوئے تھے اور پور شاہ کے ساتھ میں کٹھ پتلی سے ریوڑ طاقت میں رکھتا تھا مجموعی لحاظ سے یہاں کہہ سکتا ہے کہ بد دوستی کے عوام جن طبقات میں حدیوں سے تقسیم تھے اس میں کوئی بڑا تغیر نہیں ہوا تھا ملک کی پیداوار کا طرہ و سبب میں تھی مگر زندگی میں جو ایک طرح کی یکجہلی تھی وہ

کمزور ہو گئی تھی اور کسی طرف کی ماضی واقفیت نہ ہوئے سے دریاغ پیدا ہو رہا تھا اور مدی میں رہتی
یکسانیت جزائز کی تھی جو ان کے زعم سے رہتی تھی

زندگی جب مظلوم کے خوف سے مفید معلوم ہوئے تھے تو اطلاقِ رواں نام کر رہا تھا ہے
ان وقت کے اردو کے ذہن ظاہروں کے یہاں ایسی ہی اس گہرائی کوئی حالت کی تصویر دیکھی جا سکتی
ہے۔ احتشام حسین تھیں جس کا اظہار یوں مدنی میں جدوجہد کے کی حصوں میں انگریز تھیں سے
ایک خاص مضمون پر تھی لیکن جہاں تک اردو کا تعلق ہے اس پر ہندو مسلم تفریق کی پرانی
صورتحال کا اثر تھا کہ تھا کہ یہاں سے میلان کی توجہ یزدی سے ہیں جو کئی ان کے خیال میں اس
کا حصہ تھی تھا کہ اس زمانے کے شعراء عام سے کوئی کہہ سکتے ہیں رکھتے تھے اور زیادہ تر شہروں
میں رہتے تھے اس وجہ سے ان حالتوں سے آشنا تھے جو کسی عوامی زندگی میں سے چھٹی پیدا کرتی ہیں
= ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء میں کادور تھا کہ یہ شعر و ادب دور کی تھی اور قنوطیت کی علامت
تھے مگر وہ شعر کے لشکر و اعزاز کا پتہ بھی اس کے ظاہر سے چھتا ہے۔ زندگی میں سب کچھ بار بار
کے بعد بھی وہ زندگی کی تلاش اور حسن کی تلاش میں گئے ہوئے تھے اظہار یوں مدنی جدوجہد کی
تاریخ میں عجیب و غریب مساعی تھی مگر یہ شعراء اس کا ذرا بھلا اس سے خوف نہ تھے انھیں یہ معلوم
ہیں تھا کہ ماضی خلعت پہنے ہوئے رہیں سے وہ ان کی وہ سے ایک ہی زندگی کے جسم لے کی
تصویروں کے میل جول سے جو زندگی و جدوجہد میں تھی وہ موت رہی تھی مگر اس کی مٹی مٹی سار میں
ایک طرف کا حسن تھا میرا جسم کا حسن جو کبھی بھی رہا تھا وہاں سے میرا ہات میرا اور درد کے کلام
کے لیے گئی جا سکتی ہے۔

دن کے بدل گئے تھے اور وہاں سے شعر و ادب سے شعر و ادب سے شہروں کی طرف چلے گئے جس
میں اردو ادب کا جو عظیم نام تھے حیدر علی خان، میر تقی میر، میر تقی میر، میر تقی میر، میر تقی میر
علامتِ حیات کے، وال کے وقت بھی ہیں یہاں میں سورن تھیں دیکھیں میں تھی ہے وہی حیات
کے دربار علم و تحقیق کے حوزے تھے لیکن ریاست کے نوٹ بہ محنت کا تھا ہوسے کے بعد ملای سہاروں
سے صرف اس وجہ سے علم و ادب کی سرپرستی رہا نہیں کہ اس کے اقتدار کو جائز ہوئے کا جو
قراہم ہوئے۔ حالانکہ ان میں سے بہت سے علم و ادب کے اسرار و سرور کو سمجھنے سے خاصہ تھے
مگر وہ بلا حرا کر میں سے بہت سے ۱۸۵۷ء کے دور میں مثل حکومت کے ساتھ حم ہو گئے یا ایک محدود
پیمانے پر ظاہروں کی سرپرستی کرتے رہے اس میں سے اردو کی سلطنت کو غیر معقولی ادبی اور تمدنی

حیثیت حاصل ہوئی۔ وہ کی حکمت کے اصل مولد آصف امداد تھے جنہوں نے نہیں آواز سے بیٹ
 کر لکھنؤ کو اپنا گھر کر لیا۔ آصف امداد کے بعد ان کے بھائی سلطنت علی علی مولد سال تک تحت
 حکومت برادری رہا، یہ وہ بھی اپنی انتظام کے لیے سرگرم رہا۔ ۱۸۱۶ء میں مداری بدین حیدر
 کو اب دربار ہوئے جنہیں گمر کی سیاست سے متعلقہ جو، مختار بادشاہ تسلیم کریں، بولوں اور بادشاہوں کا
 چاند ۱۸۵۹ء تک چلتا رہا جب تک انگریزوں نے اس علی شاہ کو معزول کر کے اس میں خیرج (گلت)
 بھیج دیا۔

حضرت بادشاہ، مہم جو دربار حسن حاصل طور پر ایسے شعراء میں جنہوں نے مداری ہوتے
 ہوئے لکھنؤ کا اثر قبول کیا اور ان میں سر جن جنہوں نے مداری کے مقابلے میں لکھنؤ کے وسیلے شاعری کا ذکر
 کرتے ہیں۔

لکھنؤ کی بدین عمر دلی سے یہ ہیں گھمسا چاہے کہ وہی میں شاعر نابار و سر ہو گیا تھا
 یہاں اللہ تھوڑے دنوں کے لیے لکھنؤ کی جیل میں بند دلی کی مداری کو بند کر دیا تھا
 جس تک لکھنؤ اور دلی میں شعری تھکین کا سوال ہے تو ان دنوں میں موجود فرق کو
 احتشام حسین میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ”ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ کچھ جذبات اور ان جذبات
 کے اظہار کے طریقے بدلے ہوئے تھے یاں میں مقداری فرق تھا شاید یہ بات سچ ہے کہ اندر لکھنؤ میں
 زیادہ فرق۔ ہوتے ہوئے بھی طرد اور کالہنق مٹا سائیں ہے جسے ایک دوسرے کی رقابت اور بحث
 سب سے پیچیدہ بنا دیا ہے۔“

اس کی وجہ یہ تھی کہ سابقہ دلی کا دور دلی میں تھا وہی مضمون فرق کے ساتھ لکھنؤ میں
 بھی تھا ادب و تہذیب اور فلسفہ کی جو وہ بات ایک حذر احترام سے دیکھی جاتی تھی وہی بات دوسری
 جگہ پر بھی تھی اس لیے گوروصل کے مہمان میں کوئی عظیم حد تک مٹا کر بھی یہی بات تھی
 کہ دلی کی سلطنت ایک ادق کے مہمان کی طرح دھیرے دھیرے اپنی موت کی طرف جاری تھی اس
 لیے وہاں کے شعراء کے جذبات قومیت آمیز تھے اور ان سے پیدا ہونے والے لکھنؤ میں اس کے
 برعکاس کی سلطنت قائم ہوئی تھی اور مداری شکل میں ترقی کی جانب بڑھ رہی تھی اس وقت کے
 شاعر اور انکار تہذیب و تمدن سے بے انتہا تھے وہ میں جانتے تھے کہ جو کچھ ان کو دکھ رہا ہے وہی لکھنؤ کو
 بھی دکھ رہا ہے اس لیے وہ میں جڑھے ہوئے سوئے کی روشنی میں کھو گئے۔

ان دنوں میں بہت سے شاعروں کے دل سے پٹے جلنے کے بعد بھی سلی مست سے اہم

شعر موجود تھے اور وہیں سے پہلے مدرسی کھول کی طرح یہاں ایک بونٹاک سنانے کے بعد، ہر ایک ہر شاعری کے سوتے، حکومت پرے اور ایک عظیم شاعر۔ اور تہذیبی دور کا آغاز ہو۔ اس کا مطلب یہاں ایک مغل حکومت کا منہل جلاسیں لکھ کر، ان کی آخری ہوا ایک بار، ہر تیر ہوتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی اس حد کو مومن، ادبی، طبعی، شیعہ و غیرے کے احوال، اس حد میں دلی کی مٹی ہوئی دلی خاک، اعلیٰ تھی اور لاتعداد شاعر، فلسفین، سوں میں اپنے بیت گارہے تھے ان شاعروں کی آواز میں وقت کی آواز بھی سن جاسکتی ہے۔ مغل نے جو ایک طاقت کی بلند ہوتوں کے دلوں میں پامقام جاتے ہوئے تھا، وہ بھی مٹ گیا تھا، اور جو شاعر ملک کی بدلتی ہوئی معاشی و معاشرتی صورتحال کو پس کھینچتے تھے وہ اپنا جی رات، الپ رہے جا رہے تھے۔

انھارویں صدی کے شعراء میں نظیر اکبر آبادی کا ایک خاص مقام ہے کیونکہ اردو ادب میں ابتدا میں جو ملوک تھی وہ وقت کرے کے ساتھ سیں رہی اور اپنی زبان میں صرف مہلی اور فارسی الفاظ کا استعمال نہ کیا بلکہ ریاضہ ترانہ خیالات کا چرچا ہوئے گا جو ہندوستانی عوامی زندگی کے مزاج سے براہ راست تعلق میں رکھتے تھے۔ اس مسئلے میں نظیر نے زبان اور خیالات کے لحاظ سے ادب کو عوامی زندگی سے قرب کرے کی سعی کی۔ ان کا طرزِ فکر بدل گیا تھا۔ اس لیے اس کی فکر میں رکھی جاسکتا ہے اور۔ لکھنؤ کے مرکز میں حالانکہ اس وقت کے نظریوں نے اس کی کوئی اہمیت نہیں دی مگر آج ان کا اثر تسلیم کیا جاتا ہے اور جوش اور اس کی دانش جیسے شاعر۔ صرف اس کی بدلتی کو ماننے ہیں بلکہ ان سے حائر بھی ہیں۔

دیباکی اکثر زبانوں کی طرح اردو میں بھی شہر کا آغاز اور شہر ادب کا آغاز شاعری کے مطالعے میں تاہم اسے جو ہندوستان کے حوالے سے اس کے اسباب سماجی، نضلی، معاشی حالات میں عموماً کیلیت، دینی، خانہ راہوں پر پلٹنے سے میں داخل مالیت اور میلان کے پس دین کے ذرائع کی کمی تھی۔ دکن میں جو ہندو گیسو دہری کی کچھ تصنیفات کا ذکر کتاب ہے، طاہر علی کی ۱۵۵۰ء میں مکمل ہوئی تصنیف بھی اس مسئلے میں قابل ذکر ہے۔ ہر حال اردو ادب کی صفات تہہ۔ کھوں میں اردو شہر ابتدا احمد علی حد سے ہی ملتی جاتی ہے۔

شہر کے لیے جس قسم کی انصافی صورت تھی وہ حقیقت انھارویں صدی کے بعد ہی ہوئی۔ اس مسئلے میں غور و خیر کرنا کا قیام عوامی اہمیت کا حامل تھا جسے انگریزوں نے اس لیے نام نہاد۔ نے انگریز ملازمین کو ہندوستانی زبانوں کی تعلیم دی جانے اسوں نے تعلیم کے ساتھ تصنیف و تالیف



عسکری خانی اور حیدر آباد میں ایک عورت اور بچہ

کا ایک شعبہ بھی کھولا اور اس میں دھندلے دھندلے کر ایسے لوگ رکھے جو اس کی مہارت کے مطابق شرم
تصنیف کر سکیں انہوں نے اس کا بدولت بھی کیا تھا کہ جو تاحیں کلچر کی نگرانی میں لکھی جائیں ان
کے شائع ہونے کے لیے ایک دارالاشاعت بھی کھولا جائے۔ غالباً چند سالوں کا بھی پلاڈارالاشاعت ہے جو
کلکتہ میں قائم ہوا۔ احتشام حسین لکھتے ہیں کہ ”فورٹ ولیم کالج میں جو ادیب جمع ہو گئے تھے انہوں
نے اپنا اصل بڑی خوش سلیبی سے پورا کیا اس میں شبہ نہیں کہ وہ جس مقصد کے لیے ملانے گئے تھے
وہ حاصل اہل سب تھا کہ وہ ان سے اردو جلدی اصطلاح کے ایک سیاسی شکل اختیار کر لی“ وہ مزید
لکھتے ہیں کہ ”ان میں سے کم و بیش چند ایسے ہیں جن کے ہام اور کام کو اہمیت حاصل ہے ان میں
میرا اس، حیدری، لکھنوی، علی چند، مظہر علی، ملا، مسیحی، کاظم علی، ج. ر. وغیرہ انہوں نے قابل
ذکر ہیں“

اس عہد کی سب سے اہم نثری تصنیف مرزا رفیع علی بیگ سہروردی کی ”لذال تحقیق“ لندن
چھپ ”ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں اردو نثر جس کا رقاء آ کر چند برسوں بعد میں ہو چکا تھا مگر میرا
اور میرا حیدر آباد انیسویں صدی کے نصف اول میں ہوا
ایسٹ انڈیا کمپنی جو آہستہ آہستہ زندگی کے مختلف شعبوں پر چھائی جا رہی تھی اب تاریخ

کی میزبان میں سب سے بڑی قوت تھی۔ وہ چند سال کی عمر ہی میں ہوا کے تیرھویں کے دروازے پر
 لہو کی طرح آئی تھی۔ اگرچہ اس کو میں نے اور اس سر میں لٹ کے ساتھ ہی تو اپنی بکٹے والے رحمت
 جھلے تھے، ترقی، روح اور عقل کا ایک مطالعہ۔

انگریزی تعلیم در ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ معاشرتی رابطے جو ہم کام ہے ان میں سے
 متوسط طبقے کے وجود اور ان کی سیاست و ادب فطرت و تمدن کے ساتھ ہی مستقبل میں کشش
 کا مرکز ہے۔ وہاں تھا یہ یا متوسط طبقہ ہی رہا جیتیں چاہتا تھا جو ہے ملک کی ترقی کو مغربی تصورات کے
 نام سے اسے ملاحظوں کی میزبان و مسرت دے وہ قدیم نظریات سے مطمئن۔ تھا اور معاشریات میں ردی
 نظام سے ادب و اخلاق میں سب سے زیادہ روایات سے، ادب میں محدود دلی تحریکوں سے رہا تھا چاہتا
 تھا

جس اس وقت ہادی انقلاب کے باعث مذہب میں نو تبدیلیاں ہو رہی تھیں ان کا درجہ
 مت خود سے گئے۔ رہتے تھے شاعر، ادیب، ان روایات سے چنے ہوئے کی زندگی کی مثالی
 تصورات پیش کرتے تھے جو ہر دور و دوری تھی جو کہ اب اس میں تہذیبیں سماں اور معاشرتی
 اثرات سے بڑھتی ہیں وہ کبھی مت مست رہتا رہتی ہیں وہ کبھی نئی تہذیبیں بناتے ہیں وہوں کے خلق کا پڑ
 لگا دیکھنا معلوم ہوتا ہے۔ مغربی تہذیبی۔ ہوئے کا حسب یہ ہے کہ بنو ابی وہاں ایک بار میں جاتی
 میں رہتے تھے حتیٰ میں وہ عوام الناس کو اپنی عزت بوجھتی ہیں کہ حالات بدل جائے۔ یہ بھی اس ان کی
 طرف مٹھتا رہا ہے اور بہت سے لوگ حسین طور پر اس سے متاثر ہوتے رہتے ہیں اپنی تہذیبوں کو
 اسی نظر سے دیکھا جائے۔

یہ اہم کی بدولت کے کچلے جانے کے بعد انسانی قوانین سے مذہب کے نام پر مظہر
 ہوئے کا موقع فراہم کیا اور ساتھ ساتھ انگریز سرکار کے ساتھ نظایں کے رحمت کو بھی مضبوط یا ان
 میں سے محمد مجید، ابریش چند و میرزا محمد و قومی حتیٰ کے ترجمان نظر آتے ہیں تو سرسید اعلیٰ اندر
 اعداد و شئی مسلم قومی رہی کے۔

انتقام جس میں اس دور کو محمد انقلاب کے کے کہانے مست اسطرح پسند کی کا دور کہتے ہیں
 جس میں جس سے بھی تھے راجوں پر قدم طاریا مانی کی مسند مذاقوں پہ کتب کا ایک کی ہے
 مسیحی مذہب کا استیصال کیا وہ نہ اذیت کو دیکھتے ہوئے تہذیب اور ترقی پسند کلمے کا مستحق سے سر
 سید محمد علی، اعلیٰ حسین علی، محمد حسین آزاد، جعفر علی، محمد، شبلی علی، احمد، کا۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار، عبدالمجید شہر، مر محمد علی دسوا اور رائے لکھنوی وغیرہ میں دور کے تراویں
 ایک دوسرے کے مرسد کے وقت سے لے کر ان خصوصیات پر کام شروع ہو جو کسی زبان کو سچ اور
 ہم گیر بناتے ہیں۔

لی شاعری کے سحر مولانا نے آگے جاتے ہیں۔ سست ۱۸۶۷ء میں سوں سے ایک طبع
 دیتے ہوئے مشرقی شاعری خاص کر اردو شاعری کے خاص کی طرف توجہ دلائی اور کہا کہ شاعری کو
 فطرت اور انسان، مرنے کے سبھی حرا، پراگش پائے کا ریشہ ملنا چاہیے اس دور میں انھیں
 پنجاب کی حیدر پوری اور آٹھ مئی ۱۸۷۰ء کو دہلا پور کے مشاعرہ میں سے مراد انھیں بھی تھیں
 ان عہد کے سب سے بڑے شاعر مولانا جلی تھے۔ دوسرے ممتاز شعراء میں ان کے
 آبادی، مٹی اور گھوسا سے سہرا، پنڈت برج راتن، چکیت اور چاکر قبل شامل ہیں۔ اس عہد میں
 شعراء اور شکرگوں کی ایک بڑی تعداد تھی جسے میں کی وجہ سے پورے ملک کی تخلیقی قوت بڑھ گئی
 تھی۔ جند سے اور پرانے کی شش ایک خاص موڑ پر پہنچی تھی۔ بیشتر لکھے والے ایسے ہیں جن میں
 تو پرانا لکھا جاتا ہے اور۔ یا

یہیں عہد کی شروعات میں پوری دنیا میں ہوئے والی تبدیلیوں، جدوجہد کو بھی متاثر
 کر رہی تھیں اور متوسط طبقے میں انگریزوں سے بے تعلیقیت بڑھ رہی تھی۔ لیکن سیاسی حالتیں اس کو
 خاص قسم کی اصلاح پسندی تک محدود تھیں۔ محفیں اور مکرین میں انقلاب اور جدوجہد کے جو
 جدت اس وقت پیدا ہوئے وہ پہلے وہ پہلی رہا۔ تھے حقیقت پسندی سے ان کا گہرا تعلق نہیں تھا
 نہ عامیہ ہے کہ ترقی کی خواہش تھا چاہوں تک محدود تھی

لیکن جدوجہد میں ایسے نوجوان موجود تھے جو محسوس اور صریح اور کے خیالات ظاہر
 کرتے تھے اور بدیسوں کو محدود سے نکالنا چاہتے تھے۔ اس لی سیاسی اور سیاسی حالت نے نئے
 شعور، نئی زندگی اور نئے ادب کو پیدا کیا۔ جدوجہد کی سیاسی تحریک میز سے آگے بڑھ رہی تھی اور
 وسیع ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ کانگریس کو مجبور ہونا پڑا کہ وہ کامل آزادی کا مطالبہ کرے۔ جن اور
 شاعروں سے ان حالات کی مماندگی ان میں جوش، فراق، حقیقت پسندی، سافریٹائی، احترائی،
 روش صدیقی، انسان، شمس، انعام علی، احمد، احترائی، وغیرہ شامل ہیں۔ یہ چند کوئی اور کہانی کا
 موجود کیا جاسکتا ہے۔ دوسرے شکرگوں میں علی حسن، مسیح، عظیم کریم، بھوں کو رکھ پوری، ال
 احمد وغیرہ شامل ہیں۔

احتشام حسین - بحیثیت شاعر

حرف انصاری

بکے کی طرح شاعری بھی کھری اور کھلی ہوتی ہے اور جس طرح کہ دھالے والے کی نیک
 نالی کھرے بکے سے ہوتی ہے اسی طرح کھری شاعری پر دسترس رکھے والا بھی شعرا ادب کی دنیا میں نیک
 نام و محترم نظر آتا ہے اور اس کا انحصار کیفیت و کثرت پر نہیں ہوتا بلکہ وہاں غالب جب پہلے پہل منظر
 عام پر آیا تو اس کی سمجھت کیا تھی ہوں شخصے ذرا دیر اس پر بھی حق مطلع و مطلع صاحب - اور ادب
 کی اسی سے رحم دیا میں نے بڑے بڑے تنظیم دارین کے ماحول کو آج تاریخ ادب کے حاشے میں بھی
 جگہ دے رہی ہے

سوال یہ ہے کہ شاعری کے کھرے کھونے کو کون پرکھتا ہے - اس کا جواب مجھے اقبال
 کے اس شعر میں ملتا ہے

تجھ کو پرکھتا ہے - تجھ کو پرکھتا ہے -
 طوطا دوز و شب صیقل کلمات

شعر ہر دہلے بھی جس سے شاعری کی ابتدا اور انسانی سائنس میں جس کے لوہین قطعی
 حرکت کا بڑی جاکھ سے سراغ لگایا ہے - شاعری کی چٹائی اور صداقت کا سید بھی رکھا ہے کہ شاعری

بہرائی کا مرکز تھا۔ بدیسی، خاص کر دہلوی، ہل کا ایکٹ، ستیہ کر اور سیاسی مجلس، ہل
 بی شہاب، قحی میں بھی شعری طور پر آراء دی کے بدلے سے منظور ہو گیا۔
 اسی ضمن میں مزید لکھتے ہیں :

”یاد رہتی ہے تقسیم کے دوران میں میں نے قصہ شروع کیا، انسانے،
 ذراے، طیس، فریس، سجدی نکالت، علی معاین میں سب کچھ ادب، سحر،
 غلط، سیاست، طبیعت، حسیات سب سے دلچسپی لیتا تھا تا کہ زندگی کے مسائل
 پر ہی طرح کچھ لکوں۔“

اس میں منظر میں احتشام حسین کے ہیں اور تھقی حرکت تک پہنچا کہیں ہو جاتا ہے
 وہ دور تھا ہی سیاسی بددلی اور عملی جدوجہد کا ترقی پسند تحریک نے بھی جو وہاں قائم کی قحی اس کے
 مابین تلے یا دب پڑاں چڑھ رہا تھا۔ خوش طبع آملی، قزاق، بھڑ، مہدوم، فیض، جدی، سردار
 جعفری، احمد ندیم قاسمی، مازہ دہلوی کی شعری کا بطور خاص چرچا تھا اس میں احتشام حسین کی
 شاعری سے بھی، بے اعلیٰ کے سانچے تلاش کے

احتشام حسین کی شاعری کے بارے میں پروفیسر آئل احمد سہر کے یہ تاثرات ان کے
 شعری مزاج اور شاعرانہ شخصیت پر ایک عمدہ حصہ ہے

”شعر وہ کہتے تھے اور مخصوص سبجوں ہی میں ملتے تھے ان کے
 بڑے کا، رست، دلکش تھا شعر نرم سے پڑتے تھے اور نرم میں گدا رہی تھا اس
 کا یہ شعر مجھے اکثر یاد آتا ہے اور جب یاد آتا ہے تو احتشام کی آواز کی گونج ایک شیریں
 گد رکی طرح دہریں میں گونج جاتی ہے۔“

کل تو غیر ان کی یاد آتی قحی
 آج کہیں ہے لگا لگا لگا لگا

تجدید کی جانب احتشام حسین کی فوج رہا وہی ان کی زندگی میں ان کی شکر کے حصہ
 مجموعے شائع ہونے لگے شاعری کا محمود مرتب۔ یہ سب کا بعد میں جسر مسکری نے ”دش کی
 درپے“ کے نام سے محمود کام مرتب کیا جو احتشام ایڈیٹور الہ آباد سے ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔

احتشام حسین کی شکر گولی کا آغاز ۱۹۷۸ء میں ہوا جب وہ آنکھوں میں دھبے کے
 غالب علم تھے اور اس وقت میر میں ٹھس کرتے تھے

کسی معاشرے میں اپنا کیا اصل کردار ادا کرتی ہے اور یہ امر اطردی حد سے تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ
 مادے معاشرت کو جنگوں کی طرح اپنی شمولیت کا احساس ہوتا ہے

میں نے یہ جھلکا کر گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

شاعری کے اس منصب کو اپنی اپنی استعداد فکر کے مطابق سراشور، شاعر، مہر، محسوس کرتا
 ہے جس میں شاعری دہلی تربیت، شخصیت کی تشکیل اور طبع کی نوعیت اس طرح سامنے آئے کہ وہ
 شعور کی طور پر تخلیق کی عمر میں اور سماجی و دنیویوں سے ناگوار واقف ہو اور اس میں امن کی اہمیت اور
 اقدار و مراتب سے اس کے تعلق کو تاثر کر لکھا ہو تو اس کی شاعری بقا ہے نہ کہ ایک سے بہرہ بردار کی بنا
 پر منتظر رہتی ہے

پروفیسر سید احتشام حسین ایک کمرے والی تھے ان کی شخصیت میں یکسوئی کا توازن
 اور اعتدال تھا اور اس طرح ان کا طرز و شاعر تھے میں میں لیکن محدود لیکن کو ہر حصہ
 مبالغہ سے بڑی ہی طریقہ، استعاروں کے ساتھ۔ صرف ان کی فکر میں غور رکھا اور ان سے
 محبت کی ای طرح احتشام حسین کو بھی اپنی ذاتی اور دانشور۔ انہوں نے وہ چاہے ہمیشہ سراپا کیا اور اس کی
 شخصیت اس کی شاعر میں رہے مولانا خٹک علی مرثی ہوں یا مہر، ام، سید طہسیر، یوں یا آمل
 احمد سرور، احتشام حسین کی شخصیت کے اس حرح کے سب سے قابل ہیں یہی شخصیت کی تخلیق و
 عقید میں انہوں میں موجود ہوتا ہے اور اس کے بدلے ہوئے تھے گھونٹے میں ہوئے

پروفیسر احتشام حسین ایک باغی کی حیثیت سے متعلقہ رہے رکھتے ہیں ان کی عقید میں
 جو عوام اور اقدار، جو چلی اور مدت پائی جاتی ہے اس کی طبع مشکل سے ٹکے لیکن احتشام صاحب
 میاوی طور پر ایک تخلیقی ذہن کے آوی تھے ان کی اپنی سرگرمیوں کا غور شعور کوئی ہے ہوا اس مدد
 کی جیسری، ان کو ان کی تعلیمی اور تحقیقی زندگی میں سب سے اہم دور شمار کیا جاسکتا ہے ۱۹۳۰ء میں
 لاہور آئے اور ۱۹۴۲ء میں ان کی یو جی سی سے فرائض فرائض میں بی اے کیا اور جلیل تھوہ و تعلیمی
 عقیدہ حاصل کیا ۱۹۴۹ء میں انہوں نے فرائض فرائض میں ایم اے اور ڈاکٹریٹ پاس کیا اور دو طلبہ
 تھے حاصل ہے اور ان میں جیسری دہلی کے تھامے سے احتشام حسین کی مدد میں کس طرح کی فکر
 فرائض دہلی اور اس کے کیا نتائج ملے اس کا ذکر "ماطل اور سمندر" ۱۹۹۰ء میں احتشام صاحب
 نے یوں کیا ہے

"۱۹۴۰ء میں لاہور پہنچا جو اس وقت انگریزی حکومت کے خلاف سر

احتشام حسین نے بشور تھے کہ اگر اس کی شاعری محض موزوں طبع کا نتیجہ ہوتی تو وہ اس کو کسی کام نہ کرتے۔ ہوتے لیکن شاعری اس کی ایک ہزار تھی جس سے وہیاس کے سارے وہ ذات و کائنات، جد و جہد اور مس آمد کی مرثیہ کہتے تھے۔ احتشام صاحب کی شاعری میں اس کی شخصیت کی حیرت کی شائستگی، بلادی و شریعت نظر آنے ہے کہنے میں

عزت سے سوپ دی مجھے دیباے آرد

شائستگی لم کا سرا وار دیکھ کر

احتشام حسین شاعری کی رو سے آخر تک بغیر جس حاصل کرتے رہے کسی "احتشام

میں اور کسی لرسی ہاں سے پا کلام شائع کرتے تھے بلکہ دامن لکھا ہے کہ

"آخری زمانے میں اسوں نے ایک قلمی نام "رج و راز" اختیار کر

یا تھا اور اس کے تحت نظمیں لکھا کرتے تھے مظلوم میں ہونے کا کہ کیا بات یہ نام اختیار

کرنے کی عمر کہ ہوئی۔"

احتشام حسین شاعری کے تخلیقی عمل کو ایک محرم راز کی طرح جانتے تھے اسی لیے ان

کی تنقید اصلی تخلیقی تنقید کا محور نظر آتی ہے اور وہ شرط جو اسے رکھی تھی کہ ایک عمدہ شاعر

ہی شاعری کا بہتر گمان کر سکتا ہے "احتشام حسین کی تنقید میں پوری ہوئی دکھائی دیتی ہے

بغیر حد بغیر سے "دست مہا" کے دیباچے میں غالب کے ایک شعر کے حوالے

سے فقرہ وعد اور وعدہ دینا کے حکماں اور ملامت کی دعوت کرتے ہوئے اپنے نظریہ شعر کو بری

نہی اور شاعرانہ حیرتوں میں ادا کر دیا ہے کچھ ایسا ہی منہ از احتشام حسین سے اپنی طبیعت کی توجیح

کے سلسلے میں اختیار کیا ہے "مے چنے مے تو کین" میں دیکھتے ہیں

"شاعر گر کو کین میں تو کچھ مگی کین جس سے بھی۔ مہو ہوا چاہے کہ

کو کین تصور شیریں جوئے شیر، ہمیشہ اسے حوں اور صبر برد کے بغیر مکمل نہیں

اگر اس تلاش کو کچھ درجہ جاری کئے کی جہاز دی جائے تو شیریں مقصد تخلیق نظر

آئے گی جوئے شیر تخلیق ہمیشہ درپردہ تخلیق ہے حوں میں تخلیق اور حسا ہوا اس

حرک تخلیق

دوسرے اور واضح تر انداز میں کہہ کر شاعرانہ فکر پر پانے کا تو شیریں جدہ عشق و صبر

اصح یا شب حرک شعر کے جاب کی مستحق ہوگی جوئے شیر کو حاصل من یا شعر کیں کے ہمیشہ

دیر اندر اوسچا پارہیں دگا اورے حقوں بھر کا وہ دھیر اور خام مواد ہوگا جس سے دیگر شیریں تراشا
جائے گایا جائے شیر لگے گی ۔

احتشام حسین سے شیریں فردا کی داستان کے علائم اور رمزی مصلحتات کی ایک
87 Anna جانتے ہوئے کس خوبی سے شعر کی تحقیق اس کے محرک اور اس کی افادیت کے بارے
میں اپنے نقطہ نظر اور شاعرانہ مانی و تصبیہ کی وضاحت کر دی ہے اس آجے میں احتشام حسین کی شاعری
کا جائزہ دیا جائے تو یہ رہا ہوتا ہے کہ اپنی لطیف تم آئینی اور رب اندک کو اسوں کے سب سے
زیادہ اپنی شاعری ہی میں جگہ دی ہے عظم بویا عزت ، ایک سودا ، ایک درستی اس کے کلام میں جاری رہ
باری طغرائے ہے جو مستند پائی کی شخص ہی میں جو کتنی غزل کے چند شعر غلط کیجے

رہوں میں تم کا سو بن کے جو بھٹتے ہیں
" نسبت میں کہ مری شاعری میں اٹھتے ہیں
" راہ میں ہا کئی بار بچے ہائیں لاشیں
" اے چارہ گئے کدواں لگتے ہیں
تو لکھ چکن ہے شوق کا جادو
جو اک چراغ بجھا ، سو چراغ ملتے ہیں

حلاش گل میں نکل آئے مگر سے دیوانے
جھلک کچھ ایسی دکھائی حد سحر نے
حد حد سے باہر بھی گونج جاتے ہیں
حد وقت میں لکھے گئے جو انسانے

آہن راہ مگر حریفوں نے دھونڈ لی
میرے جوں کی مٹل دشوار دیکھ کر
سوچا تھا اب کریں گے گل دیا سیں کی بات
لب ی لے ہیں حالت کھڑ دیکھ کر
صحن چڑھا تو دھوپ کی لہوں میں غرق ہیں

جی جوش ہوا تھا سب دہلے دیکھ کر
 موج میں بھینچ جاتی تھی تا فلک
 ب رگ کی ہے ہفت کی رفتار دیکھ کر
 آنسو ہیں نہ بندے ہیں کیا فیصلہ کریں
 شرب میں علم کی شب تار دیکھ کر

...

یہ اور ان جیسے دوسرے اشعار میں احتشام حسین کا لہجہ ایک منکر شاعر کا لہجہ ہے جو اندر ہی
 اندر رکب آنکھی کا عذاب سر رہا اور دھمے دھمکے ہلکے ہیں یہ کیفیت کسی ذاتی غم کی نسبت سے بھی
 ہو سکتی ہے لیکن اس میں اپنے عہد کے سب افسانہ نویس اور انشائیہ نگار انقلاب کی موج تہ لہجے کو
 با آسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

احتشام حسین کی شاعری غم، اقبال، جوش، مرقع، محاذ اور فیض کے خداداد حسن سے
 متفنن رکھتی ہے اس شاعری کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ یہ ہر اسطو سے فیض حاصل کرنے کے باوجود
 اپنی اصراریت کو ادا کر کے اور اپنے ذاتی لب و لہجہ کو متشکل کرنے کا ہر بھی کھلتا ہے اور یہ وصف
 احتشام حسین کی شاعری میں موجود ہے

کلام میں غم کی ایک سردی کے ساتھ ساتھ رجائیت اور یقین کو قائم رکھنے کی کوشش
 احتشام حسین کی شاعری میں برسرِ خط آتی ہے تقسیمِ ملک اور حصولِ آزادی کے بعد ہندوستان شاعر کے
 بعض ردِ عمل یوں سامنے آئے

آئے کسی نہ اپنے گھٹیلے کو جھوڑ کر
 ہم اک میں بد کے دھوکے میں آئے
 (احمد رضا)

میں بھلائی میں آئے
 ہم گھر چلے سے دھوکا کھا گئے
 (احمد عظیم قاسمی)

یہ داغ داغ اچھا ہے شبِ گریہ سر
 (فیض احمد فیض)

لیکن تمام تر شعور، آگہی اور محرقاتِ دہس کے ساتھ احتشام حسین کا اندازِ نظر کچھ اور تھا کہ کہتے ہیں۔

دش - سی بج دش اسے دس پر شوق
بے راہی تمام حریف تو میں ہے

یہ شعر احتشام حسین کی فکر اور اندازِ نظریں محرومِ سجدہ کی کرتا ہے اور مغیر کی تہ تیغ کے
سایہ میں مظہر میں اس کی حیثیت ایک ہے Theatrical ہے جو عام انسانوں پر سوچے اور محسوس
کرے کی ایک ہی صفت داکر کرتا ہے

احتشام حسین کی قاعزہ فکر اور شعری عظمت کی کچھ اور سیرازے کے ہے چند اشعار
پیش رہا ہوں گا

یوں گزرتا ہے تری یاد کی دانی میں دہل
چار روں میں کوئی نہ رہا ہو جیسے
بہ طرت کے تراویں سے پہلے نہیں کہیں
وہ مگر کچھ اہل صحت کی خطا ہو جیسے
وقت کے شور میں یوں بیچ رہے ہیں لمے
بچنے والی میں کوئی ڈاب رہا ہو جیسے
دکھے دم ہے سنا سیں کوئی میری
د - دنیا ہی کوئی کوہِ خدا ہو جیسے

...

ان آنکھوں کو نظر کیا گیا ہے
مراجہ کردہ رہا ہوا ہے
- جانے ہر جہاں حیات کیا ہے
غصوں پر مسکراتا گیا ہے
سین اک میں ہی محرومِ محبت
میں پہلے بھی اکثر ہو چکا ہے

...

محل دست میں کو سینہ بھر آئے ہیں
 صورت نظر سے اندر سر آئے ہیں
 دیکھا فوٹی فوٹی کون سی ہستی رہا
 اڑ کے دل تک جو کدورت کے عہد آئے ہیں
 زندگی راز کی ہوتی ہے دل دلوں کی
 گرچہ ہر راز وہی ہیں د راز آئے ہیں
 اپنے اہام سے خوش اپنی دھاپے بڑھیں
 مسکراتے ہوئے ہم جانب دار آئے ہیں

احتمام حسین اپنی شاعری کی چلی کو سدا کی عمر اپنی پہچان جاتے رہے اس عمل میں ایک
 سانس اور آواز دہلیزوں کو جیدائی مددوں اور دلچسپی حشر کی جانب سے جس غلط رویوں کا ہر
 بھی پیدا کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک صراحت کی یاسیت اور تخلیق کی گرفت میں آجنا ایک فطری عمل
 ہے۔ احتمام حسین اس عمل سے گزر رہے ہیں لیکن اسوں نے کبھی یاسیت کو حوصلے پر اندھیرے کو
 روشنی پر اور قومیت کو رجحانیت پر غلبہ نہیں ہونے دیا اس کی بجائے ایک نظم ہے "باپو سی کے
 لکھوں میں" اس کے معرعوں میں باپو سی کا ایک داخلی دھار جی جو موجود ہے جس خالق نظم کا سخت
 شعور اس سے آخر میں نکلتا ہے

چاہتا ہوں کہ تم ہاں کی ہاں میں - کروں
 آہ اس طرح کروں میں کہ - سن پائے کوئی
 یوں صدم توڑ دوں خلعت کے کہ اب حشر ملک
 بادش کے لیے صحتی - رہ جائے کوئی

کبھی کبھی جب وہ اس جدائی کے حصار سے باہر آتے ہیں تو ان کا رجحانی لہجہ

حافظ اور غالب کی رجحانیت سے مل جاتا ہے

ہوتا گل بیٹا کیم دے در مافر اندر ایم
 فلک را سلف بظاہر و طرح نو در اندر ایم

(حافظ)

یا کہ تانہ آسوں مگردا نیم
 آند گردش اصل کرس مگردا نیم
 (غالب)

حشام مسیٰ کہتے ہیں

ہجوم شوق ہے ، بار گل ویزا کریں
 شاد حال چہ علم در کو تار کریں
 صا کے ساتھ پیام سرے کے چلیں
 جس کے مچے دوس تو ہوشیار کریں
 خواں تے حوت سے رنگ از رہے ہیں ، بھولوں کے
 حد کیوں نظر آئے ، خواں چہ دار کریں
 چلائیں دہی خام دسم میں ایسی ہوا
 تجھس تے جو جس میں کو کلا دار کریں
 ہم صہ و کے مسخر ہیں رک نہیں کیجے
 پورات ہم ، کس تک چہ انتظار کریں
 نجوم د شمس و قمر دیکھتے ہی رک جائیں
 جہین اصل کو س طبع خود بار کریں
 حقیقوں کے سسے سائیں دنیا کو
 رہ جہین چہ طبع میں تار کریں

آخر میں حشام مسیٰ کی ایک ہم علم "کون ہے حلقہ ان نظموں کا" کا حوالہ
 پیش کرنا چاہوں گا جو اپنے انفرادی اسلوب میں ، موضوع اور شعور و لہجہ آگ کی ایک خاص سطح
 کی وجہ سے ہمیشہ قابل مطالعہ رہے گی۔ کسی کے جان میں سوال "ابھرتا ہے" "کلن ہے"
 حلقہ ان نظموں کا "۔

اور ہر جواب آتا ہے

مصلیٰ ما آک الہی ہے

میں نے کرب و مسرت کی دیا میں

مرگ و نیست کا ڈیرہ ہے
 بحرِ من اور فکر کے ناگزیر رہنے اور دُعا کے حوالے کی طرف میں شہر کرتے ہیں
 کہیں ہے مطلقِ امن لکھوں کا
 اس کو جان کے کیا پڑے
 کیا وہ امن لکھوں میں نہیں ہے
 جن کے بس سے ہیں و قلب تہا ہے جاگ اٹھے ہیں ؟

...

اس کو جان کے کیا پڑے ، اس کو دیکھ کے کیا لکھو گے

...

اس کے فکر کے آجے میں ہر تصویر چمک جاتی ہے
 اس کے دہن کی دھن میں ہر ریغ سے کوہل بھولتی ہے
 وہ طہر ہے ، وہ وصل ہے
 وہ طہر ہے ، جسم لگی ہے اور روح لگی
 وہ طہر ہے ، وہ الہام ہے
 تم نے اسے دیکھا بھی ہوگا
 اور اگر وہ حرفِ خدا ہے
 اس کو جان کے کیا پڑے ، اس کو دیکھ کے کیا لکھو گے ،
 کیا وہ امن شعروں میں نہیں ہے ؟

...

بحیثیتِ شاعر ، اعظمِ شمس کی کہیلی سہی ہے کہ وہ اپنے شعروں میں موجود ہیں ۔ ہم
 جب کسی ان کی شخصیت ان کے مزاج اور ان کی فکر و مرآت سے ملاقات کرنا چاہیں وہ اپنے
 فن ، اپنی شاعری میں لے جائیں گے

سہی مدد ، رہن و سکھ کے ٹوٹ گئے
 قصہ ہے ، پس ہی دیکھا لکھو گے

احتشام حسین اور پلیکانوف چند اشارے

ڈاکٹر آغا سہیل

اس موضوع پر میں فکر و شعور کے جو چند محرکات ہیں ان کا طور اختصار ذکر کر دیتا ہوں
ہے تاکہ احتشام حسین اور بیچہوف کے خیالات اور نظریات کے تعلق کا ایک ہلکا سا خاکہ سامنے
آجائے اور بعد کی گفتگو کی سمیٹ قائم ہو سکے

اولاً۔ پروفیسر محمد حسین مرحوم کا ایک تو یہی خطبہ جس کا عنوان تھا کہ کسی خیالات
جمیہ۔ پروفیسر ڈاکٹر ٹوپی چند ملک کا ایک مقالہ جس میں احتشام حسین کے تصور
خیالات کو مدد کر رہے بیچہوف کے خیالات سے لگے اور سمجھانے کی سعی کی گئی ہے اگرچہ اس سے
کچھ اختلاف ہو سکتے ہیں۔

ثانی۔ میں تمام مدد کی گفتگوں کے خیالات اور مضامین جنہوں سے مارکس کے لڑی جدیدی
نظریات کی تفہیم کے لیے بیچہوف حوالے عمل کیے ہیں

دعا۔ میں کا پروفیسر ڈاکٹر آپ صحیح معنوں میں ایک دانشور کپولٹ ہیں بن گئے جب
تک آپ بیچہوف کی تمام تصانیف۔ خصوصاً اس کا مطالعہ نہیں کر لیتے، میری مراد کہ مطالعہ ہے کیونکہ تمام
دعا میں مارکسزم اس سے متاثر ہو رہا ہے لہذا

ملاحظہ۔ اس کی موجودہ صورت۔ میں "مختصر مدد کی کارائشی نظریہ" اور اس
کے مورعین اور ان کے تجربے کو غور اور تیز سے اس کی طبیعت پسندی اور اصل ادبی

جدیداتی نظریات جو رہنما بنیاد

یہاں خواب آں منزل کے طور پر شدت میں لگے جا رہے ہیں بلکہ ہر کس کے ایک کھجور، شاعر اور مفسر اور اہلاد کے ایک دہائے ہر کسی نقطہ کے ہیں خطا نظر کے اشتراک کی تقسیم کی خاطر ہی کم ہے اور طالب علم کو شش کا ہر مقصود ہے صوماء اس ہے بھی کہ کارل ہارکس کی اٹھلی تعلیمت کو دوسری معاشرے میں پھیلاؤ نے اس طرح حراف کر دیا کہ کوئی دوسری مثال موجود نہیں ہے ہر کس کے نظریات کو ہمارے رہبر کے معاشرے میں جہاں عیسائی، ڈاکٹر عبد العظیم اور ملک راجہ چند و غیرہ عام کیا نقطوں میں احقر حسین داسے پوری، انجین گور کھپوری اور احتشام حسین کے بعد جہاں حسین، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر قمر حسین، ڈاکٹر محمد علی مدنی اور ڈاکٹر شارب ودلوی وغیرہ نے گہرا طرے سے استعمال کیا اور انہیں نام نکالوں سے کم دیش پھیلاؤ سے بھی استفادہ کیا یا رہے کہ پھیلاؤ فصل مفسر میں ہر نسبت کے عسکریات، سیاسی اقتصادیات، قانونی مددیات ہر کسی نظر میں دیت وغیرہ کا بستر بن کر رہا ہے

ممکن ہے کہ پھیلاؤ اور احتشام حسین کے ہیں گہری رہ نظریاتی اشتراک اور اختلاف کو کسی ایک فکری نشست میں دریافت کرنا ممکن۔ ہوئے کہ دونوں کے مختلف الحاث بہرہ گیر موصوعات ایک موصوے کے پچھ مختلف نکاتوں کے مفہوم میں انجین گور کھپوری کی شاید اس کمنٹری کو تو لیں صوب ہوئے لیکن کوشش ہے ہوئی کہ چند اشارے صرف ہو جائیں تاکہ ایک ایسی عمل سے آجائے صوماء اس ہے بھی کہ پھیلاؤ کے پیش نظر اس جرمی انگلستان اور دوس کے معاشرے کے عند احتشام حسین کے خصوصی طور پر مدنی کے معاشرے اور مدنی کو طوطا کھنکھ اور جدیدیادیت کے ہر کسی اصولوں کو سامنے رکھ کر معاشرتی تجربے سے اور فصل اپنے نتائج کا استفادہ کیا ہو معاشرے اور حراف بھی

۱۔ فصل سے احتشام حسین نے ہر کسی نظریات پر عمل کوں، قاعدہ اور رابطہ ایسی کتاب میں تفصیلی طور میں جو ہر ہو سکتی صرف ان کے متعلق معائنہ ہی سے ان کے نظریات کا استفادہ کیا گیا ہے ان کی میں انجین گور کھپوری میں مختلف النوع اپنی تحقیقاتی تدبیر اور سبکی موصوعات پر معائنہ کھجورے ہوئے ہیں دوسرے نکاتوں میں علی حقیقہ سے نظریاتی عقیدہ مستقلا ہے وہ ظاہر ہے کہ تمام نکاتوں کے تمام معائنہ کا رابطہ اور ان سے ہر کس انگلیہ کے نظریات کا پھیلاؤ سے تطابق ممکن ہیں ہے جیسے غور اور خرد سے کے طور پر احتشام حسین کی صرف دو کتابیں طوطا رکھ کر ایسی وہ

اور سلیج اور دلق ادب اور شعور اور صالح نکلنے جائیں گے وہ شاید معروضی بن گئیں کہ میری تاثیر رائے میں جی دلکش کھیل رہا ہے اور مقرر میں۔

ادب اور سلیج میں اشتہام حسین نے ادب کے سماجی دشمنوں کا نہیں کیا ہے اور ادب برائے ادب کے لرسوہ محمول اور انکار و نہ نظریے کو پوری طاقت اور توانائی کے ساتھ دیکھا ہے آج تو ادب پر نئے زندگی کا طعنے عام ہے لیکن حلق اور انکار کے زمانے سے لے کر حرق پسند تحریک تک اس سلسلے میں جو کوشش ہوئی وہ تاریخ ادب کا مثل نیست حصہ میں حرق پسند نظریوں نے اس نظریے کے قیام میں عموماً اور اشتہام حسین نے خصوصاً آری کد کوشش سے کام لیا کہ تاریخ کے ملائی جدیدیاتی تجربے سے کام لے کر ادب کے قدر میں کی تربیت و قدس کی ادب اور سلیج کے اکثر معانی میں جو موقف اختیار کیا گیا ہے وہ ثابت واضح وغیرہ سم اور بدلہ مل لہذا میں تدریجی حقیقی معاشقہ، عمرانی، ثقافتی، تمدنی، لسانی اور معاشی محرکات اور عوامل کے حصول اور سائنٹیفک تجربوں پر عمل ہے جس سے ہر کسی تک نظر سامنے آتا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ اکثر حسین رائے پوری جیسوں کو کھچوری اور پڑھ لیسر عبد العظیم و قیوم احتشام حسین کے پیش رو تھے اور اسی زمانے میں دانشور عبودت اور ان کے بعد دانشور محمد منین و غیرہ حرق پسند ادب کی تحریک میں شامل ہو رہے تھے لیکن اشتہام حسین حرق پسند میں بلکہ ہر کسی حرق پسند تھو تھے اور عام ہے پیش رو ہیں اور حسین میں سب سے زیادہ واضح اور غیر سہم ہر کسی نظریات کی ترویج و اشاعت لونی اور ملی لکھا ہے کر رہے تھے اشتہام حسین کے جس معاشرے کے وسیع علم میں کلام میں لیکن ہر کسی نظریات کی تفہیم اور ان کے اسلوب بیان میں کلام صاف ہے کہ اس میں توبہ کی اور اسامیایا جاتا ہے ہر کسی نظریے ملائی جدیدیات کی تفہیم کا اشتہام حسین کی تحریروں میں تصدیق اور قائل ہے ذوق ادب اور شعور میں ایک مضمون ہے "قلم کا فکر" اس مضمون میں اشتہام حسین نے قلم کے ذوق الفی کے نہیں میں تدریجی حالات کا جو معروضی جائزہ پیش کیا ہے وہ ہر کسی کے ملائی جدیدیات کے حقد فکر کی سترین تفسیر ہے اور میں تدریجیت یا تاریخ عصر اور Histoncity کے علم سے وہی کام لیا گیا ہے جو عامی پلمپوٹ سے تعلق رکھتا ہے مضمون کے لرسوہ اور انکار و نہ مانگیر دار۔ عام کا معروضی حق کیا ہے ایسٹ انڈیا کمپنی سے جس اشعوری جدائی لیکن صحتی نظام کی کھٹے کے معاشرے میں داخل ہیں وہی حق اور اس کے ملو میں جو روئی معاشرہ و نہ و نہ مشینی اور صحتی زندگی میں دھل رہا تھا اور جس کے سب اجتماعی زندگی کی رفتار میر ہو رہی تھی اس سے کھٹے کی کاپیٹل کر رکھ دی تھی قلم کا ذوق الفی اسی کھٹے کو رکھ کر دیا

بواحقا احتشام مسین نے یہ مصرعہ کی تدریج کو عام سورج کی نگاہ سے میں دیکھا اور عام سورج کی طرح
 طاہرین کے کارناموں یا نام رسالہ کارناموں کو مطلقاً اجمیت میں دی بلکہ عوامی معاشرے کے در دست پر
 تحریر کی نگاہی ان کی تحریکوں ان کے جذبات اور ان کے جدت و اصابت اور نظریات کو کھنگال
 کر اپنی جدیدی دقت کو اُترت میں لیا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ غالب کا اپنی حق کیا فکر اور کیسے اور کن
 اسباب سے تحت و سطح پر مصرع میں بھی ایسے نام رسالہ موجود تھے جو رنگ کی طرح ہلکے پر شعور
 کو غالب سمجھتے تھے اور ان کی تحریروں سے جو احساس پیدا ہوا تھا اس سے بل وائش کا ایک کارواں
 صحیحاً ذکر سے مختلف نکلا تھا احتشام مسین نے اس لحاظ سے کہ وہ دیکھا کہ وہ دیکھا کہ اس کی نظریات نظر
 سے اور درست ہے کہ شعور پر بار غالب ہے چنانچہ غالب کے دینی حق کی توجہ میں جو بلوکی سبب و
 عمل میں وہ دیکھا کہ وہ دیکھے تھے کہ مصلوب کے فرسودہ ٹھوں اور کاروائی جاگیر دار نظام کا حامل شر
 دینی داران کے ہی نظام کے تحت قائم ہوئے وہ ان احساسی زندگی کا دینی معاشرہ کھینچنے کے لئے تیار تھے اور
 معنی معاشرے کے مقابلے میں کہہ سکتے ہیں اور یہ کہ وہ دیکھا تھا کہ ان کی معنی زندگی کی رفتار تیر
 تھی کہ میں زندگی پر وہ آزاد و متحرک حال اور تیر رفتار تھی میں میں چنب اور روشنی پر وہ تھی اعلیٰ
 خفیں بلکہ خفیں کے مقابلے میں یہ تیر رفتار سے چھوٹی تھی اس میں اور مسالوں کی قتل و قتل میں
 کام آتی تھیں انہوں اور مجھ پر بار داری کے مقابلے میں کہہ کر جو یہ ہیں چلان جاری تھیں اس
 سے احساسی زندگی میں سرعت اور خوبصورتی پیدا ہو رہی تھی طرکیں کشادہ امکانات ہو رہی تھیں
 تھے طاہرین کی جگہ کھلے ہوئے پارک وجود میں آئے جو ہے تھے در حقیقت غالب انکار یہ گازیوں پر
 بیہوش ہو کر تھی بھٹی تھیں وہ کہیں جو جاگیر دارانہ نظام میں جاگیر دار کا کوڑا نظام تھا، ایک اس کی اس
 دلائی تک نظام ابن نظام ملی آتی تھی اسے آزادی کی معنی حد نصیب ہوئی اور اس نے روپے پیسے کی
 شکل دیکھی اور سے فرج کرے کی معنی آزادی حاصل کی کہ سے فیصلہ میں پوسہ عوامی پر ملازمت مل
 تھی جاگیر دارانہ نظام کی جگہ میں جسے وہ دیکھا تھا اسے سونے تلے کی روٹی کے سوا اور کچھ میر نہ
 آتا تھا، جنگ کی صورت میں تلوار یا نیزا اٹھا کر اور جاگیر دار کی حق میں شامل ہو کر محاذ پر پہنچ جاتا تھا اور
 جاگیر دار کے بے گت مرنا تھا اسے حاصل اس کا اس نظام میں بھی ہوتا تھا اور اعتمادی نظام میں بھی
 ملتی تھا جس اس کی حالت اس نظام میں قدم سے بستر تھی اسی مقام پر وہ دونوں معاشرے کے حوازنے
 سے صورت حال واضح ہوتی ہے

احتشام مسین نے اس کی نظریات کی جدیت کے مفسر بلکہ حقیقت کے ان تحریروں کو ٹھوٹا

رکھ جو جس سے جس میں، جسمانی، انگلیں اور دوس کے درمی معاشرے کو معصی معاشرے میں تبدیل ہوتے وقت کے تھے، غافل کی وجہ ہے کہ جس سے شروع شروع میں پلچاوت کے بعض نظریات سے اختلاف کیا تھا لیکن جب رومی معاشرے کو معصی معاشرے میں تبدیل ہوتے ہوئے اور بعض طاقت سے علاوہ چار ہوتے ہوئے جس سے مشہد کیا ہے، جب پلچاوت کے ہر کسی نظریات کی تفسیر کی قیادت نظر آئی تو اس سے رولا کا کہ آپ جب تک پلچاوت کی تمام فلسفیا، تحریروں کا مطالعہ نہیں کر لیتے آپ صحیح مارکسی نہیں بن سکتے

مجھے احساس ہے کہ نئے دوس میں جس کا بت گرایا جا چکا ہے کہ جس مجھے یہ بھی احساس ہے کہ نئے دوس کے ایڈیٹیشن اب وہ سری دیا کے بجائے جیسری دیا کی صف میں نظر آ رہے ہیں اور کاسہ گدائی ان کے ہاتھ میں ہے اور یورپ کا سرمایہ داران کا ان داتا ہوا ہے جیل سو ٹرم جو ایک ماٹرس ہے اس کے متعلق میں سرمایہ دار۔ نظام اس لئے کامیاب ہیں جو کہ اس کی میلو اور احساسات حاصل پر ہے۔ دوسرے ملکوں میں دوس کی قسمت جو بہت اچھی ہے کی ناکامی میں بلکہ اس انتظامیہ کی ناکامی ہے جو اسے چارہ ہی تھی مگر۔ تو ہر کسی نظریات کی شکست ہوئی ہے اور۔ پلچاوت اور اشتیاق حسین فرسودہ ہوئے ہیں بلکہ وہ جیسری دیا جو خود پہلی دیا بھی مرشد کے (slums) سطر تک پہنچی ہوئی ہے۔ دوس کا بھی اشتیاق سرمایہ دارانہ طبع کر رہا ہے اس سے پہلے سے کہیں زیادہ بلوکی جدلیت کے نظریے کی افادیت بڑھ چکی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس نظام سرمایہ دارانہ کی کوئی ماٹرس نہیں ہے بلکہ سرمایہ دارانہ بجائے خود اندھا نظام ہے جو ہر حال اور ہر صورت اسے مفادات کے تحفظ کی خاطر ہر زمانے پر ہر معاشرے میں اشتیاق قائم رکھتا ہے جو لوگ اور معاشرے دوس کا اشتیاق کرتا ہے۔ ہر کسی اینگر پلچاوت اور اشتیاق حسین ہر قسم کے اشتیاق کے خلاف میں چنانچہ جب اس مد معترض سے قطع نظر کر کے فرانس اور جرمنی کے ان ارباب دانش کے نظریات پر پلچاوت سے توجہ دی جو ہر کسی اور۔ بلکہ کے بلوکی جدلیات کے مفاد نظریات کی مدد تو بیچ اور شریع کر رہے تھے اور مطالبات پسندی اور آئینوں رم کو ہر قسم قرار دے رہے تھے پلچاوت سے اپنی اعلیٰ دوس داری سمجھتے ہوئے ان کی صحیح کی اشتیاق حسین کو بھی بعض ایسے ہی ترقی پسندوں سے واسطہ پڑا تو انھوں نے نہایت رومی صحیح اور برادری سے ان کی صحیح کی اور ایک ایسا حائل قائل کیا جو ترقی پسندوں اور ہر کسی ترقی پسندوں کے پاس آج تک قائم ہے کیونکہ ہمارے بعض نام سار ترقی پسند مجدد انقلابیات کے موصوفات میں جڑے، حیل اور وجدان کی بددلیت میں خود بھی گم ہو جاتے ہیں

اور اپنے قارئین کو بھی تم کر کے چمکاتے ہیں کہ وہ سطور ترقی پسند میں حالانکہ فکر و تخیل کی ارمیت سے ان کے پاؤں اکھڑ چکے ہوتے ہیں۔ حقیقی استعداد ہل سے ان کا ہاتھ ٹوٹ چکا ہوتا ہے، معروضیت سے دوست کش ہو چکے ہوتے ہیں بلوی جدیت اور تدریجی رفتار کا وہ مجوزہ چکے ہوتے ہیں جسکی وضاحتات ہیں جن میں شکوفہ اور احتشام حسین کے گہری اور تشریحی دھند سے مل جاتے ہیں کہ تکراروں میں حال میں Taine کے مسل وقت، زمانے اور سماج کے جلدی نظریے کو تاریخ کے بلوی تصور کے ارتقاء کے لیے ناگزیر سمجھتے ہیں

احتشام حسین سے اردو ادب کے علاصت کے تحقیقی ہیں منظر کو ٹھوکر رکھ کر جو تجربے پیش کیے ہیں ان کے حاکم میں جس بر تجربہ جگہ خود ہی سے مکمل معصل اور رقیع ہے کہ اپنے معاشرتی، تدریجی و معاشی سیل و سہل سے پہلے ہے اس میں ہنسی کا شعور، احوال کا اور ان کے مستقبل کی طرف ایک واضح اور طبع انداز موجود ہے شاید انکی وجہ صرف یہ ہیں کہ اس میں احتشام حسین کا مسلح علم اور ان کی بصیرت موجود ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ احتشام حسین سے ماحولک و معروضی اور بلوی جدیت پر مبنی تجربہ ہے جس احتشام حسین کی تحریروں میں مصداقت میں درج غالب ہے کہ وہ حد حکم ان کے مضامین میں مشکل سے نظر آتا ہے ان کی تحریروں میں ڈیوید ویل اس نے ہیں کہ ان کا ہنسی و رخ ان کے نظریات میں سمجھ اور ان کے توصیہ صورت فکرے مروجہ، مرتبہ اور معلوم ہوتے ہیں جس میں کسی قدر ان کی تحریروں میں وہ حد حکم کا اثرات افعال ہوتا ہے ان کے خیالات اور نظریات اکثر عجیدہ اور ان کا سبب بیان ڈیوید ہوتا ہے احتشام حسین کے فن میں عجیدہ۔ محض حقیقی ہے اور۔ محض تحسین جتنے اس کا دوسرا نام ملی اپنی طرح، تحسین کے جگہ ہے کہ جس فکر اور عقل سے تخیل ہوتا ہے بعض قدر ان سے اپنے لیے ایک علاحدہ نظام فکر و تخیل واضح کر رکھا ہے اور اپنی علاحدہ اور حلقہ بھی ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی اداس کی ڈیڈ پائند کوئی اور قسم کا احتشام حسین سے ایسا کوئی پینڈنٹل میں مایہ نہ چاچ پوچھے تو وہ عام قاری کے ذہن کی سطح تک نہ پہنچتا۔ ایک اداس و غمگین کا رشتہ اسوار کر رہے ہیں ۱۹۱۰ء سے لیکر ۱۹۲۰ء تک ان کی ہر تحریر اسی رنج پر قائم ہے جس کا سبب غالباً ہے کہ انھوں نے اپنے ذہن کی تربیت و تدریس خود کی اور ہر کسی فکر کے بیرونی نظریات اور بلوی جدیت کے سنان کے ضمن میں بیانات جیسے مضامین سے انجو خود بے حد واضح ہیں، مدلی

فکرِ احتشام

ڈاکٹر محمد حسن

ظنون کا مطالعہ بھی قیہ ہے۔ پہلے بے سنی اور بے اصل ہوتے ہیں، اول تو اعتدال ہی نہیں ہوتے، ہوتے ہیں تو ان کے معنی مضموم کوئی نہیں سمجھتا۔ پھر جب دہانوں پر چڑھ جاتے ہیں اور بکلی ٹھوکی کا حصہ بن جاتے ہیں تو دھیلے بھالے سے لگتے ہیں جیسے چاہے کام میں لے آؤ اور جس زاویے سے چاہے برت لو تو پھر محراب کے معنی مضموم حسین ہوئے لگتے ہیں اور پھر سیال تھا کرخت اصطلاحوں میں دھنسنے لگتے ہیں اور جس کسی نے وہ خط برتا دینے والے کے دہان کی ساری کھڑکیاں اور دریچے بند ہو گئے، گواہ مراد ہو گیا اور گھینے کی امید انٹل ہو گئی۔

لکھے دالوں اور پڑھے دالوں دونوں کو اکٹلی ہوتی ہے کہ گھینے میں بات کریں، مگر ہے پھر ہر دال کا اور پھر دال کو کوں کا کڑیلا، احتشام صاحب جی، رم دلا کہ شخصیت کا ذکر کر دیا گھینے سے ہٹ کر اور بیٹلوں سے بچ کر کیا جائے تو ان کی پوری شخصیت کی درد مندی اور گدازِ قلب کے ساتھ شاید زبانِ انصاف ہو سکے گا۔

دال کے چھوٹنے سے قصبے کے مسلم شیعہ کھرانے کے چشمہ درجہ اول سے رواقی ماحول میں آنکھ کھولی مضموم مراد، کچھ عربی، مفران پاک، کچھ عجمیت اور کچھ قدری، کھرازد اور سینی دال کو

محمی آیا ہو گا جو اس زمانے میں مسلم گھروں میں گواہوں کا درجہ رکھتا تھا یعنی علم اور سیرت
 احمد علی کی ہجرت سکھانے والی انگریزی تعلیم فیصلہ ہوا تھا جس سے دوسرے راستے کے حق میں
 ہو اور علی کو نہ تنگ نہ کسی انگریزی دور سے تنگ انتظام صاحب صدر پہنچ گئے اور انگریزی سے راستہ جاتا
 تھا تو ان کی طرف لڑی کشمیری اور کشمیری کی طرف امیر خواہی عظمت الگینڈا کی طرف

مگر یہ راستہ سیدھا سادہ تو نہ تھا یہاں تو بڑا کھیل نکلتا تھا ایک طرف ابراہیم آبادی تھے
 جو جو تھے انگریزوں کے نوکر اور ملک نوکر انگریزوں کے نوکر اور بادشاہ اور ملک و ملک کا ممبر کہ مذاق
 اڑاتے تھے کو پہلے لڑے کو لڑی کشمیر جاتے تھے دوسری طرف تھے سرسید اور ان کے ہم خیال جس کا
 فی اس سے خوش ہوتا تھا کہ مسلمانوں کو ان کی برتری بنے اپنے سینوں پر حکمران بنے جاتے اپنے
 گورنر انگریزوں کے ق۔ یہ شانہ کھوتے ہوں۔ جیسری طرف مولانا شبلی عظیم کو رو لے اور آپ جہاں
 عظیم کو رو لے لے گئی دور ہے بھلا جس میں مصلحت کی ترادہ مشرق کے قصد و تہ تیغ کو تو لیا
 پر کشمیری میں تھا بلکہ ان دنوں کے میل ملاپ سے وہ ایک یا آمیزہ تیار کرنا چاہتے تھے

اس سے پہلے کہ انتظام میں ان میں سے کوئی راستہ چلتے اور محمی کئی خاص و معمولیں
 مددی انگریز اور جلا بد مذہبوں کے مشرق میں روشن مہل کی مشعل تو روشن کرنا چاہتے تھے جس
 سے ترکی سے بی رندی پائی تھی مگر اس زمانے سے آگے جانے کو تیار نہ تھے اور منزل میں کی محمی سرکاری
 ملازمتوں کے اس پاس ہی کہیں حم ہوتی تھی اور دوسروں میں ایک یا شعور بھی کر دینے سے
 رہا تھا۔ دور و طرف میں گدھی نے تو ہانگ بی بھوت پر کربلا کی تھی اور تیر سطر کے بجائے
 مٹائے کا ایک ایسا اتھا اٹھیر۔ بھلا کیا تھا جسے شہ گرو سے لے کر اسپر سید مراد تک کا نام دیا جاتا
 تھا جس سے بڑا حرا کا تھا جو اہل سید کا جس نے لوگوں کو بھلا دیا

موتی نعل سید عادلان کا چشمہ و چراغ مس کے کپڑے سی سلی روایوں کے مطابق پیر میں
 سے مل کر آتے تھے چاکر، چشمہ، کھڑا، بھوڑ کر کھڑا، بی پر اترا آیا۔ آئندہ بھون کے آئندہ بھولتی پر
 خاک میں کر صاف بدھ کی طرح اپنی بیٹھو حرا کو سوتا بھوڑ کر بھو بھو بھول یا ترادہ نکل گیا دھس تھی تو
 قوی کر دی کی مگر آزدی کا یہ تصور محض گدھی کی کے دھنکی اور روحانی تصورات کا چرچہ نہ تھا اس میں
 اقتصادی مسدوت اور سماجی انصاف کی کوہر محمی کی ہوئی تھی جسے اس زمانے کی اصطلاح میں سوشلزم کہ
 جاتا تھا اس میں رینڈر کی نظام کا خاصہ حور قوں کے بے مہل کے مسدوت دور جو اور مہلوں کے لیے
 کارخانوں میں نیم ملکانہ حقوق کے خواب بھی شامل تھے۔

سوال ہے تھا کہ مغرب اور مشرق کے صدیوں پہلے جو جھک کھلتی تھی اس میں کوئی
 نکلے کو اپنا جائے احتشام حسین کا دل حساس ، دماغ تجسس اور نظر تیر تھی مدعا جبرل کرل والے
 دخول پر نظر نہ تھی اور جو اہل عقل سوا کے آزادی اور سوشلزم کے تصور نے دل سوا یا سیاست کے مو
 میدان تھے اس سے دوست کے دروں پر نہ گئے کسی سیاسی جماعت کے پیروکار نہ بنے مگر دہلی مست
 کسی حد تک حسین ہو گئی

دعوت کے دورے پر جانے کی ضرورت تھی کئی دعوت تو بائبل کے رستہ والے اس
 شریف دادے کے حساس دل میں بسا تھا اور پھر اے ایسا تھا اسی کی محل یکدم تھی تصور میں پورے
 کا پورا معاشرہ جس میں وہ مظر بھی تھے کہ پیشانی تک سر دھکے تلے دوازی گھن میں تخت پر رطل دھرے
 طلوت قرآن کرہی میں وہ مظر بھی تھے کہ دعوت کے غریب غریا عزیزوں کی طرح چلتے اور پاسے
 جاتے اور وہ مظر بھی تھے کہ لکھ نہ دینے پر بلکہ کسانوں کی صفحہ ریدار کے کڑے سے لودن ہوتی
 اور کھٹ کے پاؤں کے نیچے ہاتھ دے کر صبح سویرا غدا دینے جاتے۔ غرض مومیں بے پاد مومیں وہ
 بھی پشتی ، آئین آداب ، چوٹوں بڑوں کے خطا مراتب سے آبد گمرائے اور ظلم و ستم کی بے جا
 حکمرانیوں۔ کسانوں پر ہی نہیں ان لڑکے لڑکیوں پر بھی جو میر خدادا کی مرمی کے بغیر پار لیتی بار خیر
 حیات ملک کرنے کی جدت کریں اور پھر غریب اور مظلومی کے دلدادہ مناظر پر ہم چند کاظم اکا اور
 جن سے احتشام حسین کے ”درائے“ والے افسانے دجھو میں آئے۔

انھیں دون ایک صاحب ہوا کرتے تھے یہ تھپڑی جن کے نام کا ڈکا جتا تھا۔ باہر
 ٹکار ”دہ پادھی سے نکلتے تھے ، تھے تو مہلی نہ لرس کے کمر اغتھیل تکریری استھلت میں شاید بانی
 اسکول سے زیادہ کوئی سنی ٹکبٹ پاس نہ تھا مگر ان کے دماغ میں تجسس اور تفلیک کا کیزا اگھاتا تھا
 بھی اس طرح کہ دیار مانے کے سلسلے کے پیچھے قلم لے کر دوڑتے ، ان پر سوائے لٹن لگاتے اور اپنی
 محل و فہم کی روشنی میں انھیں سمجھنے سمجھنے کی کوشش کرتے۔ سب سے پہلے ادب میں آگئے۔
 مذہبی تصورات وہ بھی ایسے جن میں موموں اور بھتوں نے اپنے زبان و قلم سے بری پارس سے با
 سوار کر مقدس اور سلسلہ مارا تھا۔ بیلہ کی بت گھن ضرب پہلے انہی پر پڑی۔ مگر ان تصورات کے
 سارے جو کچھ ظلم اور اپنی مگر مگر فو نہ پڑی ہوئی تھی اس کا سیر آیا۔ مگر پھر کلم کلم آزادی مگر کا وسیلہ
 بن گیا اور احتشام حسین کے ”درائے“ والے افسانے اسی نگار کی برکت ہوئے۔ مذہب کی کھلت
 مظلوم نہ تھی مگر انہی سے علیحدہ کی جیل پر ہونے والے استھال کے خلاف گوازا اٹھانا ضرور مقصود تھا۔

مگر احتشام حسین کی کوپڑ میں شمرے کہاں، وہ تو حلائی افسانے کی دنیا سے بہت آگے تنقید کی سرحد تک جا پہنچے قصیدوں پر اگر انسانوں نے انحصار کے جو راہِ مدح جو راہِ سوچنے پر مجبور کیا تو نظموں کے سامنے اور بہت سے مظہر کھل گئے شاعری پتہ میں سے رہائے میں کرتے تھے، اس نثر بعد کی ایک مشہور نظم میں جو محمد مس فیکری نے "سیری بہترین نظم" میں بھی ظاہر کی ہے، اس خلاصہ صراحت سے کہا نظم کا پہلا شعر تھا

جب سما میں تم لکھ دیتی ہو کچھ حال اپنی بیماری کا
میں دیکھ کے حیرانی میں رہ جاؤں کیا کیا سوچا کرتا ہوں
اور اسی میں یہ مصروف بھی تھا

کچھ پانگل وحشی دیکھنے نظموں میں سامنے آ گئے ہیں
جی ہاں یہ پانگل وحشی دیکھنے نظموں میں سامنے آ گئے اور یہ سوال بھی سامنے آ گا کہ یہ ہم
آپ صوبے جیسے جیسے انسان پانگل وحشی دیکھنے کہیں ہوں اگر یہ بیماریاں منطقی ہیں تو یہ صبر یہ مہاری
اور منطقی انھیں کس نے دی اور کون انھیں اس حالت میں رکھے ہوئے ہے اور گراہی دنیا ہی میں
رہتا ہے تو یہ صبر یہ ادب کے یہ کھول یہ شاعری کی قوس قزح یہ افسانے کی جھلکی کیلاری یہ یہ باتوں کے
گہرے۔ آخر کیوں اور کس نے؟

انھیں دونوں صوبے کے مشہور اور مقصد قانون دان سرور حسن کی کوٹھی اور منزل سے
ایک یا شعلہ افشا کہ ان کے چھوٹے صاحبزادے سجاد عظیم انگلستان سے وکالت کی سند لے کر آئے
اور بجائے وکالت کرنے کے انھوں اور شاعریوں کے مورچے بن گئے۔ کہہ ان کا یہ تھا کہ یہ نظمیں،
غزلیں، افسانے بھی اختیار ہیں جن سے انھوں کا رخ اور جذبات کا دھاراموڑا جاسکتا ہے، اور سوڑا جاسکتا
ہے انحصار کرنے والوں کے خلاف مدد کے نام پر دلیا ہویت اور فرقہ پرستی، بھیدے والوں کے
خلاف، اور سب سے بڑھ کر انگریزوں کی ناجائز حکومت کے خلاف اور اس سے بھی بڑھ کر دہس کو جند
کرنے والی اجارہ داری کے خلاف۔

اب تو گویا اتول فیض اور دبیر کھل گیا اور احتشام حسین نے ادب کو اسی نظر سے دیکھے
اور رستے کی کوشش کی اب اس طرزِ تنقید کو کوئی سرے سے ادبی تنقید ہی نہ گردانے اور اسے محض
سمابیت کے خانے میں لا ڈالے چاہے اسے تھار خانے میں طوطی کی کوڑکے، اس میں ہلک فیس کہ
اس کو دے اس زمانے میں گلوں میں رنگ بھرا تھا اور یاد رنگ بھرا تھا پلوں پر پلنگی تھی اور ری دل

اور بار بار کہ میں نے ادب کے رین آموں دے میں تو کم سے کم ان کا رنگ تو حبابی صہر کر
وا

یہ طرزِ سخن خالصہ و صرف و باتوں کی تحصیل یہ کہ زندگی ایک مہر و اپنی ہے اور ادب
ای اپنی کا حصہ ہے۔ یہاں کے ایک سربراہی کی صرب پڑے گی تو زندگی کا پورا پورا گھٹنا پڑے گا اور
یہی حال ادب کا بھی یعنی آپ چاہیں یا نہ چاہیں جسے اچھلنے آپ کے قلم کی ہر جیش زندگی کو حلق
یا لگانا ہے قلم کی ہر لڑش میں ہے زندگی آفریں یا حیات بخشی اور اس ذمہ داری سے روگردانی ممکن
میں اس سے جب بھی ادب کو یا اس کے کسی چھوٹے سے چھوٹے شہ پارے کو دیکھیں یا پرکھیں
زندگی کی اس پوری اور سرور بخشی کا دامن۔ چھوڑیں اور اس آگہی کے اپنے آئین و ادب میں وہ یہ
آئین و ادب ہر لمحہ معرضِ تغیر ہی میں اس لیے ان تغیر پذیر حقیقتوں کی روشنی ہی میں ادب کو
گھما دیا کہ وہ گھومنا چھوٹے ہے کہ

جو دل کا حال ہے وہی دل کا حال ہے

دوسری بات یہ کہ حضور و عقیدہ محض باطن کی کوئی ہمیش خدمت گیر نہیں کہ جب چاہا پیر
سے حقوں قاسمی عبد الغفر، علی کی طرح بستر میں، بختیاب چاہا و حکم کر گھانا، اس کی پسند و نا پسند
کے بھی کچھ معروضی اصول ہیں اور آپ پسند کریں یا نا پسند کریں دلیل اور محبت کے ساتھ کریں
اور اس کاغذ سے عقیدہ بھی ایک ساحل ہے جو وہ بھی کوئی بصیرت نہیں دیتی بلکہ اس بصیرت کو زندگی
کی اعلیٰ تر اور وسیع تر بصیرت سے پہنچ کر مٹی ہے

عقیدہ کی رائے احتشام حسین محدث و نظم کے کوچے میں پہنچے ہیں جو کچھ انھوں نے
کی کس طرح پرما اور پرما کس طرح اپنے شاعروں کے دہان کی تیاری کی کیسے علم و حدیر سے
حال نفس چھپیں، دوحوں کو بھیا چھوٹوں سے شفقت کی، رر گوں کی، حتیٰ کہ مولوی عبد الماجد جیسے
مستند مزاج و رر گوں کی عزت کی یہ سب وہ ہے جو مطلق میں معلوم عوام است کما جاتا ہے۔
اکتا، املاہ شاید ضروری ہے کہ ان دور میں جب عقیدہ حضرت علی علیہ السلام اور حضرت علی ظہری کی رہیں دانی اور
ملت ملی تک محدود تھی اور اجازت و نیچے تو یہ عقیدہ کی کام بھی اس رر گہ خدمت میں شامل کر یا
جائے (مقصود ان رر گوں کی تخلیق نہیں محض اس دور کے عقیدہ مزاج کی سرحدیں وسیع کرنا ہے)
کی ہاں ای دور میں احتشام حسین کی عقیدہ تاریخ، تہذیب اور عالمی فکر کی سرحدوں تک اپنا دامن پھیلا
دیتی تھی، غالب کا فکر اور نظیر اکبر آبادی، ایک عوامی شاعر، جیسے معائن لکھ رہی تھی، مسرت

محبان، احقر شیرینی اور لالی پرے کے مجھے میں محسوس کر رہی تھی

بھر تو دیا ہی دل کی ملک اگر دیا اور آزادی سے پہلے کیا کچھ نہیں ہوا مسلم لیگ کا

مطالبہ پاکستان جس سے بڑے براؤں کے سر پر اکریا دیے جادی متعلق ملے سے سیاسی زندگی کے اصول و معین
 یوں ہو گئے، اکثر قوتوں کے طوفان سے گر گئے، اشتیاق حسین نے جس فکر کے سلسلے کو مضبوطی سے
 تھاما تھا وہ ان کے ہاتھ سے بچھوٹا، طوفانوں کے طوفان میں بھی وہ اندر گرو کی سطر توں کا تجربہ کرتے
 رہتے، ان سے بے خبر رہ کر نہیں ان کے درمیان رہ کر تڑپے وہ بھی بہت یوں کے مگر اس غم سے
 ان کے قلم کو ذرا بھی سکے نہیں رہا

سکتا شاید وہ جاننے ہی۔ تھے، کیونکہ جس گہری پس منظر سے انھیں، استقامت نکلتی تھی

اس سے انھیں میلہ دوی اور اعتماد سے بھی نواز تھا شہر شہر میں ایسا ہال آیا کہ احمد علی اور احقر
 مسین رائے پوری، اقبال کو فاشٹ ور فرائ کو میدا، جائیداد کی نظام کی علامت کہہ کر گردن دہلی قرار
 دے گئے، مگر اشتیاق حسین میں وقت بھی اور اس وقت کے بہت بعد کو بھی روح اقبال پر مضبوط
 کرتے ہوئے فکر اقبال کے دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہیں، تو مصیف، محض، محض جو میں نکالنے
 کا مشغلہ ہی حال بعد کا بھی ہے، ہر چھوٹا بڑا شعور باز شاعر محو نے بڑے ترقی پسند نقادوں سے سہہ پایا ہے
 کا، مگر اشتیاق حسین مر سب اور باوجود تمام مروتوں کے حامی، محسوس کہ ان کے رویہ فکر ایک طرز
 حیات میں تھی محض فارمولہ میں تھی

ہمیں کہنے کی بہت میں اور گہری پس منظر کی تفصیل کا اور ہے، یہ چھوڑ دے محض ایک پہلے

مصنف کے گہری پس منظر کا جس سے اپنی شخصیت کو بڑے طریقے اور احتیاط سے چھپا کر رکھا ہو، اس
 قدر احتیاط سے کہ قلوب قبال، اقبال بھی، اقبال سے انکار میں ہے، اس شخصیت کی ایک جھلک
 دیکھیں، اور اس گہری پس منظر کو اور زیادہ قریب سے پہچاننا ہو تو اس کے سفر نامہ 'مرکا'، 'ساحل'
 اور 'ممد' کا اثر کی باتیں پڑھیں جو شیکھنہ کے ایک کردار کی زبان اور ہوا ہے یہاں وہ زبانوں، آوازوں
 اور صورت سے عورت میں شخصیت پر سے کچھ قاب کھینچ گئے ہیں جسے شہزادہ گلجام کی طرح
 اشتیاق حسین نے اپنی ذات کے کنویں میں حد کر کے اس کے منہ پر سو لاکھ من کا پتھر رکھ دیا تھا کہ
 کوئی اس کی تعمیر کا ایک طریقہ یہ بھی ہے جسے جس دم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے

احتشام حسین اور جدید ترقی پسند نقاد

ڈاکٹر کھیل نواز شاہ رضا

اپنی تنقید شعروادب کی جہیوں اور حامیوں کی تلاش اور پرکھ کا کام ہے یہ تلاش اور پرکھ کسی معیار کو مد نظر رکھ کر کی جاتی ہے معیار کسی اصول اور نظریے کی روشنی میں مرتب کئے جاتے ہیں۔ صوفی و نظریات کسی مخصوص موقف کی نشاندہی کرتے ہیں اور تنقید کا ہر نظریہ ادب اور تنقید کی وضاحت کرتے ہوئے ان کے روابط اور ادب و شعر کی قد و قیمت متعین کرتا ہے۔ تنقید کے مختلف نظریات ہیں مثلاً اثرائتی تنقید، جمالیاتی تنقید، وسیلانی تنقید، سیمائی تنقید، ماحولیاتی تنقید، وجودی تنقید، عمرانی تنقید اور ترقی پسند تنقید وغیرہ۔ ان کا علم سب کو ہے کہ سید احتشام حسین تنقید کے ترقی پسند نظریے کو تسلیم کرتے ہیں، انھوں نے نہ صرف ترقی پسند نظریات کی تبلیغ و اشاعت کی ہے بلکہ نوجوانوں کا کام بھی تمام دیا ہے، انھوں نے ہر کسی کو تنقید نظر کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے تنقیدی سفر کی ابتداء کی مگر ان نظریات سے انحراف کیے بغیر اپنے علم اور مشاہدے، فکر و نظر کی بلندی و گہرائی کے ذریعے ترقی پسند نظریات میں اصرار نہ کیا تو جہاں تک ان کے ادب اور تنقید کوئے نظریات سے آشنا کیا جسے سائنٹفک تنقید قرار دیا جاتا ہے

احتشام حسین نے نظریاتی مباحث پرست کچھ تحریر کیا ہے ان مباحث کی مدد سے ان کے تنقیدی نظریات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے ان حکمران مضمون میں صرف اشارے کیے جا رہے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ عقیدہ ایک پرپیچ من ہے لطف معیار ۱۱ صوں اور
ضرورت کی روشنی میں عقیدہ کی تعریف کی گئی ہے اعتشام مسین کی نظر میں عقیدہ کا مفہوم واضح اور سہ
گیر تھا۔ انھوں نے تحریر کیا ہے۔

”اپنی عقیدہ ایک ایسی کوشش ہے جس کے ذریعے سے شعراء ادب کے
صحیح مفہوم، عملی فہم اور مقصد اظہار کو سمجھنے کی طرف قدم اٹھایا جاتا ہے“ افکار
درساکی معروضات ص ۷۰

اعتشام مسین کے نزدیک عقیدہ صرف تاثرات کے بیان کا نام نہیں ہے وہ اپنی عقیدہ کا
تحقیق زندگی سے منسلک کرتے ہیں اور ان کے خیال میں عقیدہ تمام جدید علوم سے منسلک ہے اور
تحریر کرتے ہیں

”دب کی عقیدہ زندگی اور زندگی کی قدروں کی عقیدہ ہے، یہی ہے اور کیا
ہونا چاہئے کی عقیدہ اور دب کے اندر عقیدے اور متر و نظم و مدح کی تلاش ہے عقیدہ۔
تو متر و نظم ہے سحر و جادو ہے فلسفہ، سیاست ہے اور باطنی لیکن علوم جس حد تک
انسانی دماغ میں داخل ہوتے ہیں اسے متاثر کرتے اور شعور کا جز بن جاتے ہیں یہی عقیدہ ہے
اگر عقیدہ کوئی عملی کام ہے اور جس تاثرات کا بیان نہیں ہے تو یہ تمام جادو و علوم سے
کام لیتا ہوگا جس سے زندگی اور ادب کو سمجھا جاسکتا ہے“ روح ادب اور شعور ص ۵۵

اعتشام مسین کے نزدیک عقیدہ کا مقصد ایک ایسے فلسفہ حیات کی تلاش ہے جو زندگی کے
مسائل و حل کر کے اس لیے وہ تاثراتی عقیدہ کو ناپسند کرتے ہیں اور ایسے عقائد کے تحقیق اظہار خیال
کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں

”وہ عقائد جو پر ابلی ثار نامے پر سر مٹھاتے ہیں، یہ سب اور شاعر کو پسند کرتا
ہے اور کسی نقطہ نظر سے تفریح میں کرتا جنوں“ نثر و نثر میں کا حال میں پلام کرے
۱۱ لے کا ہے جو ہر بل کی تعریف کرتا ہے“ عقیدہ ۱۱ عملی عقیدہ ص ۲۲

اعتشام مسین کا یہ بھی اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ وہی عقیدہ کے طے سے وہ
جدہ باتیت اور اطراوی تاثر کے قائل نہیں ہیں اور اصل وہ ادب کو زندگی کا آئینہ سمجھتے ہیں اور ادب
کے مقصد ہی ہونے کے قائل ہیں اور ادب کو مسرت اور حظ حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں سمجھتے ان
کے خیال میں۔

اس شعور کو زندگی کی کشمکش اور تجربوں سے متعلق جوتا ہوا تسلیم کرتے ہیں۔ "ذوق
ادب اور شعور متحد۔" ۱۲۴

"احتشام حسین کے رویہ کی ترقی پسند اور اشتراکی نظریہ ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ
اپنی عقیدہ میں، اپنی اور سماجی حقیقت پسندی کو اہمیت دیتے ہیں اور ہی کو مبالغہ قرار دیتے ہیں
"مبالغہ فقط نظر وہ ہے جو ادب کو زندگی کے معاشی، معاشرتی اور
حکامی روابط کے ساتھ متحرک اور تغیر پذیر دیکھتا ہے۔ یہ ایک ہمہ گیر نقطہ نظر ہے اور
اپنی مثال کے کسی اہم پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا۔" عقیدہ اشتراکیت ص ۱۲۵

احتشام حسین شعرا و ادب کی تخلیق و تعمیر اقتصادی رشتوں کے زیر اثر رہنے میں اس کا
مطلب و مضمون یہ ہے کہ ہمارے ادب کے جدیاتی لحاظ کے فلسفے کو تسلیم کرتے ہیں ان کا خیال یہ
ہے کہ شعرا و ادب کی قدر و قیمت کا انداز اس وقت تک میں لگایا جاسکتا جب تک اقتصادی رشتوں کی
روشنی میں ادبی تخلیقات کو نہ پرکھا جائے۔ وہ نہ صرف ہمارے ادب کے بلکہ جدیدیت اور تاریخی لحاظ سے
نظریہ کو تسلیم کرتے ہیں بلکہ ادب اور عقیدہ کے درمیان جدیاتی رشتے کی تشریح بھی کرتے ہیں اور
اسی نظریہ کو عقیدہ کے لیے مناسب سمجھتے ہیں۔ وہ ادب کو صرف ادبی نقطہ نظر سے ہی دیکھنے کے
فائل میں نہیں بلکہ ہمارے ادب کے نظریہ شعور کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ وہ اصل وہ ادب کے لیے شعور سے
علاوہ کوئی دوسری حلقہ درست میں سمجھتے انھوں نے ادب کو سماجی اور انسانی رشتوں کے ایک نہ شے
و اسے نظریہ کی شعوری گروہوں سے منسلک کیا ہے ان کا خیال ہے

"انسانی شعور میں تمام علوم کی فکر مرہلہ ہوتی ہے اور زندگی کے متعلق جو
نتائج ایک باشعور انسان یا ادیب نکالتا ہے وہ اس کے مجموعی علم کے تحت کش ہوتے
ہیں ادیب جو کچھ قلم کر پیش کرتا ہے وہ اصل میں ادبی نقطہ نظر سے جانچا جاسکتا ہے۔
فکروں کے لیے اس وجہ سے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کی نگاہ حقیقتوں کے اس عقیدہ
رہتے ہوئے ہو کر اُسے اور وہ ان تمام اثرات کا جانکا ہے انھوں نے ادب کے شعور کو
مرتب کیا ہے۔" عقیدہ اور عملی عقیدہ ص ۱۲۶

احتشام حسین ادب کی فنی اہمیت اور جدیاتی قدروں کی نفی میں کرتے۔ وہ حسن اور
جمالیات کو ادبی رشتوں اور سماجی حقیقت کی روشنی میں دیکھنے کے فائل میں سمجھتے ہیں کہ ان کے خیال میں فکروں
کا احساس جمالیاتی رشتوں اور رابطوں سے اثر قبول کرتا رہتا ہے اور انفرادی وجدان کے ذریعہ ذوق

حال و میں تلاش کیا جائے۔ وہ حقیقت کے متعلق یہ کھلا دہی رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں
 "ترقی پسند فکر و حقیقت، لفظی خوبوں اور لامرئی چیزوں کا احساس رکھتے
 ہیں اس سے متاثر ہوتے ہیں لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ حواس کا احساس حال و ادبی
 رشتوں اور اسلوب سے شہ پر ہوتا رہتا ہے" تنقیدی جارے ص ۱۳۱

کازول کے اپنی کتاب Illusions Reality میں تحریر کیا ہے کہ ہر کسی نے غریب عقیدہ کا
 منہ نہ دالا ہے کی سخت حد تک اس سے رشتہ الٹی رکھا چاہا ہے۔ اختتام میں کازول سے
 منہ نہ دالا ہے وہ اس غریب کو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ اس کی سخت حد تک اس سے رشتہ الٹی رکھے
 رشتہ کے عالی ہیں وہ تحریر کرتے ہیں

"ترقی پسند فکر و قدیم ادب کے سرہانے اوپر ہو کر گناہ رحم میں
 ایسا چاہتا ہوں اس سے زیادہ کوئی کا قائل ہیں ہے کہ ایک تدبیر و تدبیر کا دور
 ہے کہ شدت ہو سے حد کے رشتے جتنا چاہے وہ صورت میں سے یا ہی میں
 سان حال آریوں کو سان حال و حال سے متعلق ہوتے والے نیوٹون کی
 تاریکی اہمیت سے انکار کرتے ہیں" تنقیدی جارے ص ۱۳۱

اختتام میں شدت و جب کے مسئلے میں ہر کسی نے تسلیم کرتے ہیں کہ اس کے
 ادب شعور مادہ سے پیدا ہوتا ہے اس غریب کی میاں پر ہی اختتام حسین شعور کو مادہ کا پائندہ سمجھتے
 ہیں اس کا رشتہ درجہ بہ درجہ سے مضبوط کرتے ہیں اس کے چہل میں سب سے ترقی رکھا
 اس کا مادہ بہت ہی تاریکی و تاریکی ہے اس سے ادب سے اس کا تعلق بھی تنقیدی
 صورت میں کیا ہے وہ سان میں تبدیلیوں اور تغیر کے قائل ہیں کہ ان کے انکسار سے نہ حقیقت
 میں تبدیلیوں میں درجہ بہ درجہ سے تغیر و تبدیلیوں سے عوام لوگوں کے رہیں شش
 تاریکی سے تاریکی شش اور جدید سان میں تبدیلی کا باعث ہوتی ہے اس میں تبدیلی کا قائل تغیر
 متعلق نظریوں کو تسلیم نہیں کرتے۔

اختتام حسین کامیابی ہے کہ اخلاقی و مذہب حکم اس صفت و کیفیت پہنچتے ہیں اس کا
 اس کا سبب اس کی ترقیوں کو بے نقاب کرتا ہے تو خیر اس صفت و مذہب و اخلاق کا سبب ایسا ہے
 جس سے اس کی حمایت کے لیے مذہب عوام کو قناعت کا ورثہ دیتا ہے اور خیر اس صفت و اخلاق
 سبب اس کے لیے عوام کو تاریکی۔ حامل ہوتے

حشام حسین مارکسی یا ترقی پسند نقطہ نظر کو ہی سب سے ستر نظریہ تسلیم کرتے ہیں
اس کا اعتراف واضح الفاظ میں کرتے ہیں

”میں مارکسزم کو سب سے بلند و بالا فلسفہ سمجھتا ہوں اور اسی کی مدد سے
زندگی اور ادب کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اقتصاد اور عرفان
علم کے رستے پر گامزن ہو کر ہم اس چیلنج کو تلاش کرے جس کا پھیلنا حاصل کر سکتے
ہیں جن میں زندگی کے محور سمجھے جاسکیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ ادب کو سمجھنے میں
ترقی پسند راویہ لنگو سب سے زیادہ مفید قیمت ہو سکتا ہے جس سے دانشوروں کو جس اور
ادب کی تخلیق فنکار کے پسند سے ہی ہوتی ہے لیکن مراد کا شعور ہے اور کے ہاتھوں
سماجی حلقہ اور طبقہ کی کشمکش سے منہب ہوتا ہے۔ اس سے نقطہ کو ان میں کسی پہلو
سے آگاہیں نہیں نہ کہلی جائیں اور نہ ہی اپنی روایات، ریا کی کے اعتقاد کی حدود اور
تکلف سیاسی سماجی اور فلسفیانہ اثرات کا لنگہ کر کے ادب و ادیب کو سمجھا جاسکتا ہے
ادب کی ہر تبدیلی تحریر اور نفس مزاج ہی نقطہ نظر سے سمجھی جاسکتی ہے۔“

”روایت کا آئینہ جاتک اتھاس بھٹی ادب کا صفحہ ۶

یہ طویل اقتباس حشام حسین کے تحریکی نظریات کی تسلسلہ وضاحت کر رہا ہے اور یہ ترقی
پسند نظریات کے حالی میں دو ایک Committed ادب میں دو مارکس اور نیگلر کے خیالات کو
تسلیم کرتے ہوئے اس کی ترمیمی اپنی تحریروں میں سمجھ لایا جو اگر کہنے میں دو ادب کا رشتہ سیاست
سے جوڑتے ہیں۔ ادب کے عوامی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اس کے بھی خواہش میں کہ ادب سیاسی
حدود میں عملی طور پر شرکت کرے۔ دو ادب کو زندگی سلق اور معاشرے کی پیمائشوں اور ادیبوں کا
تعلق اور عائد سمجھتے ہیں اور اس مارکسی نقطہ نظر کو ہی مانتے ہیں سمجھتے ہیں اس کا یہ مطلب میں
ہے کہ وہ شخصیت پرست ہیں اور مارکسی نقطہ نظر سے اعتقاد کرے کہ سب سے میں خود میں کرتے
وہ انہیں پسند نہیں ہیں۔ دو مارکسی نظریہ اور عقیدہ کی غلامی کی مشددی کرتے ہیں۔ واضح پید و راہ
ادب کے مارکسی نظریے سے پیدا ہونے والی میکانیکی صورت حال سے دو اپنی عقیدہ کو پکڑنے کی کوشش
کرتے ہیں۔ دو تاریخی مہارت کے بھی قائل ہیں۔ وہ۔ ہی اس پر چھین رکھتے ہیں کہ ادب کو
معاشی ارتقاء سے میکانیکی طور پر ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے۔ اس کا اٹھایا ہے کہ سماجی اور تاریخی نقطہ نظر
ادب کی شخصیت اور انفرادیت پر روشنی میں دھنسا۔ وہ اس سے بھی وقف میں کہ سیاسی اور معاشی

نظریات کی طرف رہا تو وہ یہ ہے کہ ادب کی وہ اپنی قدر و قیمت نظر انداز ہو جاتی ہے اور اس طرح وہ ترقی پسند عقیدے سے نفرت کرتے ہوئے اپنے دامن و گھر سے جن نظریات کو تحریب دیتے ہیں ان میں ہر کسی عقیدے کی آمیزش کے رہے، و یک مانتھک نظریے کو جنم دیتے ہیں اور اس طرح اعتشام حسین اردو عقیدے کو ایک نئی اساتذہ شاخیں کرتے نظر آتے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ اعتشام حسین کے عقیدے کا روشنائی عصر سے جوڑتے ہوئے اردو عقیدے کو بے شعور عطا کیا کہ ناقد کو وہ ادب اور روایت کے حصار سے نکل کر مقامی اور تہذیبی روشنی میں عقیدے کو جانچے۔ ان کے عقیدے کی مضامین کا مطالعہ کر کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے شعور ادب کو پرکھنے کے لیے وہ ادب ان محض تاثر و صرف و نحو اور جمالیاتی نقطہ نظر کی بجائے تاریخی معیروں اور معرکوں کی آمد پر، اردو ادب میں طرح عقیدے کو رنے ملی، تقریباً ہر تھیں کی سطح سے بلند کر دیا انھوں نے عقیدے کی حیثیت عوامی کے بجائے عقیدہ استلال کو قرار دیا۔ انھوں نے اردو عقیدے کو وسعت و عسری و عصری و استغنی کی بصیرت کے ساتھ ساتھ علم و دانش کے گہرے تعلق سے سوار کرتے ہوئے ایک نیا طریق کار دیا اس طریقہ کار کو مانتھک عقیدے کا نام دیا جائے تو غلط ہے جو

ظاہر ہے کہ ایسی عقیدے جس میں اس درجہ معروضیت ہو کہ ادب و شعر کے پرکھنے کی داغ بخت اور علمی کاوش ہو، ایک مکمل و بے غلی نقطہ نظر ہو، عصری آگمی اور جدید مسیت کا پورے طور پر خیال کیا گیا ہو، بی سسل کو متاثر کرے، بلکہ ہر ذی شعور و غیر متعصب نقاد و نگار ادب اور قاری پر یکساں شے والا نقش چھوڑے گی یہاں پر اعتشام حسین نے اپنی نظریاتی اور علمی عقیدے کے درجے نہ صرف نئے نقادوں اور ترقی پسندوں کو متاثر کیا بلکہ انھوں نے پوری سسل کے دامن و ادب کی رہنمائی اور مہارت میں بڑی بیاداری کروا دیا۔

اس کا اثرات تو اعتشام حسین سے شدید اختلاف رکھنے والے بھی کرتے ہیں کہ اعتشام حسین سے زیادہ کسی نقاد و ادیب کے اثرات نے نقادوں اور ادیبوں پر نہیں ہیں۔ اثرات منفی اور مثبت دونوں ہیں ثبوت کے طور پر یہ تحریر کیا جاسکتا ہے کہ جدیدیت کے علمبرداروں نے بھی سب سے زیادہ جس نقاد کی مخالفت میں اپنا دور صرف کیا ہے وہ اعتشام حسین میں اور اصل میں کی وجہ یہ ہے کہ اعتشام حسین کی تحریریں بی سسل کے لیے مشعل رہیں اور کسی دوسرے کا چرخ اعتشام حسین کے سامنے روشن نہیں رہا۔

اگرچہ اعتشام حسین باقاعدہ طور پر کسی کھنڈ گھر کے بنی نہیں فر دیا جاسکتے لیکن انھوں

نے اہل حقید میں ہم کسی حقید کی جس قدر سے تشریح، تفسیر اور تفسیر کی ہے اس سے انھیں اہل حقید میں ایک کھنڈر نظر آیا ہے۔ یہ کھنڈر مانتھن حقید کا ہے جسے عبداللہ دریا آبادی نے "اختصاصی حقید" کا نام دیا ہے۔

اختصاصی حقید کے اس کھنڈر کے ذیلی وارث موجودہ دور کے اہل حقید ہیں۔ ان کے کھنڈر کے مانتھن کی ترتیب ان میں ان سے راہ راست استنباط کر کے والے بھی ہیں اور شاگردوں کے علاوہ انہی شخصیتیں بھی ہیں جو ان کے شاگرد ہیں وہ ہیں لیکن ان کی تحریر و حقید کے ان پر بے حد اثر ڈالا ہے انھیں نے ترقی پسند نظریات کو اپنا لیا ہے

نے ترقی پسند نظریات کے اختتام حسیں کے اصول و نظریات کی پیروی کرتے ہوئے اہل حقید کی جدید روایت کو آگے بڑھایا ہے اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اختتام حسیں نے ترقی پسند حقید کے بنی ہیں۔ خود ایک دہائی تھے کہ اس دہائی سے نئے نظریات ہیں اور اختتام حسیں کی حقید کے بعد ان کو پوری سلسلے اپنا لیا ہے

نے ترقی پسند نظریات میں جو حقید نگار کسی کسی طرح اختتام حسیں سے متاثر ہیں ان کی صورت بہت طویل ہے۔ ڈاکٹر عبود ریوی، ڈاکٹر صیف فوق، ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر قمر رحیم، ڈاکٹر شریف، ڈاکٹر محمد عقیل، پروفیسر شہباز الحسن، ڈاکٹر اجازت حقوی، ڈاکٹر محمود الحسن، ڈاکٹر نسیم نکت، علیہ سہیل، ڈاکٹر سید بلال حسین، رموی، نسیم قریشی، ڈاکٹر امین فرید، ریاض صدیقی، ڈاکٹر طاہرہ ام، عبدالستار قاسمی۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ڈاکٹر نسیم حلی اور عاشور کاظمی وغیرہ ان سے نظریات اور موجودہ دور کے دانشور ہیں جو مستحق و مانع طور پر اختتام حسیں سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں ان تمام نظریات کا جائزہ پیش کرنا ممکن نہیں ہے اور۔ یہ ان اثرات کی متعدد ہی اس مختصر مضمون میں کی جاسکتی ہے۔ یہاں چند اہم ترقی پسند نظریات کا تذکرہ مختصر میں جارہا ہے جو دہائی اختتام حسیں کی شمع کو روش کئے ہوئے ہیں اور ان نظریات کی حقید کے ان عناصر کی نشاندہی کی جارہی ہے جن کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ نظریات اختتام حسیں کے کھنڈر سے تعلق رکھتے ہیں۔

دہائی اختتام سے تعلق رکھنے والے پہلے نظریات عبود ریوی، ڈاکٹر عبود ریوی، ڈاکٹر حشام حسین کے راہ راست شاگرد ہیں۔ انھوں نے اختتام حسیں کے زیر نگرانی تحقیقی مطالعہ بھی تحریر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ شاگرد نے استاد کے اثرات تبدیل طور پر قبول کئے ہو گئے۔ اہل حقید کو ارتقاء

تقیدی راویہ، تنقیدی تجربے، طرز اور مطالعہ غزل، موسم اور مطالعہ موسم، وغیرہ عبارت بریلوی کی کراں قدر تصنیفات میں ان تصنیفات کے مطالعے کے بعد یہ انداز ہوتا ہے کہ عبارت بریلوی احتشام حسین سے ست زیادہ سزا میں وہ بھی احتشام حسین کے اس نظریے کو تسلیم کرتے ہیں کہ شعر و ادب میں نئے رجحانات، محرکات اور جدوجہدوں کی رجحاناتی حالات اور بلوی تغیرات ہوتے ہیں ان کا خیال ہے کہ جدیدی رد عمل کی بنا پر ہوتی ہے۔ وہ ادب کی مقصدی سمیت کو تسلیم کرتے ہیں جس ان کی نگاہ میں ادب کی مقصدیت کے ساتھ اس کی مادیائی حویاں، رہن کی دلکشی، مبالغہات کی مہندی اور قدرت بھی اہم ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ادب سماج کا آئینہ ہے اور سماج کا عکس ہونا کر کے ادب کا مطالعہ ممکن نہیں ہے۔ ان کے نزدیک حقیقت میں ایک عمل ہے، ادب ایک سماجی رید اور ہے۔ اس لئے وہ ادب کو سماجی عوامل کی روشنی میں دیکھنے کے حق میں ہیں۔ وہ یہ سمجھتے کہ عقلی اور سماجی شعور کے بغیر شعر و ادب کی تنقید ممکن نہیں ہے۔ وہ تنقید میں توازن چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک تنقید میں توازن ہی وقت ممکن ہے۔ ہر کسی نقطہ نظر سے ادب کی تنقید کی جائے۔ وہ تنقید کو رٹنا پھر سمجھتے ہیں اور ادب کو زندگی، تمدن و تمدن کا ترجمان اور نقطہ قرار دیتے ہیں۔ خود کے یہ تنقیدی راویہ، تنقیدی تجربے، ادب و تنقید کا ارتقاء۔

عبارت بریلوی تنقید کے لیے سماجی، تاریخی، اور عمرانی نقطہ نظر کو تسلیم کرتے ہیں اور انھوں نے ان نظریات کی پیروی کی ہے جن میں احتشام حسین نے مہم دیا۔ عبارت بریلوی اپنی ملی تنقید میں بھی یہی اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہیں اور عملی تنقید میں وہ ان اصولوں سے راہروائی کرتے نظر میں آتے جن میں وہ تسلیم کرتے ہیں۔

عبارت بریلوی کے بعد احتشام حسین سے جو جدید ترقی پسند نگاہ سب سے زیادہ سزا نظر آتا ہے وہ ڈاکٹر محمد حسن میں۔ ڈاکٹر محمد حسن نے ترقی پسند نگاہوں میں سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی تنقیدی نگارشات کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے استاد احتشام حسین سے سب سے زیادہ تاثر قبول کیا ہے۔ ان کی تصنیف اپنی تنقید، ادب میں رومالوی تحریک اور شاعری کا نگار اور تدریسی پس منظر، جدید ادب، متان، عرفی ہر اشیاء، جیسے، مراد، سوا، کہ سلاط، ہندی ادب کی تاریخ وغیرہ اس کی شہادت دیتے ہیں۔ ان تمام تحریروں اور مضامین کا مطالعہ کر کے بعد جو رمانی کی رحمت میں اور مجموعوں کی صورت میں شائع ہوئے ہیں یہ انداز ہوتا ہے کہ ڈاکٹر محمد حسن اور احتشام حسین کے تنقیدی نظریات میں کافی مماثلت ہے۔

وہ بھی احتشام حسین کی طرح سیاسی، تمدنی اور عمرانی مطالعے کو اہم قرار دیتے ہیں۔ وہ بھی ادب کا رشتہ زندگی اور سماج سے جوڑتے ہیں وہ ترقی پسند نظریات اور احتشام حسین کے نقطہ نظر کے رد و ست حائل ہیں اور اپنی تنقید کے لیے ہر کسی نقطہ کو ہی اہمیت دینے کے حق میں ہیں۔

احتشام حسین ادب میں سادہ سچی حقیقت اور مہارت، تاثیراتی دلکشی، جمالیاتی حسن، طبیعی دروں جلی اور زندگی کی تبدیلیاتی حقیقت کو دیکھ کر اس کے اقدار کا تعین کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسین بھی اسی نقطہ نظر سے شعر و ادب کی تقسیم و تشریح کرتے ہیں اور اپنی تنقیدی نگارشات میں انہیں نظریات کی حمایت اور دھماکت کرتے ہیں، مگر یہ صود ہے کہ ڈاکٹر محمد حسین نے اپنے ذوق، شعور، اپنے فکر اور گہرائی اور دلوں میں وسعت نظری، بدیع نظری اور وسعت فکر سے ان نظریات کو نیا اور دل نشین رنگ و آہنگ عطا کیا اور جس ہم آہنگی، ادب کی صیرت، انفرادیت اور انوکھیت پر یکساں دروسے کر احتشام حسین کے تنقیدی نظریات کو اور زیادہ اعتبار بخشا وہ جدید ترقی پسند تنقید کو آگے بڑھایا اس طرح انہوں نے اپنے اسلوب احتشام حسین کی پیروی کرتے ہوئے تنقید میں اپنی انفرادیت کو بے قرار رکھا ہے۔ ان کی تنقیدی صیرت اور ہر گھر گھر کا بندازہ ان کے تنقیدی مضامین سے لگایا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر محمد حسین نے احتشام حسین کے اسلوب کی پیروی میں کی ہے۔ ان کے اسلوب میں حقیقی شاعر ہے۔ ان کا اسلوب اور سلفہ طرز فکرش۔ صرف ان کی تنقیدی نگارشات کو تمدنی مطالعہ کرتا ہے بلکہ انہیں بے استعارے مزین بھی کرتا ہے۔

[حوالہ عرض ہر شہد، ہر سہ، اپنی تنقید و عیرو]

احتشام حسین کی پیروی کرتے ہوئے محمد حسن غنی سہل کی حوصلہ افزائی کرتے نظر آتے ہیں اور غنی سہل کو آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ وہ مصنف ہے جو دوسرے نقادوں کے برعکس نظر میں آتا ہے کہ چائے تو غلط۔ ہو گا کہ محمد حسن غنی حقیقی معنوں میں احتشام حسین کے کچھ فکر کے سب سے پہلے معترف ہیں اور انہوں نے ہی ترقی پسند تنقید کو توازن، وسعت تمدنی اعتبار اور غنی جوتوں سے آشنا کیا ہے۔

غنی ترقی پسند تنقید اور احتشام حسین کا ذکر کرتے وقت ڈاکٹر سید محمد عقیل کا نام فراموش نہیں کیا جاسکتا کیونکہ سید محمد عقیل غنی ترقی پسند تنقید کے علمبرداروں میں سب سے زیادہ سہلی نظر آتے ہیں اور اگرچہ وہ احتشام حسین کے براہ راست شاگرد ہیں لیکن ان کا اور احتشام حسین کا برسوں ساتھ رہا ہے لہذا نظری طور پر سید محمد عقیل نے احتشام حسین کی شخصیت، ان کی

تجدیدی نگارشات، اصول و نظریات سے بے حد اثرات قبول کئے ہیں۔ اعتقادات حسین اور سید محمد عقیل کے تجدیدی اصولوں اور نظریات میں بلاشبہ مت حد تک مماثلت نظر آتی ہے۔

فی لکریں، ادا شوقی کا ارتقاء، شمالی ہند میں نئی طاعت نگاری، تجدید و عصری نگہی و عصری عقلی رموی کی دو تصنیفات ہیں جن کا مطالعہ میرے دعوے کے لیے موت فرہم کرتی ہیں۔

سید محمد عقیل جدید ترقی پسند عقائد میں ایک ایسے عقائد میں مصوں نے اعتقادات حسین کی طرح مت زیادہ نظریاتی مضامین تحریر کئے ہیں اور اسے مضامین کے ذریعے انھوں نے ہی ترقی پسند عقیدے کے اصول و نظریات کی وضاحت کی ہے۔

سید محمد عقیل یہ سمجھتے ہیں کہ ادب کا مقصد زندگی کی عکاسی ہے۔ ادب معاشرے کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ اس لیے ان کا خیال ہے کہ فنکار آزاد ہونے کے بغیر جو اپنے آپ کو ان کے رذیلہ فہم اور عقیدے کے عید مطلق میں ہوتے۔ تفسیر اور تبدیلی بنا کر رہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ فن کار ہر دور میں اپنے سامع کا نمائندہ، ان کے ذوق اور خیالات کا مطلع ہوتا ہے۔ وہ تجدید کو دعوت دے گا۔ ان کا خیال ہے کہ تاریخی و سماجی شعور کی تلاش ہی عقیدے کو ماضی تک پہنچاتی ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ فن کی عقیدے کرتے وقت ہر عصر، ہر قوم کے عامل رجحان کے جب اور حقیقتوں کی تلاش تاریخی اور سماجی طریقوں سے ہی ممکن ہو سکتی ہے۔

سید محمد عقیل نے ہی ترقی پسند عقیدے کو سب سے پہلے یہ عقیدہ دیا ہے کہ انھوں نے حمایت کے رشتے کو سماجی عقیدے سے جوڑ دیا ہے۔ وہ حمایت کے نظریات کو بھی جدید میں تفسیر دے سمجھتے ہیں۔ اعتقادات حسین نے حمایت کی بار کسی نقطہ نظر سے جو وضاحت نہ تھی عقیل رموی نے اس میں اضافہ کرتے ہوئے اس لحاظ سے اس کو دور لرے کی کوشش کی ہے کہ ترقی پسند عقائد ہمدانی نقطہ نظر کو یکسر فراموش کرتے ہیں۔ وہ اپنے تاریخی سماجی اور تاریخی شعور کی مدد سے ادب پر انھیں کے نئے راستے اور نئے طریقے نکالتے ہیں۔ اعتقادات حسین سے تاثر قبول کرتے ہوئے ان کی ہی طرح جدیدیت سے مرعوب رجحان کے خلاف اظہار خیال کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جو مشعل اعتقادات حسین سے روشنی کی تھی اسے سید محمد عقیل آگے دھکتے ہیں ان کے اور ہی ترقی پسند عقیدے کو اپنی نگارشات کے ذریعے اور زیادہ ہمدانی عقائد کریں گے۔

ایک دوسرے نے ترقی پسند عقائد کا کٹر قہر میں ہیں جو اعتقادات حسین کے برادر مت شاگرد ہیں لیکن انھوں نے اعتقادات حسین سے بے حد اثرات قبول کئے ہیں اگر یہ کہا جائے تو

ظاہر ہو گا کہ احتشام حسین نے اردو تنقید کے جس ماحقق کچھ مگر سے آشنا کیا ہے اس کچھ مگر کی بلند عمارت کی توجہ قرار بخش کی تنقیدی نگارشات کے ذریعے پوری ہے۔ قرار بخش نے صرف ان اصولوں اور نظریات کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں جن کی احتشام حسین نے تصنیف و اشاعت کی بلکہ وہ نئے حالات اور جدید تناظر میں ان میں اضافے بھی کرتے نظر آتے ہیں۔

ملاش و توازن، تنقیدی تناظر، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ، فحشی پریم چند شخصیت اور کارنامے، ترجمے کا فن، اردو ڈرامہ، وغیرہ کا مطالعہ کرے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان اصول و نظریات کو تسلیم کرنے میں جو احتشام حسین کے رویہ کا سہارا ہے۔

قرار بخش سماجی حوالہ اور فنی تخیل پر یکساں توجہ دیتے ہیں ان کا خیال ہے کہ فن اور فنکار پر افسانہ چیل کرنے وقت داخلی محرکات اور سماجی حالات دونوں کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ قرار بخش سماجی اور تاریخی حوالہ کے ساتھ ساتھ فنکار کی شخصیت کا مطالعہ کرنے کے لئے داخلی محرکات کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ ایسی سے وہ دوسرے ترقی پسندوں سے الگ ہوتے ہیں اور بھی نئی ترقی پسند تنقید کے لیے ان کا انداز ہے۔

قرار بخش نے سمجھے ہیں کہ فن علماء میں وجود میں نہیں آتا تخلیقات روایات اور سماجی باتوں سے وابستہ ہوتی ہیں اور ادب ماکن و جدید تصورات کا اظہار نہیں ہے بلکہ وہ بدلتے ہوئے معاشرتی نظام تمدنی اقدار اور سماج کے ارتقاء کا ایک جز ہے۔ اس طرح قرار بخش احتشام حسین کے تنقیدی نظریات سے نہ صرف قریب نظر آتے ہیں بلکہ یہ بھی انداز ہوتا ہے کہ انھوں نے احتشام حسین کے تنقیدی نظریات کو تسلیم کرے ہوئے اسے وسعت دی ہے۔

قرار بخش فنی کارنامے کے لحاظ سے سماجی تغیرات اور عقلی کشش سمجھتا ہوئے دے دے حالات کے ساتھ ساتھ فنی حسن و قبح پر بھی خصوصیت کے ساتھ توجہ دیتے ہیں۔ وہ فنکار کی شخصیت اس کے جزئیات، عملی اقدار، فنی صنعت کرنی سماجی رویے، روشنی کے حالات، اقدار کی تبدیلی کو مد نظر رکھتے ہوئے تنقید کرتے ہیں۔ وہ ادب کی تخلیق اور خارجیت پر یکساں توجہ دیتے ہیں اور عصری رنگی کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں۔ وہ احتشام حسین کی طرح سادہ سادے اسلوب، جس میں سادگی، تنقید کی اور غصہ، رنگ ناص ہے میں ہے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

ڈاکٹر شارب رزوی نے ترقی پسند نظریوں میں ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ احتشام حسین کے بار آور مت شاکر ہیں اور انھوں نے احتشام حسین کے راجنرالی تحقیقی مقالہ بھی

تحریر ہے وہ عیشام حسین سے بہت قریب بھی رہے ہیں مدد انکی تحریروں پر عیشام حسین کے واضح اثرات نظر آتے ہیں۔

انکار سودا، عراقی انیس میں ڈرامائی عناصر، مطالعہ ان، جدید اردو تنقید، اصول و نظریات و میراث کی ہم تصنیفات ہیں جس کا مطالعہ میرے دعوے کے حق میں شواہد دے گا۔
 شارب سے ادب، زندگی اور صحت کے رشتوں کو اپنی طرح سمجھتے ہوئے ہر کسی فلسفہ، تنقید کی جوہوں کو پرچھنے ہوئے، عیشام حسین کے نقطہ نظر کو درست دیتے ہوئے ہی ترقی پسند تنقید کوئی راہوں پر گھمراہ نہ رہے کی کوشش کی ہے

شارب و برب سے ادب کے نظریے کے قائل ہیں میں وہ ادب کے مقصد ہی ہوئے کے قائل ہیں ان کے نزدیک شعر و ادب وجدانی ہیں ہوتا وہ سے منظم عمل قرار دیتے ہیں اور یہ جہن خدہ کرتے ہیں کہ فن کا اثر سماج اور ماحول پر پڑتا ہے اور شعر و ادب کا رشتہ سماج سے الگ نہیں کیا جاسکتا

ریاض مدنی کا نام بھی مٹے ترقی پسند نقادوں میں بہت معتبر سمجھا جاتا ہے اگرچہ وہ عیشام حسین کے برادر است شاعر و کس میں لیکن انھوں نے عیشام حسین کے انکار و نظریات سے بہت کچھ حاصل کیا ہے خصوصاً طور پر نظریاتی تنقید کے مسئلے میں عیشام حسین نے جس فلسفہ مدد دیا ہے اس کی وہ پیروی کرتے نظر آتے ہیں ان کا انداز بھی عیشام حسین کی طرح مدخل طریق سے اپنے خیالات کو پیش کرے کی کوشش کرتا ہے

سندھ میں اردو شاعری کا تنقیدی جائزہ، غالب مت، جدید مضامین، تنقید، طالب برہ، ہاں اور حرف دار، و میراث کی تصانیف ہیں اپنی اس تنقیدی نگارشات میں ریاض مدنی عیشام حسین کے تنقیدی اور ادبی نظریات کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں

نئے ترقی پسند نقادوں میں ڈاکٹر محمد علی مدنی کا نام بہت مست ہے اگرچہ محمد علی مدنی عیشام حسین کے برادر است شاعر و کس میں لیکن ان کی تحریروں کا مطالعہ اسے دلاور ہے کہ وہ نگائے گاکر کا تعلق بالکل برادر است و بعض عیشام حسین سے ہے، چونکہ عیشام حسین کی طرح نظریاتی تنقید پر وہ مسلسل اظہار خیال کرتے رہتے ہیں جدید ترین ادبی تحریکات کے متعلق باہم ہوئے کے بعد وہ عیشام حسین کی طرح ہی ترقی پسند نقطہ نظر سے تجزیاتی اور تاریخی حاکمہ کرتے ہیں۔
 عیشام حسین کی طرح وہ جدیدیت پسندوں سے نظریاتی مباحث کرتے ہیں اگرچہ کہا جائے تو غلط

ہو گا کہ محمد علی مدظلہ سے احتشام حسین کے افکار و نظریات کو جدید دور کے عالم میں جدید حیثیت کو دے نظر رکھتے ہوئے نئی ترقی پسندی کے لباس میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنی اس کوشش میں دوسرے گرواں بھی ہیں اور کامیاب بھی۔

احتشام حسین کے کچھ فکر سے تعلق رکھنے والے ان ہم جدید ترقی پسند نظریوں کے علاوہ بہت سے دوسرے اور بظاہر احتشام حسین سے متاثر نظر آتے ہیں ان میں سے کچھ احتشام حسین کے براہ راست شاگرد ہیں، کچھ سے احتشام حسین کے تنقیدی نگارشات کا مطالعہ کر کے تاثرات قبول کئے ہیں اور ایک گروہ ایسا بھی ہے جس سے احتشام حسین سے حقیقی اثرات قبول کئے ہیں اور یہ گروہ احتشام حسین کے نظریہ نظر سے اختلاف کرتا نظر آتا ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں ان تمام نظریوں کا مختصر تذکرہ بھی ممکن نہیں ہے، راقم الحروف کو اس کا شہرت سے محال ہے کہ وہ بہت سے ایسے جدید ترقی پسند نظریوں کا تذکرہ کر سکیں کر سکا ہے جن کا تعلق دہشتیں احتشام حسین سے ہے اور ان کا تذکرہ ضروری تھا مگر وقت کی کمی اور مختصر کے قصور کو پیش نظر رکھتے ہوئے راقم الحروف مضمون کا اختتام کر رہا ہے۔

آخر میں اتنا ضرور عرض کیا جاسکتا ہے کہ وہ تمام نئے ترقی پسند نظریوں اور عقیدوں کے گرواں کو آگے بڑھا رہے ہیں یہ تمام نظریہ احتشام حسین کے کچھ عقیدے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے ساتھ تنقیدی اصول و نظریات کو تسلیم کرتے ہوئے جدید ترقی پسند عقیدوں میں اضافے کر رہے ہیں اور اپنی نگارشات کے ذریعے اردو عہدہ کو نئے تنقیدی شعور اور رویہ سے آشنا کر رہے ہیں اور عقیدوں نگاروں کا یہ گروہاں، جو احتشام حسین سے متاثر نظر آتا ہے، یہ محبت کرتا ہے کہ احتشام حسین خود ایک کچھ عقیدہ ایک دستاویز تھے انھوں نے اردو عقیدہ کی دنیا میں پہلا گھر بنایا جو مشعل روشنی کی تھی، یہی روشنی میں سے ترقی پسند نظریہ آگے بڑھ رہے ہیں اور اس طرح دہشتیں احتشام حسین سر زمین اردو پر رنگ دیا رہے کہ احتشام حسین کے نام کو زندہ جاوید رکھتے ہوئے ہے۔

اس کا ایک ثبوت ارقام کا یہ دورہ دیکھنا بھی ہے جو احتشام حسین کے انتقال کے میں بریں بعد چھپ چکا ہے۔

پیش

۱۔ محترمہ کے لیے پیار کا اظہار ہے



سید احتشام حسین کے بعد تنقید کا فکری سفر

سید خورشید عام

وقت اور ماحول کی برساتوں سے گزر رہا تھا۔ جب ہم عہدہ عہد کی سیاسی ماحول میں، معاشی اور عمرانی ترقی پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ آگاہی گھر کے لیے نشان دہن جاتی ہے کہ وہاں یا عہد میں کسی عظیم ترقی کی منزل میں آئی، مظاہر حیات و کامیابیات ہر آن بدلتی ہوئی تھیں اور چاہیوں کو آہستہ قدری کے عمل سے گزرا رہا ہے۔ ترقی کے اسی تغیرات کے خارجی عوامل اور اندرون دہلی، مسکن میں رہا ہوئے وہی پہلے ہی وہی دہلی کی کوششوں خواہشوں اور کوششوں میں متغیر ہو کر تبدیل و رہا کی ترقی آہستہ آہستہ ہوئے وہی میراث اور ترقی کے لیے میراث کی وہی درہمیت ہوئی ہے جس کی صورت میں آئے وقت اور عہدوں کو سمجھ رہی ہے۔

ایسی ہی ایک میراث کی تھی ہمارے اوس کو سید احتشام حسین صاحب کی اعلیٰ صفت ذات میں ہے۔ اپنی مشاغل و اساتذہ کی ابتدا عظیم آراہوں اور عمل سرئی سے ہوئے تھے کہ اس سید ان میں اپنے خیر و کھائے تھی، جس میں سید احمد علی کی اصلاحی اور اساتذہ کی اساتذہ کی ملک گیر تحریکوں کی بساط چھی ہوئی تھی اور اساتذہ و تنظیم کے علاوہ تحالف کے چرچے ہو رہے تھے۔ محمد حسین

آزادی کی آہ مہیات، حالی کے ملامت شعرو شاعری اور شیل کے شعر، نظم کے ابتدائی نکتے ناقدان شعور
اظہار کے لئے مانچوں کے پے سر گراں تھے

سید احتشام حسین صاحب نے حالی کی سماجی افادیت کے پیلوں کو تراش کر غلوں کو اور
گمراہ کرتے ہوئے ادب و شاعری کی ایسی حذلوں اور حوصلوں کو صبر و صبر میں ایک آنہ گلہ کے طور پر
عمل کے لئے جات کے امکانات کو اسعت دے کر باطنی گفتگو سے مرصع کرتے ہوئے۔۔۔ آزادی و
حقیقی مہورت اور عقلانی اور فنی کی کشمکش معاشرتی و معاشی ناہمواری کے خاتمے کے لہجہ انہیں
تک لے گئے

یہ بات قسیم کی مکی ہے کہ احتشام صاحب سید امجد علی دہلوی سیاست کی طرف کم از کم
ایک جدائی جھکا رہتے تھے ان کی طبیعت میں متانت و سنجیدگی کے ساتھ یہاں تک کہ دیکھو
روادری اور انگریزی، انسان اور انسانیت کے احترام کا ایسا رویہ تھا کہ جس سے ان کی شخصیت کو اور
زیادہ قد آور بنا رہا ہے

احتشام صاحب کی وقت کے وقت سرور، صفت عروت پر تھی، اس سے چند برس پہلے مرید
دوسرے مصطفیٰ قطاب کے مراحل کا پیلی سے ملے رہ چکا تھا، نئی آج کلان۔۔۔ کی کے مظاہر، کوہ پالی
ورینٹ نالی تنگوں کے اندھا دکھانے کو دنا دیکھ رہی تھی یہ یہ کہ جتنا ہے کہ عالمی ادب
میں اس طرحی تحریرات اور مختلف نظریات کی بازگشت ہم تک پہنچ چکی تھی

احتشام صاحب نے اس کی علوم کے تمام مالی و عقلی پسواں کا علمی کتب یا اس جگہ کہ
ان کی قدم سے اس کی عیت مزاج نظریات کے حلقہ Aggressive سے وہ ہم آہنگی پر
ناعت۔۔۔ وہ حالی دیتی ہے لیکن اس کے باوجود اس کی بات و آواز یہاں تک کہ
یہ محسوس ہے کہ اس میں اصل کر تخلیقی تنقید کو اس منصب پر۔۔۔ اس سے حد تک ممکن
میں تھی

وہ ہمارے لیے تصنیفات اور مقالات و مضامین کا خزانہ ہے، ان میں موجود ہے ۱۹۶۷ء
میں جدید ادبی شاعری سے ایک سچا و سچا شکر کرتے ہوئے ان سے محاسن کے چند تقابلات
ہمارے ہمیشہ نظر رہا ہے، جن سے احتشام صاحب کے فکری تقویت و نظریاتی پسنداری اور اس
Approach کا رنگا رنگ ہو سکتا ہے جو فنی یا جدید شاعری پر ان کی گہری عالمانہ نظر کی عبادی رہا ہے
”فنی شاعری سے میں تو عام طور پر وہ شاعری مراد لیتا ہوں جو کہ شے و بچس بھیجی میں

کی گئی ہے اس کے مختلف باب، مختلف صنفیں، مختلف موضوعات اور
 ادیب مواد کے مختلف مرکب ہیں نئے کاغذ وقت کے مضمون میں تبدل کیا جائے
 تو اس وقت کے سخی شاعر نے جس صنف میں تفصیل سے گفتگو کریں گا تو ان
 میں مختلف صنفوں پر تقریر کرنا ضروری لگوں گا۔ مثلاً جس صنف میں فرق اور جوش
 کو رکھوں گا اس میں بھلا اور سردار، عصری کو کس رکھوں گا ؟

دور آگے چل کر، احتشام صاحب نے ہمیں بتایا ہے کہ ان شعر میں ۔ صرف عمروں میں
 فرق ہے مگر ان کے طرز فکر اور طرز احساس بھی مختلف ہیں بھلا اور سردار کے انداز اور اسلوب کے فرق
 کو مابین کرتے ہوئے ان کے شعور کی سطح اور اس کے تصور فن پر نظر رکھنا ضروری ہے اس کے علاوہ
 سردار حلقوں حسوں سے پرورے انداز، نظمیں نظمیں تھیں، ایک خواب اور سردار سے آگے کرے گی
 کوشش کا بھی ملنا کہ ہے

احتشام صاحب اسی حوالے سے ہم پر یہ بھی ظاہر کر رہے ہیں کہ

”پھر میرے سامنے دو شعراء تھیں گے جو جدید تریں۔ ان میں سب یکساں نہیں
 ہیں۔ ہم خیال اور ہم رنگ نہیں ہیں، مقصد شاعری کے متعلق متفق نہیں ہیں ان
 میں باہمی کی طرف، پیچھے والے بھی ہیں، مستقبل کی سیر پر جیسے بھی، علم کوش
 بھی ہیں، آہنگ مثلاً سے معذور بھی، ترقی پسند بھی ہیں اور غیر ترقی پسند بھی“

یہ تجزیہ دلچسپ عقیدے کے روشن تحریرات کے شعوری مسدود رک سے ہی پیدا ہو سکتی ہے
 حالِ معاشی عدم مساوات، سیاق و سباق اور استحصال سے پیدا ہوئے والی کشمکش کا شعور رکھتے ہیں لیکن
 انہوں احتشام حسین صاحب کی دانگ میں جو عمل حیات اور شعور دار قہ کے منکر میں ’اپے
 تحریر کے ایک حصے میں احتشام صاحب شعرا کے تحریرات کی برتری کو انفرادی، شخصی اور مخصوص کہتے
 ہوئے لکھتے ہیں:

”لیکن بہر کی دیا سے شاعر کا جو رشتہ ہے اس کی طرف اس کا رویہ اس کے شعور،
 مطالعے، مشاہدے اور بصیرت حیات، صبا میں اور دائرہ فکر و عمل سے متعلق ہوگا۔

ان ہی مسائل پر نظر کرتے ہوئے احتشام صاحب نے ایسی باتیں کہی ہیں جو ہماری عصری
 تاریخ کے علاوہ عدم موجود پر پوری جستی سے متعلق ہو رہی ہیں۔ کہ اگر کچھ دن پہلے محنت، غم
 زندگی، احساسِ مس، غلم اور نا انصافی سے سرت، غلامی پر آلودگی کی ترجیح، موت کے مقابل میں

زندگی کی خواہش، نیکی، دردمندی، انسانیت اور حق کے تصورات قاعری کا موضوع بن گئے تھے تو آج
کیوں نہیں بن گئے، کون سی گتھیں ہیں جو مل ہو گئی ہیں

ابن التحسات میں ۱۹۹۰ء تک کے عہدی روپے کھینچ آئے ہیں۔ اس کے بیس سال بعد
ہمیں کچھ نئے تاریخی مسائل ملے ہیں، اور اگلی نسل کی باتیں دہی نے ادب میں نئی نئی تحریکات کے
جہم بیسے کے بعد Polarisation اور قطب کے آثار نمایاں ہوئے ہیں

یہاں تک تو سب متفق ہیں کہ سید احتشام حسین کے عہدی ایجن اور رویوں میں نکتہ
پہنچن فخر سے ہادی اور قطبی بات گیری کے کمالات کا دخل نہیں ہوگا، وہ ہی محوں نے درسیاتی، بازاری اور
ہائیے نکتہ پر تنقید کا سہرا بیا ہے جس کا ان کے عہد میں ہر حال فقدان میں تھا۔ تحلیل علمی کی سامی
میدوں کو اپنی مجربات میں ایک غلبہ صحران کر اس کے غیر مناسب استعمال کی ترجیحات کا کوئی
دکر۔ ہوئے کے برابر ہے اس لیے اپنی تعلیمات کی قدر کے اندر سے لکھے میں ایک ہی مصد
الحدود تنقید کو غلط تارخ کی طرف لے جانے کا

عہد حاضر کی دہی اور تنقیدی فکر میں کچھ بیرونی اثرات علوم کے طیر معیوں، مھیلاؤں اور
آگے میں حالانکہ اسلوبیات ہو یا سلیت اور ساختیات کی باتیں ہوں وہ اپنی وجہیت کے اعتبار سے نئی
میں ہیں مگر ان کو اپنی علامت میں کو جو کہ ایک مبسوط تنقیدی قدر کا نام ہے جسے کے بعد یہ بھی کہا
جاسکتا ہے کہ یہ اپنی تنقید کا اندس میں اور یہ کہ اسلوبیات کا کام اس استعداد کہ وہ سلی امتیازات کی حتی
طور پر مشدد ہی رہے۔ اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ جیسے انسانی اذیت و توجہ کے بعد مشتر حالت
میں Fixation کے عملیات میں لاکر اس کی جے اندر قوت کا مظہر دیکھا جاتے۔ اس صراحت کی دہی تنقید کو
قدر و نظر کے مرد و طریقہ کار کا دل بھی ٹھرا یا پس جاتا

تیس ہم محسوس کرنے میں حق بجانب ہو گئے کہ تنقید کو اپنے کائنات اور مضمر سطحوں
کی طرف لے جانے کی ترغیب ہے جس سے ادب شاعری اور تمام ملی اصناف کو انسانی اقدار سے
محروم De humanize کر دے گئے علاوہ شاعر و نویس کو اس کے پڑھنے والوں سے الگ کر دے گا
نکمل باطل رہا ہے۔

سید احتشام حسین صاحب کے تاریخی عہد کو گرسے ہوئے ہیں، انہیں سال کا ہی عرصہ
ہو ہے اور اس مدت میں ظاہر انکی یاد ملی خصوصیات کے قضاے مدے ہیں، بیرونی اثرات کی بظاہر
میں نے انسانی رواج اور Communication Explosion یا عالمی دھماکا میزنی نے چھوئے

حالات انوکھے اسلوب اور ونیز اصطلاحات کے رائج قلمی اور غیر قلمی سے ہم تک پہنچے گئے ہیں۔ ان ہی تازہ میلالت و علائم میں سے ایک پوسٹ مڈرنزم Post Modernism یا مجدد جدیدیت (جدیدیت کو میں صرف Post Modernism کی اصطلاح کے بدل میں لایا ہوں) مجدد جدیدیت نے ادب و شاعری کو معر ساری محمولیت، غفرانہ اور اہمیت کے حصار کی طرف رجعت کی ترفیب والی ہے۔ اس محرک کے اثرات کتنے تعلق گیر ہیں یا اہم اصوات پر ان کا غلبہ کتنا وسیع ہے اس کے اندازے آپ اسلوب بستر طود پر لگا سکتے ہیں مگر یہ بات بر حال بقی ہے کہ فن اور ادب کو انسان اور اس کی زندگی سے الگ کر کے دیکھا جائے شری اور نظیر کسیے کو شش سے کم نہیں۔

آج ہم تاریخ فکلی اور نظریاتی شکست کے ناش بین بن گئے ہیں مگر ارتقائی عمل ٹوٹ۔ بحوث کے بعد کسی ماننے سے ہلے دھول میں ٹھہر کر ایک لمحہ کے لیے رک کر، بحر جہاد ہو کر اپنی مضبوطی سے آگے مٹی بڑھ جاتا ہے اور سید احتشام حسین کا یہ کہنا ہمیں بھرپور آتا ہے کہ

”اگر کچھ دن پہلے محبت، علم زندگی، احساس حسن، قلم اور تامل سے

نظرت، نکلای پر آراؤ کی کو ترجیح، صوت کے مقابلے میں زندگی کی خواہش، نیکی،

ورد معدی اور انسان دوستی کے تصورات شاعری، افسانہ، ناول اور تمام ادبیات کا موضوع

بن سکتے تھے تو آج کیوں نہیں بن سکتے، کوئی تمہیں میں جو حل ہو گئی ہیں یا جن کے

حلق سوچنا، جن کی لشریت کو محسوس کرنا پھر میں پر غل چلتا ہے“

اس اصول کی معدت کے بعد یہ کیا سب ہوگا کہ حدود و موصوات جن کا تعلق انسانی ظن اور نئے ادبی و سیاسی مضمرات سے ہے جو گزشتہ پانچ چھ برسوں میں اصرار کرنا سنئے آئے اور آ رہے ہیں وہ بعد تو یہ طلب ہیں سید احتشام حسین نے حقیقی سائنس اور علامہ جلی پر چھوڑے تھے وہیں سے انھیں آگے بڑھانے کا کام ہمارے ادب کے کئی نامور فنکاروں نے سنبھالا ہے اور مختلف قوی مدیوں اور حیثیت کی مطابقت سے اپنے تحقیقی عمل میں دھولے کے بعد انھیں جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ نظریاتی میدانوں کی جو گراں سرو ڈالنے کے بجائے ان کا معروضی جائزہ لیا جائے گا اور ان کی تفصیلات میں جانے کے لیے یہ وقت موزوں نہیں ہے اس لیے اشارے کر دیا جائے گا۔

جی تو رہے نہ ہوں اور نہ تیرا
روئے ہو جی مٹاؤں شرِ ظہریٰ اٹھکے اور
اکھٹے ہو کر بنائی تھوڑی عالم میں
بہارِ لہری کا شہرِ بہت حاصل کدہ ہے۔

مستحقِ اور سے یاد کی جائے وہی
اور دلالت ہے سنگی ست سے آگاہی ہے
ہر سال ہستی و جدیچہ طالت سے "کوش
میں نہ وہ جس کو کہا ہے

دُورِ حِ افرا
ہم مدد
اسمِ محمد

احتشام حسین کا تصور ادب و نقد

ڈاکٹر سلیم اختر

"تجید نگاری سے میر مقصد ادب کی حقیقت اور ہیئت پر غور کرنا تھا اور ادب کو اس کی تخلیقی کوش پر اٹھو کو اس کے صحیح شعور اور اور ک پر دو جوتا اور ادب کو زندگی کے سدھی رشتے میں دیکھنا ہے اس مسئلے میں تاریخ ادب کے بعض پہلو بھی واضح ہو جاتے ہیں اور ہم ہر ادب کے بدلے میں بعض خیالات کا اظہار بھی اس طریق ہو جاتا ہے کہ تجید و مقلد کر کے اسے اس سے متاثر بھی ہوں لیکن میری یہ دانش محدود ہے کہ اگر میرے تجیدی خیالات مدلل اور مفید مظلوم ہوں تو میرے عہد کے ادب ان پر نگاہ رکھیں، میں بے حالات کو صحیح سمجھتا ہوں ان سے متاثر کرنا ہوں لیکن میرا یہ اصرار ہے کہ آپ بھی یہی طریق انھیں صحیح مانیں جیسے میں مانتا ہوں" احتشام حسین

۱ "ادب لطیف کے مدد کے سوالات اور احتشام حسین کے جوابات" بشور "مقدمہ" (تصنیف احتشام حسین میر ۱۹۷۷ء)

۱۹۸۳ء میں مولانا حالی کے دیوان کے ساتھ دو مفصل مقدمہ شائع ہوا جو بعد میں "مقدمہ شعر و شاعری" کے نام سے جدا گانہ کتاب کی صورت میں چھپا دیا اور اب جسے جدید تجید کا نقطہ آغاز مانا جاتا ہے اور اب ۱۹۹۲ء میں جب میں احتشام حسین کی تجید نگاری پر مضمون رقم کر کے لگا تو اچانک

احساس ہوا کہ اردو تنقید کی عمر تو سو سال ہو گئی ہے۔ ہر چند کہ غزل اور بعض دیگر صنف کے مقابلے میں ایک صدی کوئی بہت زیادہ محسوس ہو لیکن یہ بھی ہے کہ ایک صدی کے بعد تو تنقید کو ادب کی اہم شیزہ بھی نہیں قرار دیا جاسکتا کہ جو آئے پھیلے بھاڑ کرے۔

تنقید کی ایک صدی میں خاص کام ہوا ہے، قابل توجہ بھی اور ناقابل توجہ بھی، صد ساز بھی وہ گمراہ کن بھی۔ اس دوران میں نظریہ سازی بلکہ دیکھن سازی بھی ہوئی اور ان کے خلاف رد عمل کے طور پر رہا ہوئے اردو تنقید کی صدی میں بے شمار نئی نمایاں ہونے والی چیزیں تھیں جن کا تذکرہ کیے بغیر ادب کی ہی نہیں ترقی و ترویج بھی ناممکن رہے گی

اختتام حسین نے قائم مدحتی کے نام ایک خط میں اپنے اپنی سفر کے آغاز کے بارے میں کچھ لکھا ہے۔



ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کی تصویر

”میں نے لکھا تو ۱۹۴۲ء میں شائع کیا تھا لیکن میرے پہلا شمارہ ”نگار“ لکھنؤ میں ۱۹۴۱ء میں، مزاحیہ مضمون ”سچی لکھنؤ لا شوکت تھاوی کا پرتھو ۱۹۳۱ء میں اور سیاہی مضمون ”سرگاز“ لکھنؤ ۱۹۳۸ء میں چھپا ان دونوں میں اپنی ”اے کالہ“ ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ میں طالب علم تھا۔ جلی تک یاد ہے شکر کہ ۱۹۳۸ء میں شائع کیا تھا، اس وقت ۲۴ علم گزشتہ میں تھا اور آٹھویں درجے کا طالب علم۔“

لیکن جب تنقید کی سب سے زیادہ دلچسپی کی جانب متوجہ ہوئے تو بہت جلد اہل نظر کو اپنی جانب متوجہ کر دیا اور حیدر علی اہم ترقی پسند ناقدین میں شمار ہونے لگے۔ اگر حیدر علی چائلز پریرا کرے

کے لیے تعلیم کی اور کچھ میں تعلیم دے کر ان کے لیے شرعی ضرورت ہے تو ہر ایسی سب کے بارے میں
کی حیثیت سے "عبد طبع" فطری بھی ضرورت ہے۔ یوں دیکھیں تو عقیدہ اور عقیدہ عمل کچھ اور
تبدیلی عمل کا جزو قرار پاتا ہے اور فطری شخص ایک فرد ہے جو مادہ کر تدری شخصیت میں تبدیل ہو جاتا
ہے۔ اور ایسی ہی ایک تدری شخصیت احتشام حسین تھے جنہوں نے فطری اور فطری فطری فطری
کی بارے میں عمومی سطح سے بلند کر کے عصری تدریس کے اعتبار سے تبدیل کر دیا انہوں نے
مرمر جات (۱۹۱۳ء - یکم دسمبر ۱۹۱۴ء) کے ۴۰ برس میں سے نصف سے زائد کو بھی شعور اور سب کے
فہم کے لیے بسر کیا۔ ۱۹۳۹ء تک "فطری اور تدریسی فطری" اور "تغیر آئینہ آبدی اور عوام"
جیسے مقالات سہا قلم کر چکے تھے۔ وہیں مقالات اس کے اولین تدریسی مجموعے تدریسی جائزے (۱۹۳۳ء)
میں شامل ہیں یوں دیکھیں تو احتشام حسین ان باتوں میں شمولیت جانتے ہیں جنہوں نے انہیں
تدریسی مضمین کی (۱۹۳۹ء) کے بعد تاریخ کی تدریسی تدریس کو صرف تسلیم کیا بلکہ اور کے اس سے
مگر تو کیا تصور کو تدریسی تدریس میں چھاننے کی بھی کوشش کی چنانچہ "تدریسی جائزے" کی لطافت
اول کے وہ سب سے میں جس نقشہ نظر کا اظہار کیا تھا، اشاعت علی ۱۹۴۹ء کے موقع پر اپنے تدریسی
موقف کا ان اشاعت میں اظہار کیا۔

"۔ وقت کے ساتھ ساتھ میرا یہ خیال بڑھتا جاتا رہا ہے کہ اصل
اور اور اصلی تدریس کی پہلی سب سے کہ اس سے زندگی کے حسن اور انسانی کو سمجھنے اور
اسے اچھلنے میں مدد ملتی ہے اس طرح عوام کا رشتہ عوامی جدوجہد کرنے طاقتوں والی
سے مضبوط ہوتا ہے۔ زندگی اور اور کو سمجھنا ہے اور اور زندگی کو سہارا دے کر اس کے
بڑھاتا ہے۔ اچھے اور کے مطالعے سے انسان کا سماجی شعور بڑھتا ہے اور وہ سماج کو
بہتر بنانے اور فطرت کو اپنے فطری لائے کا اہل ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی اپنی فکر سے
کام چھوڑا نہیں کرتا، اس میں مدد سے دیکھ کر صرف ان لوگوں کی نگاہ میں اور ہو گا جو
زندگی کو بہتر بنانے کے معنی میں ہیں۔"

اگرچہ احتشام حسین کو ہمیشہ سے ہر کسی فطری سمجھا جاتا رہا ہے مگر وہ ہر کسی کے تصورات
تک براہ راست نہیں بلکہ مختلف گروہ و مراحل طے کر کے پہنچے جیسا کہ قائم مدحتی کے نام کتاب میں
انہوں سے خود بھی اس کی وضاحت کی ہے۔
"مغربی فطریوں میں میں سے کسی کو اپنا فطری بنانے کی کوشش نہیں کی

مٹا کر ایک سے جو ہوں غدیوں کو کہ بعض اوقات متعدد قسم کے لوگوں سے
مجھے رست ہی بائیں بیٹھ کر ملنے کی پسند آئیں، بعض اہلیت اور رچ بس کی اور بعض
سرور رینڈ کی، پھر ہر قسم سے معاشرہ ہوے کیونکہ ہر کسی نگاہوں سے زیادہ نکندہ
ظاہر کیا۔ کسی کی بیرونی نہیں کی۔"

(المرحومہ لکھنؤ احتشام حسین مسرہ ص ۱۱۱۹)

پس جب ایک مرحوم احتشام حسین کے، سیت پر مبنی عقیدتی اصولوں کو اپنا ہوتا تھا
اور جس سے عرفہ کیا۔ ایسے بھی ۱۹۳۱ء کے بعد قطعی ادب جس سے تصورات کی صورت میں
میں میں رات آشنا ہوا اور وہی، نشر کی، اثراتی اور حالیاتی سبب حد کی خوشنود ہواں اور
عقیدہ کی مثبت جیسے خوب ان تو مصلیٰ عقیدہ کے مقابلے میں ہر کسی اند، وقت کے جس طرح تاریخ
تجدید فکر اور معاشرہ کی مدلی تعبیر کرتے ہوئے ادب، شاعری اور عقیدہ پر مرکب اثرات ڈالے وہ
ب تاریخ ادب کا حصہ ہیں، انسا پسندی کی پیدا کردہ غامضی اور نظریے کے معنی اور متوازن
اطلاق کی خصوصیت میت!

بحیثیت مجموعی احتشام حسین کے عقیدتی سرسائے اور بے ثباتی، راجا روپین، ہی مات
نظر آتی ہے۔ وہ نظریہ ساز نظر آتے ہیں (ہمت کم ہوتے ہیں) ایسے حوالہ طلب کی تشریح خروج
اور ہر اطلاق کا قطعی ہے تو ہر احتشام حسین مفرد حیثیت کے حامل نظر آتے ہیں

کسی مخصوص دور حیات کے علمی نظریے یا فلسفے کے راجا اثر عقیدہ راجا بد وقت آئیں
میں ہے اور مشکل بھی آئیں اس سے کہ سوچ اور پرکھ کے ہے جانا یا کچھ مل جاتا ہے اور مشکل
اس کا پیر نہ سوچ اور پرکھ کا ہے جانا یا کچھ راویہ نگار کو محدود کر کے پانچ نصیحت سے باعث نگار کو
ذریعہ سکھ (مسیبنا) کا رہا ہے جس کے نتیجے میں وہ فرسائے کے "قدس" کی حاضر نوہیں ملے گردوں
کو مستر، راجا ہے ترقی پسندی کے ابتدائی ایام میں بھی یہی کچھ ہو جاتا ہے کہ طالب اور اہل
مشہور فرما رہے تھے جانا نظریے کے اطلاق کی جدوجہد میں مصروف و انشور و شائد ایسا ہی
تشدد دانہ رہے پٹا پر آتا ہو کہ جب جنگ و جدل کا رجحان قوی تر ہوتا ہے لیکن سائنس کے یہ ایسی خستہ
پسندی ضروری ہیں ہوتی تھے ذاتی طور پر احتشام حسین کی بھی حوی ممکن ہے کہ انہوں سے ہر کسی
تصور نقد سے ہر ہر کا پیراں دنا تو ہر حاکم خود کو اس کا واحد دل بھی نہ جانا جس کا ایک باعث تو اس کا
دعایہ مطالعہ بھی ہو سکتا ہے لیکن میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ یہ اس کی ملی متوازن شخصیت اور وضع

دار۔ نو کے باعث ممکن ہو گا ان کی شخصیت میں جو تبدیلی رچا ہوا تھا اس نے ان کے انداز فکر جن تبدیلی دہائیوں کی تشکیل کی اور اسلوب فکر کو محتاج کی پیدا کردہ معنویت پر اسوار کروا شاید بھی وجہ ہے کہ اس نے حد فزاعہ تحریر کے موقف کے علمبردار ہونے کے بخود اعتراف حسین، حکیم الدین حمد، حسن عسکری اور حکیم حمد کی بلکہ فزاعہ فطرت بن سکے اور یہ بھی اتفاق ہے کہ جیوں ساتھی ہر کسی سبب فکر کے حامل نہ تھے۔

اعتقاد حسین نے اپنے مخصوص تصور ادب یعنی ادب کی مادی تصویر کی جب بات کی اور ہوں نے مختلف مقامات میں مادی علامہ فرمائی ہے۔ تو اسے محض معروضات دینے کے برعکس زندگی کو متحرک اور مطلق کر دینے والے حوالہ اور سراج کا انداز طے کرے والے محرکات کو پیش نظر رکھ کر بات کی۔ یہ تصور جو اپنی نظریاتی صورت میں حاضر ہوتا ہے، اعتقاد حسین کے سبب اسلوب میں بھی مختلف اہمیت سمیت تحریر سامنے آتا ہے۔ یہ تصور اس بات پر موقوف ہے اتنا کہ اس پر ان کی تنقیدی فکر کی اساس اسوار بھی ہے اور اس سے پائیداری اور استحکام بھی حاصل کرتی ہے۔

اعتقاد حسین کے مختلف مقامات سے بخود اقبالیات پیش ہیں، ان کے مطالعہ سے یہ انداز لگایا جا سکتا ہے کہ اعتقاد حسین کیسے اس تصور کی توضیح کرتے ہیں، کیسے اطلاق کرتے ہیں اور اسے نکلتی اہمیت دیتے ہیں۔

”زندگی کی جاری رہنما خیالات پیدا کرتی ہیں۔ اثر لہجی، اپنی رائے سے فلسفے، مذہب، اخلاق اور تمدن کے دوسرے مظاہر کو جنم دیتی ہوئی چلتی ہے۔ اس کے سانچوں میں دھاتی، مٹی، سوختوں میں مایاں کرتی، مٹی، شکلوں میں تشکیل دیتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ لیکن دونوں کا تعلق کسی ایسی یکساں اور ہم آہنگی میں ہوتا ہے کہ کسی حسیہ اصول سے ان تعمیرات کے تمام گوشوں کو لے کر تھپ کیا جائے یا ان کی توضیح و تشریح میں تمام تفصیلات کا جا رہا جائے“ (ادب میں طرکی جگہ)

”دریغ پیدا، راز اور اسلمی شعور کے عمل اور رد عمل سے زندگی آگے بڑھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف ممالک مختلف سماجی اور سماجی مسئلہ پر ہوتے ہیں اور ان کے فلسفے، زندگی اور تمدن شعور کی منزلیں بھی کم و بیش اس سے متاثر ہو سکتی ہیں۔“ (غائب کا فکرم)

”لوہا کا شعور مادی حالات اور سماجی ماحول میں مسلسل عمل اور رد عمل سے

تکلیف پہا ہے کسی کے پاس بجا یا شعور نہیں ہوتا نکلے مٹا ہے اور حالات بد میں تو بدل بھی جاتا ہے انسان انہوں کو بدلتا ہے اور اسی کے بدلے میں خود بھی بدل جاتا ہے۔ اسی طرح فرد کے شعور کے مطالعے میں سماج کے بدلتے ہوئے مادی حالات کا مطالعہ یک جزو لازم کی حیثیت سے شامل ہو جاتا ہے۔ عمل اور رد عمل کا یہی سلسلہ ہے جس کے نظر انداز ہو جانے سے فرد کا شعور گرفت میں میں آتا "حان کا سیاسی شعور" (۱)

"ادب، فلسفے والے کے شعور اور خیالات کا دوا اظہار ہے جسے "سماج کے دوسرے افراد تک پہنچانے کے لیے وسیع وسیع سے مایاں کرتا ہے جسے وہ سمجھ لکھیں اور اس سے مطلب حاصل کر لیں یا کم سے کم سمجھنے کی کوشش کر لیں اگر من اور ادب کی یہ نوعیت نہ ہوتی تو اس سے محض وہ فہم بردار یا پانی جو شکر کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے اور سماجی فہم کا حصول میں رہتا تو ہر تنقید کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوگا (تنقید نظریہ اور عمل)

"من تنقید کی حیاد تدریجی مفاہق پر جسے نہات کچھ رہی غیر مادی معلوم ہوتی ہے لیکن اس کے سوا چارہ بھی نہیں ہے کہ تنقید کو تدریج کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے جس کی مدد سے زیادہ سے زیادہ انسان ادب سے مطلب اندوز بھی ہو لکھیں اس کی حقیقت کو بھی سمجھ لکھیں اور سے انسان مطالعہ کے نام میں بھی آئیں (۱ اصول تنقید)

ان تصانیف پر مستزاد مقالہ "ادب کا مادی تصور" ۱۱۱ "ادب اور شعور" ان سب کے مطالعہ سے اگر ایک طرف ادب اور نقد در ثنوں لطیفہ کی مادی حیاد جابر دلی میں تو دوسری جانب خود احتساب میں کے تصور نقد کی مادی حیاد بھی واضح ہو جاتی ہے

ترقی پسند ادب کی تحریک کی مانند شعور تکمیل نہا کہ کے ہے مادی سلاطہ نقد اور اس سے وابستہ مخصوص تصور ادب یعنی ادب برائے ادب کی ادب: ادب عام و ادب خاص مقصد و غیرہ پر مہمان تنقید اور مطالعہ نہکتہ چینی کی کمی نہیں مگر میں ان راہی امور سے صرف نظر کر کے خود کو محض اشتیاق میں کی تنقید نگاری تک ہی محدود رکھتا ہوں ویسے بھی ان مسائل و موضوعات کے ذمے سے مواظف اور مفاہق و مائل کی کمی نہیں اس لیے اب مباحثاتی بات کما ممکن میں رہا۔ بعض اوقات

احتشام حسین کے ہاں ایک خاص طرح کا سعادت تو بلاشبہ انداز بھی نظر آتا ہے۔ اس میں اس امر کا شدت سے احساس تھا کہ یہ تنقید یا اور کسی موضوع پر کوئی مستقل کتاب لکھ سکے چنانچہ انہوں نے بعض کتابوں کے دیباچوں میں بطور خاص اس کا ذکر بھی کیا ہے مثلاً "تنقید اور ملی تنقید" (۱۹۵۲) میں لکھتے ہیں۔

"ادب اور تنقید پر موقوف اور مفصل کتاب لکھنے کے بجائے محض مختصر اور طویل مضامین لکھتے رہنا چاہیے دیکھتے ہی اہم کہیں نہ ہوں۔ کسی مستقل ملی کتاب کے کی حیثیت نہیں رکھتا۔"

عین ریں خود "ذوق ادب اور شعور" (۱۹۵۵) کے دیباچے میں بھی اسی خیال کا اعلاویہ

"بہرہ یہ خیال خاطر کر رہوں کہ ایسے مختصر مضامین تنقید پر موقوف تعریف کا حق میں قرار دینے جائز ہے تو صرف مسائل کو چھیڑتے اور ذوق کی تشنگی بھگاتے ہیں۔"

"مسائل کو چھیڑنا اور ذوق کی تشنگی بھگانا" ذات خود مست برحق بات ہے اور یہی مشکل کام احتشام حسین نے یہ طریق احسن رکھا۔ یہی میں جگہ ادب اور تنقید پر مشتمل ایسی موقوف اور مفصل کتابوں کی کمی تھی جن کا اسلوب عام مواد نہیں پایا۔ اعلیٰ سے گرا ذوق ہے احتشام حسین نے بھی حق ایسی ہی کتابوں پر گراں کی ہے کہ اس کا مطلب یہ کہ احتشام حسین کے مقالات اور مختصر مضامین میں جو تکنیک طرز میں ملتی ہیں وہ اپنے اعتقاد و احوال کے باوجود مست کچھ بھگاتی ہیں مثلاً مقالہ "تنقید ماس بیس کی طرف ناگزیر ہے" جو ستمبر ۱۹۶۶ء کے "بلو" میں احتشام حسین کی تحریر کے عرصے کی صورت میں شائع ہوا تھا اسی لحاظ سے دیکھنا ہے کہ اس میں فی میں اہمیت ہے اس مشہور قول "تنقید ماس بیس ہی کی طرح ناگزیر ہے" کے حوالے سے جن صاحبہم الدین احمد کی بعض آراء کے خلاف مدلل کا اظہار کیا ہوں جو تنقید کے مددے میں بھی دیکھنا ہوتا ہے، مثلاً ان کے قول

"انسان کے فطری و قہر کر کے کے ذوق کو عمومی حیثیت سے فطری تسلیم کر دیا جائے جسے اور بہت سی فطری ملا جلتیں ہوں ہیں لیکن اس ذوق کے شعوری اور علی رفتار کی تنقید کو نظر انداز کیا جائے اگر سے ساس کی طرح فطری یا ناگزیر

ثبوت کرے گی کوشش کی جائے گی تو ثبوت و حریف نتائج پر آمہ ہوں گے۔ حکیم
الدریہ یہ تو صحیح کہتے ہیں کہ عقیدہ کے اصول ہوئے چاہیں لیکن ان اصولوں میں وہ
باس کے توازن، تسلسل اور آہنگ کی جو قطعیت چاہتے ہیں وہ شاید ممکن نہیں ہے
چنانچہ ان کے خیالات حور طلب ہوئے کے باوجود محسوس محسوس اور مثالی نظر آتے
ہیں۔

عقائد محسوس ایک مخصوص نظریہ کی حامل تحریک سے وابستہ تھے، اسی لیے وہ بھی اس
کے محسوس و فحش میں بر کے شریک تھے۔ وہ اس لحاظ سے نظریاتی عقائد تھے کہ وہ کسی تصور ادب و نقد کے
حالی تھے نہ کسی تصور سے۔ بہت زیادتی مباحث سے محفوظ تھے۔ ان پر اعتراضات بھی ہوئے اور حور
انہوں نے بھی وہ سبوں پر گرفت کی مگر کبھی بھی شائستگی اور حد تک کا احساس ہاتھ سے۔ چھوڑا قلم
کو بھی دشنام کی سطح تک نہ لائے اور ہر حال میں لفظ کی حرمت کو ملحوظ رکھا۔ وہ مصحت پسند تھے جو
تصور ریت اپنایا اس سے عمر بھر بھاہ یا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک تحریف سے وابستگی کے باوجود
بھی حور کو کوہی قصصات سے تورو۔ کیا ان کی عقیدہ کے قاریوں ان کی سبکی اصول یعنی ہے کہ وہ
ستادہال پر مبنی عالمانہ التفطی سے بات کرتے ہیں اور یہ سب کی بے ممکن ہو گا کہ اعتقاد محسوس
کے لغو

"نقد کا کام تحریف میں، تنظیم و تربیت، انتخاب اور تعبیر ہے۔"

تقلیدی نظریات " ص ۲۸

اور یہی وہاں اعتقاد محسوس کی تقلید میں بھی نظر آتے ہیں

راولپنڈی

مکہ دارالحکومت

P 059 E

سید پور روڈ

راولپنڈی

ارتقاء و دستیاب ہے

احتشام سین کے اثرات ترقی پسند تحریک اور ادب پر

عتیق احمد

موضوعہ نظر کے حوالے اور حدود کے تعلق سے جو سوال یا راستہ دہن میں ابھرنا ہے وہ بہت مختصر الفاظ میں ادبی تنقید کے دائرہ کار اثرات اور بالواسطہ طور پر فنون کے مسائل کا سوال ہے۔ یا پھر کہہ لیجئے کہ تنقید کے رویے اور نظریے کیا انفرادی اور اجتماعی تخلیقی عمل پر واقع اثر انداز ہوتے ہیں یا نہیں؟ اور اگر ہوتے ہیں تو اس کی اصل صورت کیا ہوتی ہے؟ یعنی یہ کہ تنقید تخلیق کار کو راستہ متاثر کر کے اس کے تخلیقی رویے میں کوئی تبدیلی پیدا کر سکتی ہے یا کرتی ہے؟ یا تنقید، بحیثیت عمومی ادبی فن کو مطلب کرے گا کہ وہ ادرا کرتی ہے؟ جس کے رد اثر لکھنے والے بھی اپنا تخلیقی رویہ یعنی اُپ اور نگری انداز میں تبدیلی پیدا کر لیتے ہیں؟

تنقید کے دائرہ کار اور فنون کے دائرہ کار اور تخلیقی عمل پر فنون کے رد و قبول کی کسی طویل اور مطلقہ موشگافی میں پڑے بغیر اگر ابہر اسی میں ادب کے سماجی کردار اور تنقید کا ادب کے اس کردار کے کھوٹے اور کھرے پن پر نگاہ رکھنے کی ضرورت کی بہت دہن نشین کر لی جائے تو بہت کچھ اور نفس

مطموں کے قلموں سے وعدہ ہر کہنے میں سبلی ہو گئی ہے

بی کے چیئر مین کے متعلق ہم سب ہی جانتے ہیں کہ وہ کوئی پیشہ ور یا باقاعدہ نگار نہیں
تھی تاہم ایک ہاشور، تخلیقی فنکار کی حیثیت میں وہ محی حیدر اور نقار کے ادبی اور سماجی کردار کی سیلابی
اہمیت کو سمجھتا اور اس کا خاغل تھا چنانچہ اس نے اپنے مطموں *The Middle Man in Poetry*
میں کمال کرنا کہ "نی زمانہ ادب کی انعام و تقسیم اور توجہ و تشریع کے المیہ کا بڑا مضمون ہے
ہے کہ یہ کام اب اس حضرات نے اپنے دے لے لیا ہے جو سرے سے اس کام کے اہل ہی نہیں تھے
ہم سے ہے کہ تخلیقی فن میں بچہ بچوں تک پہنچ کر رک جاتی ہے اور اس کی آگے ناک میں ہو پاتی ہے"
ترقی پسند حیدر اور بالخصوص حشام حسین کی حیدر نگاری سے پہلے کے عام تخلیقی رویے

پر نظر ڈالیں تو چیئر مین کی شکایت اور یہ ہیں کی صورت حال میں وہی قریبی مماثلت نظر آئے گی
چیئر مین سے ادب کے بچہ بچوں میں یعنی شائقین ادب کے گوداموں میں تخلیقی ادب کے وسیع ہو
جانے کی بات کہی ہے اس کا ایک مطلب یہی ہے کہ تخلیقی ادب کے سماجی مسائل کی انعام و تقسیم
شاعرین کے سرکاروں میں لہذا وہ ادبی سطح کی فنکاروں اور حسن نگاری کی فہرستوں کے قرائن
سے سکھوٹی کو جن حیدر کے مصعب سے وعدہ ہر کہنے میں ترقی پسند حیدر کے پسے کے دور
میں ہند کر دنگاری کے ضمن میں سب سے بڑا تخلیقی اصول اور گرس ایک قہرور یعنی "غندش بسیار
ہند و بیست پست تر"۔ ایسویں صدی کے آخری دس چند در سوں میں مولانا محمد حسین آزاد سے
ہند کر دنگاری کی سرحدوں کو وسعت دے کر آب حیات کی شکل میں اگرچہ ہند ادب کی تاریخ نویسی کی
اداسوار کی لیکن ان ہی کے دور سے اردو ادب میں سرسید محمد علی اور فیض احمد کی منفک عظمت
کے خلاف دہلی دہلی روایت کے نقوش ایسویں صدی کی آخری دہائیوں میں، مصرے لگے تھے وہ
آر، کے اسلوب میں رنگین مردانی، حسن، جوش ورمیال کی رحمانی ہی کی دہلی تھے اگر آپوں تو قیسے
کامیوں کے آدمی ہیں تھے اس نوع کی صرف دہلی تحریروں ان سے یادگار ہیں ایک قصص ہند اور
دوسری ایک باکسل ڈرامہ امیر لیکن ان کی خاص علمی اور ادبی تصانیف "آب حیات"، "سیرک میل"،
حند و نادر، امیر، امیر سے کسی کو اٹھا کر دیکھ لیجیے، آزاد کی رنگین و بے سے قیسے کامیوں کی
طرح ریسپ اور دہلی اور کامر قی بلایا ہے

آزاد کے اس رنگین اور دہلی، اسلوب کا نتیجہ یہ نکلا کہ آگے چل کر ٹکڑے سے ٹکڑے نگار بھی
اس طعم کی گرفت میں آگیا۔ کیا مولانا ابوالکلام آزاد اور کیا صدی الفلاکی، نیلر تھپری، سلیم پانی پتی،

سے لے کر مجھوں اور اوراق تک ایسے ست سے اہل علم میں جن کی وجہ شہرت ان کی ٹھوس علمیت ہے مگر ان کے تنقیدی رویوں اور اسلوب پر بھی روایتی بیان اور اسلوب کے سامنے گھرے ہی رہے۔ یہ بعد کی بات ہے کہ ۱۹۰۰ء کے تک بنگلہ کم از کم مجھوں کو دکھ پوری نے اپنے تنقیدی اسلوب کو خاصا جھٹل کر لیا تھا۔

اختتامِ مسین نے جس دور میں تنقید لکھنا شروع کی وہ ان کے زمانہ مابین کے مقابلے میں بین الاقوامی سطح پر علمی، نگری، سیاسی اور ادبی تبدیلیوں سے پوری طرہً آگاہی اور ہم آہنگی کا دور بن چکا تھا۔ روس کے سوشلسٹ انقلاب سے بالخصوص غیر متعمد بہت سی ترقی کی آزادی کی طویل جدوجہد کی رفتار و آہنگ کو تیز تر کر رکھا اور یوں عام ادبی، صحافتی، ادبی، ادبی کے آتشیں طغیانیوں سے گونج رہی تھی۔ ۱۹۰۰ء کے تک بنگلہ کم از کم بنگلہ کی ادبی، تخلیقی حلقے میں ہی پرستی کے علی الرغم مستقل پہلو کی جو راہ، پہلی تھی، اس کی تھوڑی سی حد تک انسانی حلقوں میں سماج تاثراتی اور رنگین دہائی کے دیباچے میر تنقیدی رویوں میں شہرہ ہونے لگے تھے۔

مولانا حالی نے جس تنقیدی رویے کی مہلہ مقدمہ شعرو شاعری میں رکھی تھی، اگرچہ وہ اندازے صدی کے ادب اور شعرا اور تنقید ماحضروں میں رد و قبول کی لہروں کے سامنے اثر میں رہی، لیکن ۱۹۰۰ء کے تک بنگلہ کم از کم حالات، نگری، تخلیق کے بدلے ہوئے انداز اور سماجی علوم کی نئی حیات کے رد اثر مولانا حالی کے تنقیدی رویے کی آہل نگری کا دور شروع ہوا اور ادب کو صریح کے پس منظر میں دیکھے اور پرکھے کے سے دھتکے نے مقدمہ شعرو شاعری میں اوجہ سے چھوڑے ہوئے کام کو آگے بڑھانے کی گمانہ مگر ہوئے گی۔

اس ضمن میں ہمیں سب سے پہلا اور پہلی کام اختر حسین رائے پوری کے اولین اور اہم ترین مضمون ”ادب اور زندگی“ مضمون ۱۹۳۵ء میں نظر آتا ہے۔ ساٹھ سال کی مدت میں علوم و نگری و نظر اور تھوڑی سی تبدیلیوں میں آئی ہوئی تبدیلیوں کے رد اثر اور ہر کسی تنقید کے بہت آگے اٹھنے ہوئے قدموں کے جب اگرچہ اختر حسین رائے پوری کے اس مضمون میں آج مت ہی باتوں میں ناہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ ابتدائی دور کے سیاسی اور سماجی حالات میں تبدیلیوں کے پیش نظر فوری اثرات کے تحت کہنے ہوئے بہت سے نتائج بھی آج نظر میں غلبہ نظر آتے ہیں، لیکن ان سب باتوں پر مقدمہ اس مضمون کی وہ نقادانہ اپنی جگہ آج تک قائم ہے جس نے ترقی پسند تنقید کو ٹھوس علمی سطح اور ہر کسی نظر سماجی انقلاب کی ٹھوس زمین پر پھیلنے کی راہ ہموار اور آسان کی۔ چنانچہ

حشام حسین کے جن دو تنہ نگاروں میں فرق انھوں، ڈاکٹر غلام حسین، آمل احمد سرور وغیرہ کے تنہ نگاریوں میں ۲۰ ۱۹۳۵ء کے دوران میں جو جدید نظریاتی ہے وہ احقر میں اسے پوری کے طور پر تنہ نگاری مفہوم کی شاعت کے نگ نگار ہی سے شروع ہوئی اس سے کہ اس دور تک آتے آتے نئی لہر نمود بھی ایک نئی زندگی کے مستقبل کے تصور کی شدید ترور کے تحت ادب اور تنہ نگاری میں لکھائی آج تک اور نظریہ کو پائے کے ہے پورے طور پر ہمارے دینی تھی

حشام حسین نے یوں تو لکھے لکھاے کا آغاز "جوں خود" ۱۹۳۲ء کے اس پاس کیا اور کہیں نائیک، نظمیں اور دوسرے موضوعات پر مضامین لکھتا ہوا ۱۹۳۵ء کی تنہ نگاری شروع ہوئی ۱۹۳۷ء میں ان کا بار کسی تنہ نگاری کا اصل دور ۱۹۳۷ء سے شروع ہوتا ہے اس ہی دور میں انھوں نے ترقی پسند مصنفین پر سے حیرت منعم چند داستان کے تمام صوبوں اور تمام زبانوں میں اپنی جزیں منصوبی سے جاپائی تھی اور ساتھ ہی ساتھ پورے برصغیر میں اس کے خلاف مہم بازی بھی رو پکڑائی تھی حشام حسین کی تنہ نگاری میں ہی ادبی اور نظریاتی ادبی کشائش کے دوران میں پورے چڑھی جوں کہ وہ ترقی پسند تحریک کے ہر اول دستے سے بھی شکست تھے اور انھیں کے ادبی نظریے اور مسلک سے کیڑ تھی اس سے ترقی پسند اور اس کی تھاکر کی حیثیت میں ترقی پسند ادب کے نظریے اور تخلیقات کے بارے میں پھیلانے جا رہے تھے لکھیوں کو دور کرنے میں ان کی ادوار میں بھی بڑی تھی

ان تمام عوامل اور حالات کی تنہ نگاری کو مد نظر رکھتے تو حشام حسین کے تنہ نگاری روپے اور تنہ نگاری کام کی نوعیت اور اس کے اثرات کو سمجھنے میں مت آسانی پیدا ہوتی ہے اس ہی کے ساتھ ساتھ دوسرا اہم نکتہ حشام حسین کے ادبی نقطہ نظر کی تشکیل میں ان کے فلسفہ حیات کو تنہ نگاری اہمیت حاصل ہے جس کے اعلان میں وہ کسی پس پردہ پیش میں کبھی نہیں پڑے اور پوری قوت کے ساتھ اس کا اعلان کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں "میں مارکسیت کو سب سے افضل فلسفہ سمجھتا ہوں اور اس ہی کی مدد سے زندگی اور ادب کو سمجھنے کی سعی کرتا ہوں میرا خیال ہے کہ تنہ نگاری خود تنہ نگاری کی راہ پر چل کر ہم اس چال کی تلاش میں کامیاب ہو سکتے ہیں جس سے زندگی کے مجدد سمجھ میں آسکیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ ادب کو سمجھنے میں ترقی پسند اور سماجی نظریے سب سے زیادہ کار آمد ثابت ہو سکتا ہے۔" حشام حسین کی نظریاتی تنہ نگاری کا مطالعہ کیجیے یا عمومی تنہ نگاری پیش نظر ہو، مزید کہ بلا حیدری اصول و نظریات دونوں جگہ برابر سے رہا اصول نظر آئیں گے۔ جبکہ کئی ایک دوسرے اہم نگاروں کے یہاں یہ صورت حال یکساں نہیں ہے۔ نظریاتی سطح پر مہوں کو تنہ نگاری کی تنہ نگاری

بست نموس، ہر کسی تکھ نظر کی حامل ہیں، لیکن عملی عقیدہ میں جنہوں نے بہرل ہو جاتے ہیں کہ خود اپنے نظریات پر معتقدات سے کوسوں دور نظر آتے ہیں۔ آل احمد سرور کی عقیدہ نگاری بھی اس سلسلے میں اسٹھٹی نہیں۔

احتشام حسین نے جن دنوں مائیکرو عقیدہ نگاری شہرہ کی "ترقی پسند تحریک" اور ادب دونوں ہی پریش شدت کے ساتھ مہمیت کی ہڑت پر تھے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی بلکہ "انگارے" کی اشاعت کے دنوں سے سماجی، مذہبی اور اپنی مصلحتوں کی ممانعت پر نظر اور جاری تھی ایسے میں ترقی پسند تحریک اور ادب کی عقیدہ اور علمی سطح پر دفاع کی ذمہ داری قبول کرنا کاغذوں بھری راہ کا شعوری اور دانستہ انتخاب کرنا تھا۔ احتشام حسین کی اولین عقیدہ نگاریات جو ان کے پہلے عقیدہ مجموعہ "عقیدہ جاریے" میں شامل ہیں، "ترقی پسند تحریک اور اپنی تکھ نظر کے دفاع میں لڑی گئی طویل جنگ کی نشان دہی کرتی ہیں۔ چنانچہ اس مجموعہ کے مضامین میں سے "ادب اور ترقی پسندی کی روایت" (۳) نئی شاعری کے نفاذ (۴) ادب اور تعلق (۵) سے اپنی رتھات (۵) قدیم ادب اور ترقی پسند نفاذ (۶) مواد اور ہیئت (۷) بعد و حالی تصدیق کے عناصر "نہ صرف اس دور کی اپنی مضامین ترقی پسندوں کے مائیں کی طرف سے، مہمبلی، ہائی اور اتھری اور اشتہار کی شعور تصور سامنے لاتی ہیں بلکہ وہ عقیدہ میں پہلی بار سماجی علوم اور فلسفے کو مہمبیا کر ادب اور زندگی کے گہرے تعلق اور تا کر ہم سطری کو لازم و ملزوم بنا دیے کی مہمبیا کرتے ہیں۔ احتشام حسین نے جس عقیدہ کی، علمی جہرہ اور نفاذ و فکر کے ساتھ اس دور کی اپنی مضامین مہمبلی، ہائی اور اتھری اور اشتہار کی دھند کو دور کیا اور ترقی پسند تحریک "ادب اور ہر کسی عقیدہ کی مہمبیاں مہمبلی سے مضامین، اس کے اثرات اس دور کے ترقی پسند شعرو ادب اور شاعروں اور دیا کو فکر اور حوصلہ راہ دہی جگہ ایسا قدر ان مکرہ ہے کہ اس کی روشنی میں نہ صرف گذشتہ نصف صدی کی اپنی مضامین، نظریاتی مہمبیت اور تحقیقی لمس، روش راہوں پر مہمبیاں ہیں بلکہ آنے والے دور میں بھی احتشام حسین کی نظریاتی عقیدہ ہر کی سسل کو شعور ادب کے راستے اس ہی روشنی سے مہمبیا ہیں گے

احتشام حسین کی عقیدہ نگاری کا دورا اہم پہلو ترقی پسند عقیدہ کے معیار و اصول تکھ مہمبیا کرتا تھے۔ ان سے پہلے اس پہلو پر ان کے کسی مہمبیا نہ تھوے۔ اتنی توجہ دی اور نہ اعاجم کر لکھا۔ حقیقت یہ ہے نظریاتی اور اصولی سطح سے لکھے گئے احتشام حسین کے مضامین ترقی پسند عقیدہ کی مہمبیا کا دورہ رکھتے ہیں۔ احتشام حسین کے ان مضامین نے ترقی پسند شعرو ادب کی تحقیق میں جن اصول و



سید محمد سعید (صدر دیپاس) حسین بن علی علیہ السلام

معارف کا چرچا عام کیا، بعد کے آئے والے نوجوان حرقی پسند نگاروں نے اپنی نظریاتی عقیدوں ہی میں نہیں بلکہ اپنی عملی عقیدات میں ان کو برت کر تخلیقی فنکاروں کو فن اور فکر کی اونچ نیچ کو سامنے بنیادوں پر گھسے میں بھی سولت فراہم کی۔ یہ حقیقت ہے کہ احتشام حسین کے بعد کی نگاروں کی نسل نے ان کی عقیدوں سے نہ صرف نگارانہ ذوق و اوریوں کو نبھانے کے کر سیکھے بلکہ فلسفہ، سماجی علوم، سائنس اور اقتصادیات کا ہر شعبہ مطالعہ بنیادی ضرورت کے تحت کیا اور یوں اردو عقیدوں میں علم و آگہی، دین اور عقیدتی انصاف پسندی کی روایت، پہلی بار عملی و شعوری اور سائنسی خطوط پر استوار ہوئی۔ احتشام حسین نے اپنے پہلے عقیدتی مجموعہ ”عقیدتی جائزے“ کے ذریعے میں اس روایت کی داغ بیل بنی الفاظ میں ڈالی۔

”میں ادب کو زندگی کے عام شعور کا ایک حصہ سمجھتا ہوں جس میں منطقی، جذباتی، سانس لیے اور تمدن کے مظاہر اثر انداز ہوتے ہیں“ اس ہی مجموعے کی طبعی عمری ۱۹۵۱ء میں ہوئی اسی دوران میں ان کے عقیدتی مضامین کے ۱۰ مجموعے روایت اور طاقت (۱۹۴۷ء) اور ادب اور سراج (۱۹۴۹ء) شائع ہو چکے تھے احتشام

میں نے حمید کی جس ذکر کو اپنا تھوڑا سا چارپانچ برسوں میں اس کی رعایت اور اثر انگیزی کو نہ صرف دیکھ چکے تھے بلکہ اس سے خود بھی مطمئن تھے چنانچہ حمیدی جائزے کے "سب ایڈیشن" میں "بھراسوں کے ایک مختصر سا ویاپہ لکھا جس میں باعصاوت اپنے نقطہ نظر اور حمیدی راہنمائی کا مطالعہ کرتے ہوئے لکھا "وقت کے ساتھ ساتھ میرا یہ خیال بگڑتا رہا کہ اعلیٰ ادب اور اعلیٰ شاعری کی پہچان یہی ہے کہ اس سے زندگی کے حسن اور نواہی کو سمجھے اور اسے اعلیٰ ادب میں مدخلی ہے اس طرح حوام کا رشتہ حوی حدود کرنے والی طاقتوں سے مضبوط ہوتا ہے زندگی ادب کو سمجھتی ہے اور ادب زندگی کو سارا دے کر آگے بڑھتا ہے اچھے ادب کے مطالعہ سے انسان کا سماجی شعور بڑھتا ہے اور وہ سماج کو بہتر بنانے اور فطرت کو اپنے قلم میں لانے کا بل بن جاتا ہے۔ اگر کوئی ادبی نگار سچ کہہ چاہے تو اس میں اس میں بددلی سے دتا تو وہ صرف ان لوگوں کی نگاہ میں ادب ہو گا جو زندگی کو مترجما کے معنی میں نہیں ہیں۔"

(حمیدی جائزے ص ۱۱- طبع ۵۵ نمبر)

خوش قلم ادب و شاعر جمال اشفاق حسین کی کتابیں

۱۔ اعتبار (شعری مجموعہ) ۲۔ فیض ایک جائزہ (حمید)

۳۔ ویٹ ڈیس ول ومان (اردو نظموں کے انگریزی تراجم)

ملنے کا پتا: ارقاء مطبوعات کراچی

۴۔ فیض۔ حبیب غفیر دست (۱۹۹۳ء) قیمت - ۹۹/- روپے

۵۔ فیض کے مغربی حوالے (۱۹۹۳ء) قیمت - ۲۵۰/- روپے

۶۔ ہم اجنبی ہیں (شعری مجموعہ ۱۹۹۳ء) قیمت - ۱۵۰/- روپے

ملنے کا پتا: سنگ میل پبلیکیشنز لاہور

اور دیے گئے دونوں اقتضات کو بہ یک وقت نظر میں رکھا جائے تو ان سے احتشام حسین کی تنقیدی بوطیقا کے رہن اصول پورے طور پر عرصہ جو کہ سامنے آجاتے ہیں۔ سیاسی اور سماجی حالات کے اعتبار سے احتشام حسین کا یہ دور متحدہ ہندوستان کی تاریخ کا سب سے اہم، پر شور اور جدوجہد آزادی کی یہی تحریک کی بار آوری کے سفر کی آخری مسافت تھی۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں 'ادب' اور زندگی کا درشتہ استوار نہیں ہوتا جس میں دونوں ایک دوسرے کا سر۔ ہیں تو تحقیقی ادب کی مادی مشقت ایک مسئلہ پیکار کے سوا اور کیا ہوگی؟ اور احتشام حسین کے نزدیک یہاں مسئلہ صرف ان حریت کا ہو سکتا تھا جن کا زندگی، اس کے مصائب اور مسائل سے کوئی واسطہ نہ ہو جو مسائل کی آمدورفت ہی کو زندگی کا حاصل سمجھتے ہوں اور اس میں "زندگی کو سترے" کی سعی و کوشش کا بھول کر بھی خیال نہ آتا ہو۔

اگر کی سطور میں اشارت ایک جگہ عرض کیا گیا تھا کہ اپنی تنقید نگاری کی بناء ہی میں احتشام حسین کو جس، ہم مسئلہ سے واسطہ پڑا وہ ترقی پسند تحریک اور ادب کے خلاف شدید مورچہ بندی کے ان بھی تھے۔ یہ مورچہ ہندی لی الوافد ان حضرات کی طرف سے کی گئی تھی جنہیں زندگی اور س کی ستری سے کہیں زیادہ ادب اور شاعری میں "فعلات، فاعلات، فاعلات" "دون لایینی Exercise سے بہار تھا۔ ادب میں جس کاری، پہلی کاری، جتنے سنگھار اور مریض مادی کے ان دند اوگن سے ترقی پسند ادب میں فحاشی، روایت سے بغاوت، اپنی رکھ رکھاؤ کو جس پس کر ڈالے، جو جوانوں کو مدب اور معاشرتی ادب و ادب کا بائی بنانے یعنی دین بردہاں میں تلخی کھوسے کے پسے لایینی اور بے حیاء مسائل، اپنی مورچہ بندی کی میلا ج کر گولہ ماری کا آغاز کر دیا۔ احتشام حسین کا دور سرائیکی محسوس ہے ہی فحاشی مسائل اور قصور اپنی اہدام معاشرہ کی کوششوں کے عموماً دندہ ملا، و بیکاری لدا میں سامنے آیا تھا۔ اسوں سے ہاتھ دھو اور ہمارا ادب میں ترین کاریوں کے اس شور و غوغا کے جواب میں ادب سے طغات کے اس صحیح مضمون اور نقطہ نظر کی وضاحت کے لیے ہے۔ ہے میں چار مضامین لکھے جو اس محسوس "روایت اور بغاوت" میں شامل ہیں بطور خاص جو مضامین ان مباحث کا احوال کرتے ہیں وہ اپنی تنقید، جدید اردو شاعری اور سماجی کشمکش اور نیا ادب اور ترقی پسند ادب، ہیں۔ بالخصوص آخری مضمون جو ادب میں ترقی پسند روایت نظر سے فلسفیانہ مسائل کی مادی نمون اور واقعات تک نہ تعبیر و تبویل میں حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ دراصل کافانہ مورچہ بندی کے دندہوں سے داسے گئے کئی ایک بموں (Bombs) کے جواب میں لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے جو ستر طغات پر پھیلایا ہوا ہے۔

احتشام حسین کے اس مضمون سے اگرچہ ناظرین کی کٹختی کو یکسر تو ماحوش میں کیا۔ لیکن ان کے
 عمومی رویے میں ترقی پسند ادب اور شاعری کے بارے میں اتنی تبدیلی نمود کر دی کہ وہ حضرات جو کبھی
 پوری ترقی پسند نسل کی اہل کوششوں پر تنقید کھیرا کرتے تھے اب مستحیات (Exceptions) کے
 سلسلے میں رہ کر باقی کرے گئے۔ ان کے رویے سے بارے ہی ترقی پسند شعرا اور ادبا گردن رطیل رہے
 اور نہ سارے ترقی پسند ادب اور شاعری دھڑا دھڑا کر دیے کے لائق رہا۔ احتشام حسین کی تنقید نگاری کے
 سابق و سابق میں جو گتہ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے وہ یہ ہے کہ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۵ء تک وہ اس میدان
 کا دار میں تقریباً پچاس سال قلمی جنگ کرتے رہے۔ گھر یا بس لے کر اکثر حسین رائے پوری نے اپنے پلے
 محسوس مطالعے میں "ادب اور انقلاب کے بعد" اپنی کہیں کہیں مصروفیات کے جب بہت کم تنقیدی
 مضامین لکھے اور نظریاتی مباحث پر ادب اور انقلاب میں مثال مطالعے کے علاوہ کچھ اور لکھا ہی نہیں۔
 ہاں عملی تنقید کے ضمن میں کوئی آئندہ مطالعے ملتے ہیں نظریاتی سطح پر بھیوں کو کچھ پوری، ڈاکٹر اعجاز
 حسین اور آل احمد سرمد اللہ شاہ کے بارے میں کچھ سارا دیتے رہے۔ اس اعتبار سے دیکھو تو
 احتشام حسین کی تنقید نگاری کا یہ پتلا اور ٹوٹا ہوا اثر ہے کہ ترقی پسند ادب کی انعام و تحسین، اس کی حدود
 اور وسعتوں کے قیاس، قدیم ادب کی جدید تشکیلات اور توضیحات میں نہ کسی مائتبی نقطہ نظر کی
 رجحانی (یعنی ماضی کے دب کو اس کے متعلقہ نتائج کے تاریخی، سیاسی، معاشرتی اور معیشتی حوالوں
 اور اس عہد کے ادباء کی اپنی مصروفیات کی روشنی میں جانچ کر رکھ کرنے کی ضرورت) کو جزو تنقید جانا۔
 چنانچہ یہ بانگ سامنے کی بات ہے کہ احتشام حسین کی زندگی میں جو ترقی پسند نگار سامنے آئے (مثلاً
 بالخصوص مختار حسین اور محمد حسن) ان کی نگاروں کی تہذیب اور تنقیدی رجحان کے اولین خوش احتشام
 حسین کی تنقیدی نگارشات سے ہی مرتب ہوئے۔ اس ہی تہذیب اور رجحان کا یہ نتیجہ ہے کہ ان دونوں
 نگاروں نے اپنی تمام ذہنی قوتوں اور صلاحیتوں کو نہ کسی غرض کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے تمام
 مسائل و علوم، اپنی تحریکات اور اپنی تجربات پر گہری نظر رکھی اور ساتھ ہی اپنی عملی تنقیدوں میں ہم
 عصر تخلیقی ادب کی چھان، محکمہ کا کام عرق ریزی اور وقت داری کے ساتھ کرتے رہے۔ احتشام حسین کا
 تنقیدی مدرسہ فکر (یعنی نہ کسی اتنی پسند تنقید) ان دونوں نگاروں کے بعد بھی وسعت پذیر رہے البتہ
 بدلے ہوئے حالات، نئی اپنی تحریکات اور سماجی کیف و کم میں جدید عہد کی نئی ہوتی عہدگیوں کے
 جب اس ناظر نے کسی تنقید کا رجحان کمزور پرچا جا رہا ہے اور اس ہی جب سے تنقید کے میدان میں
 نو واردوں کے یہاں نہ کسی عہد کے ساتھ ساتھ عہد حاضر کے نئے علوم کے مطالعہ کا نفاذ ان صاف نظر آتا

ہے۔ ہر حال حالات کئے ہی نہ ہیں، اب عقیدہ نگاری میں معاشقہ حال احوال اور جس لائقانی سطح پر
ہر سیاسی اور علمی جدلیوں کے اثرات سے ذہن کو ہٹانا بھی ممکن نہیں رہے گا۔

عقیدتی سطح پر بھی یہ صورتحال برسرے اثر انداز رہے گی، اس کی زندہ مثال گزشتہ دو مہینوں
دہائیوں میں ”جدیدیت“ کی تحریک اور اس کے تحت کی عقیدہ میں ستر پکرازم کے رجحانات کا فروغ
ہیں۔ جدیدیت کو پسے ترقی پسندی کا دراصل کہہ کر متعارف کرایا گیا۔ پسند کو ترقی پسندی کا لفظ
لگائے جا کر ادا مشکل ہو گیا مگر چونکہ یہ فعل اپنی مادہ عامے کی خاطر نیم دائرہ حجب تھا اس لیے
جدیدیت پسندی کی پوری حدت ڈھلے گئی، ایسی مشترکہ ستر پکرازم کا جو پسے سے اپنی ذات میں خالی و
کافی ہوئے کا سرٹیکٹ دیا گیا۔ جب قبول عام کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو بدقسمت میں ستر پکرازم کے
غرض کی کھنچ اس کے طبقات فلسفہ و فکر کی رعایت سے شہساز ہوئی اور اب راند میں ستر پکرازم خود
اس سے بیزار ہو کر اور اپنی گھوٹا لسی کی خاطر مجدد الطبیعیاتی بیویات کی بحث میں جھوٹ رہے ہیں
کئے کا مقصد یہ ہے کہ اصلی ترقی پسندی جدید عہد اور جدید تقاضوں کی ذہن دہے کر خود دیکھتے ہی حرجے
اپنی ذات کی تفسیر کی خاطر آ رہی رہے، لیکن وہ ترقی پسندی جو صحیح درختوں بلکہ کسی خطیہ پر ترقی
پسند تحریک کے رہا اثر پہلے چڑھی اور اس کے اولین سامی مفکر اور فکرو احتشام حسین نے جس
انداز میں اسے اپنی فکر میں کے درجہ آئے والی نسلوں کے بعد از ذہن افراہ کی فکر و نظر کی تربیت کا
درجہ بنایا، وہ برادر کی ایسی اصلی ترقی پسندی اور ذاتی ثمرت کے طلب گار نام نہاد ترقی پسندوں کے
قام چلے اور جنہوں کے کھیلنے، کھولنے کے سارے امکانات کی راہیں مسدود کر رکھی ہے۔ اور فکرو
عقیدہ پر اتنے گہرے اثرات مرتب کرنے کے بلو بند (جو ان کی اپنی ہی زندگی میں محض حسین اور محمد
حسین کی عقیدات کی شکل میں سامنے آ گئے تھے) کو احتشام حسین کے عہد عقیدہ نگاری و ذمہ داری اور
اس کی ابتدا اور علمی حیثیت کے بارے میں جو مفکر اور فکرو تھا اور محمد خود ”ہم جہاں میں ہو گئے بہت
”کا سرور داتے رکھو انہوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کھولنے بہت ہو چکا ہے انہوں نے اپنے
جو تھے محمود مصباح ”عقیدہ اور علمی عقیدہ“ کے ربا پنے میں احتراک کیا ہے

”عقیدہ نگاری کو جینچل سے سب سے مشکل اور ذمہ دارانہ صنف اور

ہے لیکن جس اوقات اس ذمہ داری سے پوری طرح عہدہ آہٹا ممکن نہیں ہو گا۔ اس
میں فکرو کی عہد نگاری اور جنہاں کھڑی کا درجہ ہوتا ہے اس لیے میں کہتا ہوں کہ
جرات نہیں کرنا کہ یہ مصباح صرف آخر کی حیثیت دیکھتے ہیں تاہم جن تک ہو سکتا

ہے میں ریاست دار سے کی کوشش کر رہوں ۔

یہاں تک پہنچنے کے بعد اس بات میں کسی اضافے کی گنجائش میں روحانی کہ حیدر کی اثر انگیزی میں جنی وسعت علم و نظر و نگری گہرائی اور فطرت روئے کی گہرائی کو مدلل ہے وہیں فطرت کی حیدر ریاست داری بھی ایسا لازمی جزو ہے ، جس کے بغیر مشاہدہ حق کی محسوس کا حق اور ہونا ممکنات میں سے نہیں

یہاں تک بات صرف احتیاط حسین کے حیدر کی نظر ہے اور روئے کی ہی رہی ۔ یہ اس لیے صہری تھا کہ سب سے پہلے ہم ان کی حیدر نگری کے ضمن میں بہت مختصر طور پر چند اشاروں کی حد سے یہ دیکھ لیں کہ ان کے حیدر دین کی روش کیا رہی ہے ۔ دوسری بات اس ضمن میں ان کی حیدر نگری کے اثرات ان کے بعد آنے والے فطرت اور حیدر کی روش پر کیا پڑی ۔ اس سوال سے بھی بہت ہی سرسری طور پر چند باتیں اس صہری کے تحت پسے کہ وہی گئی ہیں کہ ہر دور کے مخصوص حیدر روایوں کے اثرات حقیقی ادب پر لازماً پڑتے ہیں اگرچہ اس کی نوعیت وہ امتیاز ہوتی ہے ہر حال سے جان لینے کے بعد کہ احتیاط حسین کی حیدر نگری کے بنیادی اصول اور نظریات کیا رہے اور ان کے حیدر روایے نے کس انداز میں مستقبل کی حیدر نگری کی رہنمائی کی ، اب ہمیں ان کی حیدر کے اثرات ان کے ہم عصر حقیقی ادب و شعر پر بالخصوص اور بعد کے شعر و ادب کی عمومی صورتحال پر مختصر سی بات چیت کر لینی چاہیے ۔

اگر نظر تازہ عرض کیا جا چکا ہے کہ کسی بھی مخصوص حد کی حیدر اپنے بعد کے آنے والی حیدر پر ضرور اثر انداز ہوتی ہے اور آنے والے نوجوان فطرت کے حیدر اسلوب ہی نہیں حیدر نظریات ، حقیقی ادب کی عملی حیدر اور شعر و ادب سے حقیقی نظریاتی مباحث تک پر اپنا گہرا اور فوری اثر جمود پڑتی ہے ۔ یاد دہانی کے طور پر مکرر عرض ہے کہ احتیاط حسین کے حیدر نظریات ، روایے اور عملی حیدر کے طور پر گہرے ان کی اپنی ہی زندگی میں وائٹس مہلت برطانیہ وائٹس محمد حسن اور صہری حسین ایسے ترقی پسند فطرت کی نگہ و نظری کی آبیاری اپنے ہی انداز میں کی اور یہ عموماً فطرت ترقی پسند ادب کی حیدر کے احتیاط حسین مدورہ گہر کے فطرت مانے جاتے ہیں ۔

یہاں تک نوبت سید علی احمد آگلی سے کچھ میں آجاتی ہے لیکن کسی بھی حد کے کسی مخصوص حیدر روایے اور نظریات کے اثرات اس حد کے حقیقی ادب پر یکہ جنبش عظیم یا اعلیٰ سے دیکھنا نہیں کے جائیے جتنے ایک مخصوص نوعیت کی حیدر کے اثرات ہم عصر حیدر پر واضح اور

ٹوک بند میں یہاں سے جانتے ہیں۔ فلاں اس صور حال کے متعلق اسباب اور وجوہات کی کسی طور پر تشریح اور بتوں میں جاسے کی اس لیے ضرورت نہیں ہے کہ اتنی عیادی بات ہم سبھی جانتے ہیں کہ اور تو تخلیقی فنکار کی نامست حد کیا ست در تک بھی کسی عقیدہ روپے کی بائیں کردہ 'مطابق' اور کی جہل پرانے کے ہے اندر میں ہوتا دوسرے چ کہ چ توقع ہی عیادی طور پر بحث ہوتی ہے کہ اور کسی ٹکڑے میں مسہرہ کی یا من شاعری پر کوئی مضمون لکھا ہو اور دوسرے ہی دن سو میں سے دس پہنچانے اس نصیحت نامہ کو سامنے رکھ کر اپنی 'کھلی' تحریروں کے برعکس عقیدہ مشورہ کے مطابق یکسر میں ہوں غزل یا نظم یا کوئی ایسا تخلیق کر لیا ہو۔ ایسا ہونا ممکن ہے۔ ایسا ہوا ہے اور وہ ہی خود فلاں اپنی عقیدہ نگاری کے جادوی اثرات کے مرتب ہونے کی توقع پر لکھتا ہے

چ غیر ضروری ہی Pre Cautionary بات اس لیے عرض کرنا ضروری سمجھا گیا کہ مضمون کے عنوان کو سرسری نظر سے دیکھتے ہی پڑھے والے کا ذہن اس امر پر آمادہ ہو جاتا ہے کہ مضمون نگار ایسے نساوں، نالوں، غلوں، غیروہ کی سرست میں کرے گا جس کے قصے والوں سے احتشام حسین کے فلاں فلاں مضمون کو پڑھ کر چ چیزیں نفسی میں اور ان پر پہلی حقیقت کے مقابلے میں احتشام حسین کی تجویز کردہ فلاں فلاں جدیدی آئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ادب میں ایسے اثرات کی توقع بائیل دیسی ہی ہے جیسا کہ بازار میں ایک دن کسی نئے ڈرائیو وہ نقش و نگار والی کوئی میز کسی دکان پر پہلی مرتبہ نظر آئے اور وہ چاروں کے اندر پوری شہر جہاد کیٹ میں ہر جھری یا دوسری دکان پر دیکھی ہی سینہاں کا تہہ کا نظر آئے گئے۔ ادب میں اس طرح کی "تاثر پذیری" پہلی نوری تبدیلی برقی طاقتور سے طاقتور عقیدہ کے ہے بھی کبھی ممکن نہیں ہو پتا

نظریاتی سطح پر تو کوئی اپنی تحریک ماسی کے مقابلے میں یا نظریاتی ادب اپنے اثرات کے تحت ہر چہ میسے یا میل صحر کے اندر اندر تھیں کرانے کے موقف میں ہو سکتی ہے اور ایسی صورت میں چ کام تحریک کی اثر اندازی کے جب ہوتا ہے (جیسا کہ حرقی پسند تحریک 'مطلق' ادب و ادبی کی باتنامہ سال چہ مینوں تک اپنی اعلاں کے اثرات کے تحت تبدیل شدہ شعرو ادب ہمارے سامنے آیا ہے) لیکن چ توقع کرنا کہ احتشام حسین نے جب کرشن چندر کی افسانہ نگاری پر مضمون لکھا تو اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک جگہ کے مدد ہی اندر کرشن چندر نے احتشام حسین کے عقیدہ مشورہ اور تجویزوں کے معین مطابق فلاں فلاں لکھا۔ عرض کیا جا چکا ہے کہ اس طرح کی توقع اس مضمون کے عنوان سے بد معاہدہ علم ہوگا۔ اس محفظات کے بعد اصل بات کی طرف آئیے۔

بہت دیر سے کی گئی ہے کہ ترقی پسند تحریک سے پہلے اردو ادب یہ سمجھی جاتی تھا کہ بہت مخصوص نوعیت کی تنقیدی مطلقیت میں بیسیویں صدی کے بعد لئی دور کا ادب ہے اس کی قریب یہی بیسیویں صدی کی آخری راج کے ادب سمیت اندکی کا شکر تھا۔ اس میں شک نہیں کہ مذکورہ بالا قریب قریب پچاس برس کے ادب میں دو لامحدودتوں میں ترقی پسندی اور بیسیویں صدی کے ادب اور شعریں میں حسن آخری، رنگین بیانی اور زبان و بیان کی سحر کر آرائی کے سبب بہت عام تھی۔ اس ادب میں جب وطن کی رویت، حالات سے باطنیت، عیروں کی تھوڑی کاواوا احساس، تعلقی ہے راہروں کی عیروں ایسے عناصر کی شہید ہی تھوڑی سی جستجو کے بعد حتی کہ عربی شاعری کی مطلقیت اور انہوں کو سماجی معنویت بھی سمجھ گچھ جس کے دی جاسکتی ہے۔ لیکن جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، اس سارے ادب میں کسی مخصوص مقصد یا منزل کی طرف سفر کی کوئی واضح سمت ایک قرأت سے نہیں آتی۔ یہ یاد رکھنا ہے کہ یہ دور کا یہ صور حال خاص طور سے مذکورہ دور کے اردو ادبی ادب سے متعلق ہے نہ تو اس کی غیر منقسم چند سطحوں کے اسی دور کا حال ادب یا مخصوص ایک الگ سی منظر پر پیش کرتا ہے۔ اور حال طور سے ۱۹۰۵ء میں تقسیم ہند کے حوالے سے تو بنگال زبان کا ادب شعلہ جوالہ ماہوا تھا، لیکن اردو ادبی ادب میں تقلید ابھی ہمسفر بنگال ادب کا بدلہ ماہر تو نظر نہیں آتا۔ یہاں جب ۱۹۱۰ء/۱۹۱۱ء میں ایک بار ہمسفر بنگال کو متہ کر رہا تو ابھی مسلم قومیت کے حوالے سے مولانا غفر علی خاں نے خاص خود پر اور اخبارات سے مسئلہ ایک اور شاعریوں اور قلم کاروں نے مولانا کی تقلید میں تخطات، شہری کاروں اور ایک طویل مضمون میں اپنی قوم کا احسن صبر و نیکو کرادیا، لیکن تخلیقی ادب کی دنیا بدستور اپنی دامن میں گھن مانی۔

ان عنصر سے انہوں نے جس صور حال کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ اردو شاعری اور ادب کا جو ورثہ ۱۹۰۵ء کے لگ بھگ نئے اور روشن خیال لوہوں کو اور انہوں کی ترقی پسند تحریک کے حوالے سے ترقی پسند معصین کو ملا اس میں جدوجہد، توہم پرستی، حسن پرستی، اور مٹھی حالات زندگی سے متعلق لکھے واپس کا ایسا دورہ کر رہا تھا جس کا زندگی کے اصل مسائل کی تہ تک پہنچنا اور زندگی کو مدنے کی جدوجہد کا کوئی پر تو نہیں ملتا تھا۔ ادب اور شاعری میں بہت پرستی خدائے مقصد ہی تھی اور اعلیٰ ادبی کتابت سے کی ریل بھی۔ مولانا کو۔ تخلیقی عمل میں کوئی بیحد مقام حاصل تھا اور نہ شاعری کے سلسلے اس کی کوئی وقعت تھی سب کچھ غیب انداز میں گم مذہب ہو رہا تھا۔ بیسیویں صدی کی ابتداء میں جلو حیدر خدوم اور پریم چند کی آوازیں بلاشبہ اپنے ذمہ اسٹیج کی شدید روایتی

تقلیدی لہجہ میں ہی آدیں تھیں لیکن یدرم کی تمام تحریریں مواد کے مقابلے میں بہت اور اساتذہ میں تبدیلی کی نگہ دہ سے آگے سیر دیکھ جائیں۔ پریم چند کے ابتدائی افسانوں کے مجموعہ سوز وطن کا مجموعہ حصہ لکھ گولی کے پرانے انداز کی پہلی کتاب ہے۔ اگر اس مجموعہ کے ابتدائی نام "سیر ویش" اور سوز وطن کی کتابیں "کوہیش نظر رکھا جائے تو پھر زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہا جاتی۔ پریم چند کی ان بعد کی کتابوں میں بہت کی جدیدیت (اس دور کے خاطر میں آگے سوا مواد کے اعتبار سے کوئی حدت نہیں البتہ تخلیقی عمل کے طور پر جب وطن کی ادبی روایت سرور کا گرا ہے جو ۱۸۵۰ء کے عہد عظیم اور ۱۹۰۵ء میں عظیم نکال کے رد عمل کے طور پر ہندوستان معاشرے کو پہنچانے حکمرانوں کے خلاف گمراہی تھی

یہی گزشتہ لہجہ میں انداز دہی کے ساتھ دب اور شاعری کو صحیح معنوں میں عوامی کر دیا کرے کے خطوط پر دھانے کی تقلیدی سخی و دکوش کی ذمہ داری قبول کرنا اور سہو قہانہا کس درجہ کا کٹھن کام ہو سکتا ہے؟ اس سوال کے جواب کا احتشام حسین کی ابتدائی دس پندرہ رسوں کے تقلیدی مضامین کو پڑھ کر ہی اندازہ ہو سکتا ہے۔ انہوں نے جس، ہنس، مہی، گمرنی اور گمرنی، ہار کسی اصولوں کی سوجھ بوجھ اور ان کی روشنی میں مستحضر ہارنوع کی انجی ہوئی اولی سوز محال کو جدیدیت اور اندھی تقلیدی روش کی کھول کھلیوں سے نکال کر سماجی ذمہ داری بھائے کی رہ ڈال دہی الواقعہ کسی کیلئے مرد کا نہیں یک پارے اور سہو کا کام تھا

اس واسطے سے اب گرجہ دیکھا جائے کہ احتشام حسین کے ان پہلے ذکر کیے گئے مضامین کس نوعیت کے تھے تو سہو سے پہلے ہمیں ان کے حوالہ کی ایک سرسری ہی ضرورت پر نظر ڈالنا چاہیے ان کے انداز چار مجموعوں (تقلیدی جائزے، روایت، روایات، ادب اور سماج اور تقلید اور عملی تقلید) میں شامل مدورہ دہل سے مضامین شامل ہیں جن میں انہوں نے اپنی مسائل پر ہار کسی نقطہ نظر سے تخلیقی دب کے مادی اصولوں کی حدوں اور ترمیم کی ہے

(۱) ادب اور ادب میں ترقی پسندی کی روایت (۲) نئی شاعری کے نکتہ (۳) ادب اور اصلاح (۴)

نئے ادبی رجحانات (۵) قدیم ادب اور ترقی پسند نکتہ (۶) سوز اور بہت (۷) ادبی تقلید (۸) انسان اور حقیقت (۹) جدید روز شاعری اور سماجی کشمکش (۱۰) ادب اور سلیج (۱۱) نوجوانوں میں واحد قوں کا مضمون (۱۲) تقلید اور عملی تقلید (۱۳) ادب میں طنز کی جگہ (۱۴) انسانے میں نفسیات کا عنصر (۱۵) ایک سرسری لیکن بنیادی اہمیت کے مضامین کی ضرورت ہے اور یہ تمام مضامین ابتدائی مدورہ ترمیموں کے دوران میں

لکھے تھے)

مذکورہ بالا معاین کے محالیت ہی سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں رہ سکتا کہ احتشام حسین نے اپنی تنقیدی ذمہ داری میں اس دور کے پسے کے ادب اور شاعری کو ہر ذریعہ سے سماجی حالات اور زندگی کی ابتراقدار، عوامی قیاموں، نئے علوم، نوب میں نئے تجربات اور سب سے اہم نظریاتی اساس دینے کے کام کو ترجیح دی کہ طور پر نوعیت دی۔ یہ اس لیے بھی مہربانی تھا کہ اس دور میں بحیثیت عمومی ترقی پسندی کا نام ہی کلاسیکی عہد کے ادب کے پرستاروں کے منہ پر لگانے کے لیے دیا گیا تھا۔ احتشام حسین نے دوسرے جذباتی ترقی پسند معاین نگاروں کے برعکس اسی کے ادب کے مطالعہ اور اس کی جانچ و نمٹنے کے لیے یہ رہنما اصول سامنے رکھا کہ ایسے تمام ادب کو سچ کے حوالے سے جوئے حالات اور زندگی کے معیارات پر پرکھنے کے بجائے تھوڑے بڑے نظریاتی عیندگی کے ساتھ اس دور کو ہمدردی، ہمدردی خاطر اور سماجی کیفیت و کم کے میں مٹھ کر دیکھنا چاہیے اور ساتھ ہی اس بات پر بھی غور رکھنا چاہیے کہ لکھنے والے کے اپنے علمی، ادبی اور تخلیقی محدودات کیا تھے؟ اور آیا وہ ان کو توڑ کر آگے بڑھنے کی سکت رکھتا تھا یا نہیں؟ اگر نہیں تو اس ادب کو اپنے آج کے معیارات پر پرکھنا نا اعلیٰ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس انداز سے ماضی کے ادب اور ادب عالم کو پرکھنے کا معیار ہمارے پس کے تنقیدی رویوں میں حاوی نظر آتا ہے۔ جو یہ رہا تھا کہ نئے علوم سے قطع نظر نئے سماجی حالات کے روم میں بہت سے لکھنے والے اسی کے تمام ادب کو یکجا جیش قلم زد کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ نظریاتی سطح پر احتشام حسین کی تنقید نگاری کے اس پہلو سے آنے والی غلطیوں کے سامنے ایک ایسا معیار قائم کر دیا جاسے رد کر کے ماضی کے ادب کو رد کر دیا، خود ان کی تنقیدی صلاحیتوں کو مشکوک بنا دینے کے برابر تھا۔

احتشام حسین کے اس رویے نے دوسرا اہم کام ترقی پسند معین میں غزل کی ازمرلو کی پیکاری کا انجام دیا۔ ترقی پسند غزل کی تحقیق اور پسندیدگی دونوں ہی میں اس کی تیسری کوششوں کو رد و حل ہے اس حوالے سے ان کے وہ مضمون خیالی اہمیت کے حامل ہیں جن میں نئے ترقی پسند ادبوں اور بالخصوص قارئین ادب کو ماضی کے کلاسیکی ادب اور شاعری کے مطالعہ میں سامنے دینے اور ان کی طرف متوجہ کر دیا ہے (اور ان معاین کے نام دے دیے گئے ہیں) اور اس بات پر انہوں نے خاص طور سے متوجہ کیا کہ ماضی کے ادب کو اس کے سماجی سیاسی اور معیشتی پس منظر سے کاٹ کر آج کل کے حالات اور ادبی پس منظر سے باہر تنقیدی اور چنانچہ غیر ماضی دہی ہو تا ہے۔

احتشام حسین کے دور تک آتے آتے اگرچہ اردو کا شری قہقہی ارب علی السانہ ناول اور ڈرامہ خاصہ جدید خطوط پر اسوار ہو چکا تھا تاہم سو داور بیت کے معاملے میں لکھے والوں کے ذہن صاف نہیں تھے۔ بالخصوص مواد کے بارے میں ابھی تک ادیبوں اور ناظرین بے اعتنائی کا شکار تھے۔ ان کی روایات کے مطابق مواد کے انتخاب اور برتاوے کے معاملے میں بیت اور اسلوب پر زیادہ زور دیا جاتا تھا چنانچہ اس طرف متوجہ ہوئے تو، احتشام حسین بے پے ای مجرد موضوعات پر مسلسل کئی ایک اعلیٰ درجہ کے معاین لکھے جن میں موضوع، مواد اور بیت کے ساتھ ساتھ اجتماعی شعور اور حقائق ایسے دقیق اور الجھے ہوئے مسائل کو حکیمانہ شعور کے ساتھ سمجھایا ان کے مضمون بیت اور مواد سے لیا گیا مندرجہ ذیل اقتباس دیکھیے

”یہ ہر شخص جانتا ہے کہ نہ صرف مواد سے کام چل سکتا ہے اور نہ محض شکل و صورت سے بلکہ کسی نہ کسی عاص سے دونوں کا رابطہ، کالڈی عصر ہے جس وجہ سے بیت اور مواد کا سوال جمالیات کے نقطہ نظر سے سمجھنے کی کوشش کبھی تسکین بخش تجربہ برآمد نہ کرے گی۔ اس کے برعکس تاریخی رابطہ نظر جمالیات کے پرستاروں کے متعدد مکاتب کو الحمد اچھے والی موشگافوں سے بچائے گا۔“

”مواد جو یا بیت اور شکل ان میں جمالیاتی قدر کا ہمہ گیر معیار تلاش کرنا اس سے محال ہے کہ انسانیت اور عظمت اپنے معاشی روابط کی وجہ سے کبھی یکساں مذاقی کے حامل نہیں ہو سکتے ایک قسم کی شاعرانہ آرائش سے متاثر یا مستند نہیں ہو سکتے

یہی خود جمالیاتی قدر دار جاننے والوں کے بے صرف ایک چارہ کار رہا تاہم اور وہ کہ وہ بھی تاریخی تجزیہ کا راستہ اختیار کریں اور ہر قسم کی شاعری کو اصناف کے ساتھ پرکھیں۔“

”آج نئے اسلوب اختیار کرنے، مواد کو شاعری کے سانچے میں ڈھانسنے کا سوال اس سے زیادہ اٹھ رہا ہے کہ وہ تمام لوگ جو ادب کو ذاتی ملکیت کی حیثیت دینا چاہتے تھے، اب اسے چند آدمیوں تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔ جو مدنی ہونی زندگی کا ساتھ اپنے لمبی نقصان یا ذہنی رکاوٹ کی وجہ سے نہیں دینا چاہتے تھے وہ بہت کچھ اپنے ہاتھ سے لٹکاتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔“

محدود ہلا مختصر سے چند اہمیت اگرچہ تفصیل کے ساتھ موضوع بحث طے کئے اور مسائل اور ان کے تصدیق اور تفسیر تو مصنف کا ہم ایسا سہیں ہیں تاہم ان سے کسی ہم احتیاط حسین کے عبادی نقطہ نظر سے بخوبی وقف ہو سکتے ہیں بعض حضرت نے اس مضمون (بیت در مواد) کو پڑھ بیٹے کے بعد بھی احتیاط حسین کے حیدری نقطہ نظر پر الزام عائد کیا ہے کہ روایت کے مقابلے پر سو دو مقدم رکھتے ہیں کچھ حضرات کا خیال ہے کہ ان کے روایت من کا واحد مقصد صرف اور صرف مواد ہے روایت کو وہ محض ایک بیوقوف اور بطور وسیلہ دیتے ہیں

اس اعتراض اور احتیاط حسین کے مضمون ذاتی سارے رکھے تو یہ بات سمجھنے میں خاصی دشواری پیش آتی ہے کہ ان حضرات نے کس طرح سے یہ نتائج اخذ کیے؟ یہ تو اولیٰ حید کے تاثراتی مدرسہ فکر کے سامنے داسے ہیں اور اولیٰ حید کے معنی، تفسیر اور تاریخی انداز اور عمل سمجھنے کی سکت اپنے آپ میں ہیں رکھتے یا محروم تحقیق شعرا و ادیب میں مواد کے مقابلے میں صرف اور صرف طرز احوال تک ہی مغلطہ کرتے ہیں ان دو معذریوں کے علاوہ کبھی عیسوی وجہ سمجھ میں نہیں آتی اسے مدخل در معنی انداز میں روایت در مواد کے رشتے اور تعلق میں جو غائب اور توازن پر بحث لا کر انہوں نے، ایک خاص غائب کے ساتھ الزام و عزم ہوسے کو نکتہ کشا کیا ہے اس میں احتیاط حسین نے کہیں کوئی ایسا باقی نہیں چھوڑا ہے اتنے طویل اور بے حدت مسائل پر صاف صاف شکوہ پر مشتمل مضمون کے بعد اس کی کسی وضاحت اور تشریح کی ضرورت اس سے ہے کہ ہوش چاہے کہ جن وجوہ کی محدودی انہیں منطق اور استدلال کی مہیا نہیں سمجھا سکتی ان کے سامنے ہزار ہا غلطی پر مشتمل تشریحات بھی دیکھی ہی تھیں وہ لا عقل رجس کی جیسا کہ یہ مضمون دہا ہے۔ لہذا مزید کسی حاشیہ آرائی کے بغیر خود احتیاط حسین کے الفاظ ہی میں اس ضمن میں یہ بات سنائیے

"شاعری کے محبوب میں ہویا پر اسے شاعر کے لیے ہے مواد پر قدرت

"اس سے صوفی اور احساس کی شدت کے ساتھ ساتھ رہیں پر قدرت بھی محدودی ہے اسے رنگ و صوت، تصور و ترقی، تمام طاقتوں سے کام لیا چاہے جس کا مواد اس دماغ پر چھ جائے اور اسے والے میں عمل کی طاقت پیدا کر دے مواد اور روایت کے اس ہی احوال کا کام فن ہے"

محدودہ بالاد و معانی طریوں میں مواد اور روایت کے احوال ان کے خاص اور ان کے تحقیقی اثر پر جس واضح انداز میں مدنی بحث کو سمجھا ہے۔ اس میں مواد کو روایت پر فوقیت کی بات ہے اور۔

صرف در صورت ہیئت پہلی کا درجہ لکھ اصل بات وہی ہے جو احتشام حسین نے باصراحت اور
 دیے گئے ہیں اس ہی مصنف کے اقتباس میں کہ وہی ہے۔ یعنی جو حضرت اپنے "مصلحتی" میں مود
 کی نسبت کو صرف شکل اور صورت کے ساتھ سنگھار پر ترجیح دیتے ہیں وہ کسی بھی
 ہیئت اور اسلوب کے برابر مواد کو ہیئت دینے پر تیار نہیں ہو سکتے

اور اصل قصہ ان حضرات کے لیے صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ مود بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا
 کہ اسلوب اور ہیئت لکھ اصل بات ہے ہے کہ احتشام حسین نے مواد کے حوالے سے اس مضمون میں
 بھی مواد کے معنی پر حقیقت کی بات عاقلانہ کسی نقطہ نظر سے کی ہے۔ یعنی وہ حقیقت کو صرف مادی اور وہ
 مادی میں ہی ہیئت دیتے ہیں جو تحلیل پر حلقوں کی بنی گئی اور معش عمارت کے رنگ و روپ کی مادی آہود
 تلب ناقابل بغیر یعنی معروضات کا غلبہ جاکر رکھ دیتی ہے اس لیے کہ جدیدی مادیت مستقل کشمکش میں
 معاشی نظام کو محدود نظر آتی ہے اور اسی وجہ سے حقیقت کا کوئی تصور قی حاکم جدیدی مادیت سے فلسفیانہ
 اور منطقی ارجحیت میں اپنی "اعلیٰ" باقی نہیں رکھ سکتا۔ ظاہر ہے کہ اس سے تصورات پر قائم وہ
 مادی فلسفائی تصورات سے معنی اور بے مصروف ہو کر رہ جاتی ہے جس کے بل پر شعر و ادب میں حسن کاری کا
 کا دوبارہ جاری کیا جاسکتا ہے۔ مواد کی بدکسی اور جدیدی توصیحات کا بھی ہر سوس راجع کا اصل راجع ہے
 میں تو ابیہ در شاعر۔ حسن کاری کی مشقت کے ماح جانے کا دوسرا گہما جاتا ہے

احتشام حسین کی تجرید نگاری کے حسن میں ایک اور سمجھات کی طرف اشارہ ہی میں اشارتاً
 کے نام صدر سید، داء اور شعر کی تعلیمات میں دو مانی دغور کا اگر کتاب تھا احتشام حسین سے اپنی
 شریعتی تعلیم کی نگارشات میں اس پہلو پر خصوصی توجہ دی اور ادب کی وہاں میدان اور حرکات پر بھی توجہ
 اور تعلیمی مضامین لکھ کر بہت سی بے بیاد افسوس و در حلاکت کا ازالہ کیا یہاں وہ بات صراحت کے
 ساتھ در دوسرے پہلو پر دیتے ہیں کہ وہ ارد گردی اور تحریر میں وہاں کی کشمکش کے کسر مکر نہیں ہیں البتہ
 میں مود اور داء دیتے رہے وہی وہاں پسندی کی بنی رہا تھی تو لکھنے والے کی ذاتی اور مادی تعلیمات
 میں وہاں جو مادی راجع پر اس سے رہی کہ میں کوئی دلچسپی یا تنگ و باز زندگی میں جیسے کی کوئی تنگ
 - پیدا رکھنے میں جو سے ان کے عملی تجرید کے وہ مضامین "احتر شیری کی روایت" اور "

مہار جعفری وہاں سے کتاب تک" میں۔ صرف ہیئت کے دب میں استعمال کے مادی اصولوں
 کے بڑے کرائے مباحث ملتے ہیں بلکہ عملی طور پر زندگی اور دب میں روایت کی جانچ پر کھ کے
 عمارات بھی متعین کیے گئے ہیں۔ "احتر شیری کی روایت" میں ایک جگہ مہموں سے بہت کھل

کر لکھا ہے

”ہیوسن صحن آتے آتے راہی کی خواہش اور مغن اثرات نے عمل کی دیا ہے دور ایک انشا پسند۔ وہ راہی اور غلغلی موزن نظر بھی پیدا کر دیا تھا جو ن کے یہاں لطرت پرستی کے روپ میں، کسی کے یہاں حب سے بلات کی شکل میں، کسی کے یہاں فنی رنگیں میں اور والدہ کشدگی کے رنگ میں دو ماہو، جو، نجیریں سیاہی اور سماجی جدہ حد میں ٹوٹ سکتی تھیں وہ حیا لوں میں ٹوٹے ٹکس، ارباب الی جدید طاعری ہی سے اقبال، پکست، مہر میں آمدی، عظمت اللہ وغیرہ کی نظم نگاری اور صدی انڈی، بیکر پورن، سہو انصاری، سہو حیدر مدر، میر ناصر علی اور ریاض میر آبادی وغیرہ کی شکر نگاری سے تم کی مینا کاریوں سے محدود مدنی میں سے بن کھلنے اور اوقی اوب رکھے، اہوں کو صیر پٹے مست کر دیا، آج وہ کسی قدر پرانی ہو چکی ہے مگر اس وقت کے اپنی ماحر تمام کو جو وہیں کوئے خود مارے تھے، یورپ اور بنگال کے طور کی آمیزش سے یہ شراب و آتش، آتش میں جایا کئی تھی، اس کی جڑیں ریوہ مگر نہ تھیں، جس اور اور رنگیں کا وہ طوکل اٹھتا تھا، جو لوں کو مٹے جانے کے بے سیرے پایاں بن جاتا تھا، اس جاؤ گروں میں سے نص تو اپنی شہد بازیوں کا کرتب دکھا کر تھوڑے ہی دنوں کے بعد پٹے کے بعض کسی۔ کسی شکل میں دن کے ساتھ چھل پر چھل جھانے اور ان کے حر تحر کر شے آج بھی نظر بند کی رو رہے ہیں“

اس طویل اقباس کو قصداً اس لیے جاریں کے سامنے پیش کیا ہے کہ احتشام مسین سے روایت کے باب میں مختصر اور، پے خصوص ہے سنے اند، میں ان تمام میڈی، لوں کا مطالعہ کرنا ہے جو روایت کی تصویر اتنی در سماجی حقیقت کو سمجھے، جاچکے میں ہماری رہنمائی کر سکی ہیں، اپنے معیہ اور علامہ ر کے ساتھ ساتھ اس اقباس میں جہان روایت کے حلق احتشام مسین کے تنقیدی رویے میں جو قدرے فنی اور جدید و آج سے وہ ہیوسن صدی کے اندہ الی اپنی اور شعری رویے کی اس روش پر عدائے احتجاج ہے جو (محمد) ہندوستان میں جدید علمی، سائنسی اور عقلی باتوں میں ادب کے نئے حقیقہ پسند، اور سماجی شعور، جی کلینی رویوں کا قیاس کر رہے تھے لیکن ہمارے زمانہ پسند اس تمام باتوں اور اس کے خاصوں کی طرف سے آنکھیں بند کیے اپنا رک لاپے میں مست تھے۔ کوئی دھکی چھپی یا بین السطور کی ماسے ولی بات میں تھی اور۔ آج ہے اگر احتشام

میرانی کی ہوری تھی مقصد اس طرف توجہ دالنے سے یہ تھا کہ اسوں نے ادب اور شاعری کے صد مسائل پر اتنا کچھ لکھا ہے کہ ہمدی تنقید میں اس مقدار اور اس معیار کی تحریریں، احتشام حسین سے پہلے کسی نے نہیں اور۔ ان کے بعد آئے والے فلاں کے ہے جو احتشام حسین نے اس میدان میں کوئی ایسی گنجائش چھوڑی کہ ان کے تنقیدی اسوں ساری کے کام میں کون کتنے تشہر رہا ہو اور کسی دوسرے ہادے اس کی کو چور کیا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ترقی پسند تنقید نگارن کا کام احتشام حسین کے بعد بواہی میں یا ان کے قلعے ہوئے کو دوسرے فلاں سے متعلق کیا ہو اس طرح کی ہر باتوں کو اس وقت سے پہلے ہی پانچالیس سے تھیر کروں گا کہ اور اصل یہ ہے کہ احتشام حسین کے بعد آئے والے تنقید نگاروں یعنی مسٹر حسرت، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر سید عبد حقیل، ڈاکٹر قمر حسین، ڈاکٹر صدیق الرحمن، فدائی سے بطور خاص ترقی پسند تنقید کو اپنے رے کے جدید مسائل اور فلاںوں کے مطابق فی سمعہ سے آشنا کرنا اور احتشام حسین کے تنقیدی اصولوں اور عملی تنقید کے عالم اور مائٹنگ انداز کو بھی پناہ دینا، مثلاً حسین السخاوی صاحب اس باب میں منفرد ہیں کہ اسوں نے لاری و تدریجی جدومات کو بطور خاص رد تنقید میں دیکھا اس کے بعد سمت اور ہمد گیر پسووں کے ساتھ رہتا خود احتشام حسین نے مسٹر حسین کے اس تنقیدی ٹوکے کو بہت کھل کر اور پسندیدگی کے ساتھ رد تنقید میں اس کو ملا دیا ہے

بات یہ عرض کی جاتی تھی کہ احتشام حسین کی تنقید نگارن کا میدان سب سے بڑا ہے اور وہاں سے پہلے فلاں میں اسوں نے اردو تنقید کو مغربی تنقید کے پسو بہ پوسٹنویا یہ بات بھی عرض کی جا چکی ہے کہ تحقیق کاروں پر تنقید نگاری کے اثرات ویسے با راست۔ ہوتے ہیں اور۔ جو کئے ہیں جیسا کہ تنقید نگاروں پر ہوتے ہیں اس لیے کہ علم کے میدان میں دوسرے علوم سے اعداد و حساب کی گنجائش نظری طور پر ہوتی ہے اور ہمیشہ ہی سے یو جی جرائے سے چراغ ملتا آ رہا ہے۔ تحقیقی میدان میں بڑے اور اعلیٰ تحقیق کاروں کے علم میں ہم عصر تحقیقی مطالعوں سے اثر پذیرگی کی گنجائش پیدا ہوتی رہی ہے۔ اس میں سے کسی کو شاید ہی انکار ہو کہ تنقیدی نظریات اور عملی تنقید کا اثر بہت زیادہ برادر است ہی صحیح جلدیاد رہی صحیح ہو تا ضرور ہے مثال کے طور پر احتشام حسین نے جب کرشن چندر کی افسانہ نگاری یا سوار جعفری کی انتظامی شاعری پر مضامین لکھے تو اس مضامین کا اثر نے اس کے نگاروں اور شاعروں پر اس طور پڑا اور ست ضرور مرتب ہوا کہ اسوں نے اپنی تحقیقات میں ان خوبیوں اور خامیوں پر ان خود تنقیدی اسوں کے طور پر نظر رکھی جن کی مشابہت ان سے مسٹر فلاںوں کی

حسین کی عظمت ادب شعراء انوں لطیف میں اس روایت کی بات کر رہے تھے جو میں عمومی بلکہ عوام کے حال احوال کی سادہ دہیرا کر پیش کرنے کے نقطہ نظر پر در دے رہے تھے وہ اس بات کے شہسہ ہی سے قائل تھے کہ انوں لطیف نگار کی ذاتی و فنی خواہشات کا میں بلکہ عوام کے شعور اور فکر ہوتے رہے ، میں زندگی کو دے کا تو رو مند سامنے اور عملی جدوجہد میں ان کے راسخوں کو پر تشش سامنے کے قصاصوں کے ہاند میں ، میں مہذب کی برآمدہ کے کسی کو حق میں پہنچا احتشام حسین نے تخلیقی نظریہ ، روایہ تک جس صحابی رسائی میں وہ عاشق ان کی اس کارش کو ملتی ماس و اس کے معیار سے محروم کے خاص سماجی عمل سامنے کی کوششوں سے تعمیر کرتے ہیں اور اس نوع کی تعمیر و توضیح کے متعلق کسی طوں طویل بحث میں پڑنا تفسیح اوقات کے سوا اور کیا جو نکات ہے چنانچہ احتشام حسین سے بھی بھی اس بات میں بحث و مباحثہ کی کوئی راہ اختیار میں کی سنت وہ اپنی بات اپنے مخصوص دینی اور تخلیقی نقطہ نظر سے براہ کرتے رہے

موجود روایت کی مذکورہ بالا بحث کا دوسرا رخ سماجی حقیقت پسندی اور سوشلسٹ حقیقت نگاری کی طرف اہل فکر اور قارئین ادب کو متوجہ کرنے کا تھا چنانچہ ان دونوں مہض پر احتشام حسین نے صرف اپنے متعدد مضامین میں حسب ضرورت بار بار لکھا ہے بلکہ ان کے مضامین سادہ اور حقیقت دیا ادب اور ترقی پسند ادب کے دینی رجحانات اور سماجی تعمیر بحیثیت ادیب میں صریح طور پر سے مذکورہ بالا دونوں موضوعات پر ناکافی سو درکتے ہیں کہ گر قاری ان مضامین کو توجہ کے ساتھ پڑھ کر کچھ لے تو وہ بھی مدعا سمجھ کا شمار ہوگا

حقیقت میں حسین کی تخلیق نگاروں کے ایسے چند پسوا ہیں جو ترقی پسند ادب کی اہم و تقسیم اور مطالعے میں مبادی ایٹ کی حیثیت رکھتے ہیں ان مسائل کو توضیح اور سماجی طور پر کچھ طرکوں قاری ادب کی گہری اور حقیقت پسندی تقسیم کا دعویٰ میں رکھتا ہیں ۔ یہ سمجھنا چاہیے کہ احتشام حسین کی تخلیق نگاروں کا بار اور میں مسائل پر مایا اسوں سے دوسرے ادبی مسائل کو بالکل پس پشت ڈال دیا تھا ایسا میں بہ احتشام حسین کی تخلیقوں کی گہری عقل میں ہے حتیٰ کہ ان کی امید اس وجہ سے بھی کہ انوں سے قدیم و جدید ادب کی کسی صفت بجز ان صفات کے جو توجہ متحرک ہو چکی ہیں یعنی قصیدہ ، مثنوی اور تعصیب و توجہ اسیرش راہ روایہ کو نظر انداز نہیں کیا ایک اور ہم پسوا ان کی تخلیق نگاروں کا تخلیقی اصول سازی کا بھی ہے اور مذکورہ بالا تمام مضامین اس ہی ضمن میں آتے ہیں یہ تو یک محل محترمہ درمیان میں اکی اصل بات احتشام حسین کے تخلیقی دہش کی گہری اور

ترقی پسند تحریک اور احتشام حسین

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

پروفیسر سید احتشام حسین "جس کی یاد میں آج ہم میل جمع ہوئے ہیں ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے ۱۹۳۳ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے عربی، فارسی اور ۱۹۳۶ء میں ایم اے کیا۔ ۱۹۳۸ء میں انیس لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ملازمت مل گئی اور اس کے فوراً بعد دہلی یونیورسٹی سے اردو زبان و ادب کی طرف متوجہ ہو گئے۔

۱۹۱۲ء سے ۱۹۳۸ء تک اپنے بچپن، لڑکپن، جوانی، نوجوانی اور جوانی سے آگے بڑھ کر پہلی شعور و پائیدگی دہن کے درمیان "جس" "جھیں" "س" انھوں نے کس قسم کے مذہبی و فلاحی، شعری و ادبی اور سیاسی و سماجی ماحول میں گزارے، اس پر مختصر تذکرہ "ترقی پسند تحریک سے وابستہ میں ہو گئے۔ لیکن ہمیں بعض دوسروں کی طرح یکسریک یا علامتی طور پر "ترقی پسند تحریک سے وابستہ میں ہو گئے۔ لیکن بہت سوچ سمجھ کر اور پورے شعور کے ساتھ اس تحریک سے منسلک ہوئے ہیں تحریک سے ان کی وابستگی اور بعد ازاں اس کی ترمیم و ترقی کے سلسلے میں ان کی کوششوں کا پورا پس منظر ہے۔ انھوں

نے "بکس مال کا پھر مراد اس کا تعلق ان کے گھر سے رہا ہو، جو اکالج اور یوہوٹی سے، جو اپنے ارد گرد کی شہری زندگی سے رہا ہو، خواہ اپنی عمر کے تعلیم یافتہ جوانوں کی سمجھوتوں سے رہا ہو، خواہ فکری زبان، نیکے دماغی ادیب سے رہا ہو، حال ہیے مائل میں ہر ایک میں سے باہر نکلے گا۔ صرف ترقی پسند تحریک کی طرف جاتا تھا کہے کا مطلب یہ ہے ترقی پسند تحریک سے احتشام مسین کی "پچاسی" میں کسی مضمراری یا اشاریاتی لکھنے کا نتیجہ۔ قلمی حکم پارے اور نکلے کے بعد انھوں نے یہ فیصلہ کیا تھا

"میں ترقی پسند مصنفین میں غالباً ۱۹۳۵ء میں مل میں آیا تو بھی ایک ایک وجہ میں میں جتنی اس کا بھی ایک پورا میں منظر ہے، اختصار کے ساتھ میں تو یہ کہوں گا کہ جسے ترقی پسند تحریک کا نام دیا جاتا ہے وہ دراصل جنگ عظیم کے بعد رہا ہوئے دے سماجی و سیاسی واقعات کے تاریخی رجحان کے ایک ناگزیر رخ تھا۔ یہ رخ جو ہماری تاریخ میں شعرا و ادیب سے وابستہ ہو کر ماسے آیا جنوں پیش میں جنگ عظیم سے بھی دو حال پہلے، ابھی بیسویں صدی کے آغاز سے کر دیں جیسے لگا تھا

علاؤ اقبال کی مشہور طویل نظم "گلہ" جو ۱۹۱۱ء میں منظر عام پر آئی، ایک انقلابی نظم تھی، انقلابی اس معنی میں کہ اس کی اشاعت سے جنگ عظیم مدعی حلقوں میں ایک تسلسلہ چلا دیا، اس کا موضوع اگرچہ شہرہ الفیض حالی کے مسدس سے ملتا جلتا تھا، لیکن علاؤ اقبال نے حالی کی طرح قوم کا دکھلاتے ہوئے صرف مساجد نہ لکھی تھی بلکہ وہ شاعری میں پہلی بار "علاؤ یاسین بندہ و عدا" کا آغاز کر کے اس علامہ بزرگ کو توڑ دیا تھا جو نصیرت سے محروم علی سے سوئے جدا و رہندے کے درمیان اپنے مفادات کے نقطہ کے لیے مال بامال سے کٹری کر لکھی تھی

اس نظم کی اشاعت پر اقبال کا گہرا دلچسپی کے جو نقطے ملتا رہے کہ وہ تاریخ کے صفحات میں محسوس ہیں۔ اقبال کی بڑی اس بات میں ہے کہ وہ ان انھوں سے مرعوب ہوئے اور انھیں درخور اعتناء ہونے کے مسائل ملت کے باب میں فکر و تخیل، توجہ اور تامل کا جو حکم نہیں دینا کے عظیم ترین آدمی سے قرآن کے حوالے سے رہا تھا، وہ ہر صحرے کے تابع رہے اور یہ ہے کہ اس سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ "ہائیں دلی حوں" پاس گرہاں داختم" اس کا پیغام لکھ کر عمل فانی ملح و دراصل ملح دونوں پر ہی رہا کہ

کلمہ بیدار ۵۵ منظر صنف
 ۶ ۷ ۸ ۹ ۱۰ ۱۱ ۱۲ ۱۳ ۱۴ ۱۵ ۱۶ ۱۷ ۱۸ ۱۹ ۲۰

من نہ گویم ازین دیوار شو
کافری چاکست زرد شو

عمل سے زندگی سختی ہے جنت بھی جسم بھی

= حکایت اپنی نظرت میں - مہدی ہے - مہدی ہے

جس زمانے میں علامہ اقبال نے اپنے عہد کی مدہنی ہوئی دنیا کو سامنے رکھ کر دین کے حوالے سے اردو شاعری کے انقلاب میں "تنگو" کے نام سے ایک جہرہ بھیجا تھا میں اسی زمانے بلکہ اس سے بھی عین سال پہلے ۱۹۰۸ء میں مولانا حسرت موہانی نے "سیاسی حق پرست انقلاب کی سرخیوں و سہمی تھیں اور دوسرے مغل، میں مہراج و سرکار دارانہ نظام کے خلاف بہت حد احتجاجی لہجہ اختیار کر یا تھا۔ مہراں کا یہ سچ و سچ کی مشقت کے بلوغت، اس کی آخری سانس تک برقرار رہا اور ان کی س باہمیہ سوچ اور روش مثلاً عملی زندگی کے حوام سے ملے کر خواص تک سب میں ایسی روح انقلاب پھونکنے کی پورے سماجی و سیاسی ماحول میں ایک بل چل کر پیدا ہو گئی اس بل چل میں بلند آہنگی اور انقلابی لہجے کی گھن گرج کی جو کہ تھی، وہ شاعر انقلاب جوش طبع آلود نے اپنی شاعری سے پوری کر دی مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر کے احکامات اور ان کے بعض اداریوں نے پڑھے لکھے حلقے میں آراوی و ریداری کی ایک سرود ڈالی تھی

میں وہ رہا ہے جس میں مٹی پر ہم چند عورت کی عام بھائے حیات، کسٹوں کی حسد عالی اور دوسرے عہدوں کی پائل کردہ معاشرت کی اصلاح کا علم، بھائے جوئے سے آگئے اور انداز انسانہ دروازہ اولیٰ ہی سے ہر عظیم پاک و نادر کے صرف اولیٰ حلقوں کے لیے نہیں، بلکہ سارے سماجی طبقوں کے لیے بھائے انقلاب و سیدہ اصلاح بن گیا۔

اس طرح اردو کا مدہ نظریاتی و ادبی شعری، ترقی پسند تحریک سے مست پہلے حقیقت نگاری، اور اپنے عہد کی ترجمانی کی راہ پر دوں دوں جو گیا تھا۔ اللہ اور ان کی اولیٰ شرا بھی تک ان رنگت سے تقریباً محسوس تھی لیکن ابھی مولانا حسرت موہانی، علامہ اقبال اور پریم چند کو چھٹی اور س کے حوالے سے اپنے کام کا آغاز کیے ہوئے مشکل سے دس چندہ سال گزرے ہوں گے کہ علامہ یازنچہ پوری مرادوی ۱۹۳۳ء میں بدستور فکر کا علم ہے جو بے میدان میں آگئے اور اردو شری اس فکر، بغیر

روایت و جس کی ماسر سید نے مٹی تھی اور سر کو ٹلا بے توانا مانا
 پروفیسر احتشام حسین نے مارچ ۱۹۷۳ء کے "نگار" میں مت تصحیح لکھا ہے کہ
 "یارن تو۔ کے اصل موضوعات مذہب اور بے رحمی کے نظریہ ایک
 دوسرے الگ الگ دائرے میں ہیں جس یاز کے طے کھر میں "راہی حیلان کی منزل پہ
 پہنچ رہے ہیں اور ادب میں میرت کبیر نہیں دیکھ رہی تھی اور سر سید کی عقلانی
 اور ترقی پسندی کی عقلی عریکوں کے درمیان میں قسم کی کلیت پر مبنی روایت لکھ
 کی نمود ہوئی اس کی سب سے نمایاں مثال یاز نے پوری تھی حیلان سے ادب اور فکر کو وہ
 بے مانی عقلی میں کے بغیر نہ لکھے وہوں کے فلم میں وہ شوقی اور قوم میں دعاقت
 مشکل سے آنکلی تھی۔ جس کی اس وقت صدارت تھی۔"

تفصیلاً کہ یاز نے پوری نے اپنے خلاف فکر کے ہتھوں اور خلاص کے پہلے پہلے مصلوں کے
 بلوچہ آزادی دہس و فلم کا آؤ رہے دھندہ کھا، ہر قسم کی دہلی تاریکی کی دو میں علم و فکر کی ایسی مدخل قدمیں
 روشن کروں کہ شاعری و فلسفہ کی طرح اور ان کی اپنی شکر کا پس بھی جتنا اٹھا
 یہ تھی اور ان کی وہ شاعری و ادبی عصا میں میں پروفیسر احتشام حسین پہلے بڑے اور اس شعور کو
 پہنچے اور جس نے باشعور دہسوں کے لیے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے، ملے جٹھ کر مسائل حیات پر
 سوچا اور اس کا حل تلاش کرے کی راہ ہموار کر دی تھی عام سیاسی ادب اس کام کے لیے اور سازگار تھی
 پہلی جنگ عظیم کے بعد برطانوی سامراج نے اگر ان کی وطن کے مسئلے میں جو وعدے کیے تھے وہ
 پورے نہ کیے تھیں تحریک خلافت کے نام سے ہندو مسلم اتحاد قائم ہوا اور ان کے اجتماعی مصلوں سے
 پوری ادب و ادبی اس میں کافی پیدا کرنے کے لیے مصلی لال نہ کہیں قائم ہوئی اس کے نتائج بھی
 کارگر ثابت ہوئے تھے تو کول میز کا طرے طلب کی گئیں جس برطانوی حکومت کی بددلتی کے
 جب ان کا مطالبہ دیا۔

ادھر ایشیا اور یورپ کی شمالی ممالکوں میں اشتراکی ممالکوں نے رد پکڑا اور ان کی برہمنی
 ہونی تو انوں نے پاک و ہند کے ممالکوں میں غیرت و محبت کی ایک تہذیب مدح و تحکیم دی۔ ظاہر ہے کہ ان
 حالات کا اثر میں طبقے نے سب سے زیادہ قبول کیا وہاں بڑے گھمے جو جواں ممالکوں، باشعور لکھے
 والوں، شہر کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں اور قسبات و دیہات کے لوگوں اور عام خود
 کشوں کا طبقہ تھا۔ ان سب کی سوچ میں ایک طرح کی جہاد اور بغاوت یکساں پیدا ہونے لگی چنانچہ

رطابوی سامراج کے عالم کے ساتھ ساتھ حق نظموں کی تحریکوں کا حصہ جسے میں یکساں طور پر
 دیکھنے لگا تو اس میں ہم جیل رہ کر قوی ہوئے، ابھی خود بخود ہموار ہوئے لکھیں، پھر ان راہوں کو بہتے اور
 منظم کرنے کی ضرورت بھی محسوس کی گئی

سیاسی حیر و امید، مذہبی تنگ نظری و عصیت، طبعی کوشش و کشمکش اور افلاس و
 جماعت کے عدلوں سے بھرت والے کاموں رکھے والی یہ لکھا، اور سب اور طبعی دلوں پر بڑی تیزی
 سے اس انداز پر ہی تھی، چنانچہ ترقی پسند تحریک کے قیام سے صرف پانچ سال پہلے ۱۹۳۹ء کے نگار
 میں، محسوس کو رکھ پوری فائدہ معصوم "زندگی" کے عنوان سے شائع ہوا، اس میں زندگی اور ادب
 کے تعلق پر پہلی بار فکر انجیر بحث کی تھی اس بحث کا سبب ادب یہ تھا کہ ادب کا رشتہ زندگی سے
 جتنے مضبوط ہوگا، اسی قدر ادب تو زندگی کے حق میں جائے گی۔ اس معصوم کے چار سال بعد یعنی ۱۹۴۳ء
 میں پانچتر حیر حسین سے پوری فائدہ معصوم "عنوان" "ادب و انقلاب" پہلے جدی ماہنامہ "شومرا"
 لکھنے میں چھاپا، پھر مزید دستوں کے ہاتھ میں معصوم جونہی ۱۹۴۵ء کے سال "ادب" میں "ادب و
 زندگی" کے نام سے منظر عام پر آیا، جس کی چار رسوں کے نگار، انجمن ترقی پسند معصوم کے قیام
 سے پہلے اردو کے "ادب" میں آیا، اور ۱۹۴۲ء میں "انگلے" "نئی کتاب کی شاعت
 سے ہوا، انگلے سے ایک دست بڑے قطعے میں ایک ایک کی نگاری حاصل کے طور پر اپنوں کی طرف
 سے بھی اس کے معصوم کو بی ضرر کے گاہی دی گئیں اور یہی ہاتھوں نے تو یہ کیا کہ کتاب صفا کر لی
 اور اس کے معصوم دانشور کو لاپس تھوڑا مٹھرایا، لیکن جیسا کہ مولانا محمد علی جوہر نے، ایسے موقعوں
 کے لیے کیا تھا۔

دلت ہندو اور مسلمان

ہم سب نے لطف بزم تھا سڑا کے چہ

وہی ہوا انگلے کی افادت اور اس پر پابندی کے بعد پاک دھند کے لکھے والوں کے دلوں
 میں ایسا انقلاب آیا کہ حیات کو منظم کرنے میں در نہ لگی ۱۹۴۵ء میں انجمن ترقی پسند معصوم کے
 نام سے ایک سلسلہ سلسلہ مستقل ادبی تعلیم منظر عام پر آئی اور پھر یہاں کہ دوسرے نام محدود ہر
 جوں سال ادبی قلم کے ساتھ پروفیسر احتشام حسین بھی انجمن ترقی پسند معصوم سے منسلک ہو گئے
 اور مدت حد ایک سال بعد نظر ادبی و ادبی کی حیثیت میں انجمن کا اعلیٰ نشان بن گئے
 پروفیسر احتشام حسین جیسا کہ اوپر کی تفصیل سے ظاہر ہے انجمن ترقی پسند معصوم کے

انہوں یا اس کے دیس رکھ میں نہ تھے، پھر محلی محسن کے حسیس میں ان کا کام کسی سے کم نہیں ہے۔ میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ جس خوش اسلوبی، مستعدی اور ہمت و دیوں کے ساتھ احتشام حسین نے انجمن ترقی پسند مصطفین کو علمی، ادبی حلقوں سے حدود، راپا کسی دوسرے نے نہیں کر دیا، مجھے کہنے کی جرات دیجئے کہ، محسن کو اس علم و فکر کی نگاہ میں معتبر مانے، عالمانہ دلائل سے اس کے ناظرین کا مدد کرے، اسے اصلی اثرات و نفوذ و نفوذ، بحث سے بچائے، نظریاتی اختراستندی اور حیرت بازی سے مات و ناتر تعمیر کی راہ پر لگائے، زندگی، ادب کے حقیقی دشمنوں کو دوسروں کے ذہن میں تارے، سماجی زندگی کے تاریکی و حادوں کو وقت و ماحول کے حوالے جانچے، پرکھے، ماسی، حاصل، اور مستقبل کو ایک رشتے میں جوڑے رکھے، حقیقی ادب کو سیاسی و سماجی حالات کا مظہر مانے، اسے حوالیاتی قدروں اور مثلاً افراد و پسووں سے ہم آہنگ رکھے، ہر رنگوں کو محسن کے اغراض و مقاصد سے روشناس کرے، ہم عمر ادیبوں اور شاعروں کو اعتدال و توازن کی راہ پر گامزن رکھئے اور نوجوانوں میں زندگی و ادب کے دشمنوں کا شعور بیدار کرنے میں جو کھلاؤ اور جستجو، کام احتشام حسین نے کیا ہے، وہ آپ اپنی منزل ہے۔

میں یوں سمجھ لیجئے کہ وہ، انجمن ترقی، مدد کے مولیٰ عبدالحق تھے، انجمن ترقی مدد سے عمڈوں ایجوکیشنل کالجس کی ایک شاخ کے طور پر مسمیٰ تھا، کئی برس تک ہستیوں اس کی آبیاری میں شریک رہیں لیکن آج ہے کہ انجمن کے لیے حقیقی علمی، ادبی خدمات مولوی صاحب نے انجام دیں وہ کسی اور سے۔ ہو سکتی ہیں کیفیت احتشام حسین کی ہے وہ، انجمن ترقی پسند مصطفین کے ہاتھوں میں۔ سنی لیکن اس کی تعمیر و توسیع کے حسیس میں علم و فکر کی سطح پر حلقہ مضبوط اور ناقابل تعمیر مورچہ احتشام حسین نے بنی ذات و صفات سے قائم کیا وہ کسی اور سے۔ بن سکا اس کا قلم دور اول سے انجمن کے لوہے کے لیے دھک، در، خرمی، ماس، ایک پورے اعتماد و سہماک سے چلتا رہا۔

میں احتشام حسین کو ذاتی طور پر نہیں جانتا، پھر بھی مطالعے کے وسیع سے خوب جانتا ہوں کہ وہ سولہ سال کی عمر تک شریف، مجلس، در، سلیم، الطبع، ادبی تھے، خوش ذاتی، خوش طبعی اور زندہ دلی کی ان میں کمی۔ تھی، لیکن علمی کی، در، ادبی کے حاصر ان کے مزاج میں سے قوی تھے کہ اعتدال سے تجاوز کرنا ان کے لیے مشکل تھا، حق کو کلاغ، اور یونیورسٹی کی طاعون، زندگی میں ہم دوسوں اور ہم جویوں میں رہا کہ طبیعت میں جو ایک طرف کا خروش، در، کھنڈ، پن، بیدار ہو جاتا ہے وہ بھی ان میں نہیں تھا کہ جو یونیورسٹی کی غیر صحتی سرگرمیوں میں وہ پوری دلچسپی لیتے تھے، ہر مسئلے میں غماز شریک رہتے

تھے، لیکن پوری تجدید کی اور حسنت کے ساتھ۔

عام سماجی زندگی اور علمی و ادبی انجمنوں کی نشستوں میں بھی بڑا شریک ہوتے تھے لیکن عنوان شیب کی ترنگوں، جوانی کی منگیوں اور مجمع کی غیبت کے تحت طلب میں جو ایک قسم کی غیر ضروری عدم تنجید کی یا خوشے سرور بازی پیدا ہو جاتی ہے، وہ ان کے ریل و یکھے میں نہیں آتی۔ شوق و حسنت و مدد و ملی و شائستگی کو ساتھ ساتھ لے کر پہنچتے تھے ان میں خوشی، اپنی سوگوار، اپنے جوش و خروش اور بے غم و مصداقہ پر فکرو پھیلنے کا قیاس و غریب ملکہ تھا۔ ان کی اس تنجید و ابتلا وضع سے دشمن ترقی پسند معصین کو مقبول عام جانے، اس کے مبالغوں اور ترسیلوں سے سکاہ کرنے کی تحریک کو موافق و مستعمل راہ پر لگانے میں غیر معقول کردار ادا کیا۔

دعا و دعا میں پرومیسر عقلمندان مسین کے کئی حوالے ہیں۔ انھوں نے شاعری بھی کی، انہیں بھی لکھے "ماہل و مستند" جیسا مصلحت افزا اور فکر انگیز سطرچہ بھی اردو کو دیا۔ انھوں پر مصرعے بھی کیے، اپنی مجلسوں میں، خطبے بھی دیے، مسالیت کی جانب بھی توجہ کی اور ترجمے بھی کیے۔ ان میں سے ان کا کوئی حوالہ کم حیدر یا منتخبات میں ہے۔ لیکن ہم اردو میں ان کا سب سے ترین حوالہ تنجید ہے۔

جدید اردو تنجید میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے۔ صرف ترقی پسند ادب کے حوالے سے نہیں بلکہ ادب کے عام حوالے سے بھی اردو کے نہایت ممتاز و متوازن فنکار ہیں۔ البتہ ترقی پسند ادب کے حوالے سے ان کا نام خاص خاص کے زمرے میں آتا ہے۔ انھوں نے اردو انشائیہ، ناول، غزل، نظم، ڈرامہ، داستان، تنجید اور نثر میں مسئلے و غرض کی حمد و ثناء کو ترقی پسند راوی نظر سے دکھا اور علم و فکر کی ایسی سند خلق سے اور ایسی مصلحتی دہلیوں کے ساتھ کہ تنجید کے باب میں ان کا شمار سخن مصلوں کے سوا، غالب کے طرفہ اردوں میں نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے تنجیدی فنکار کو عموماً ہر کلمہ فکر اور حلقہ ادب میں تلوار و قلع کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے گا۔

اس کا اعتراف تو سبھی کو ہے کہ سرسید کی علی گڑھ تحریک کے بعد اپنی ہمہ جہتی حلقہ اثر کے اعتبار سے ترقی پسند تحریک ہمارے ملک کی سب سے اہم اور بڑی تحریک ہے۔ ان دونوں تحریکوں کے ہمارے معاشرے پر ایسے دور رس اور دیر پا نقوش مرتب کیے ہیں کہ ان تحریکوں کا مقابلہ کسی تحریک سے نہیں کیا جاسکتا۔ ان تحریکوں کا طرز تنجید یہ ہے کہ دونوں نے، حیات و تنگ نظری اور تعصبات و توہمات کے خلاف حیات و علم و شعور پر مبنی ایک نشو و نما لائے۔ عمل مرتب کیا۔ اہل علم کو

صدیق اور میں دنیائے ناکل کرساٹی دسیا کی رنگی میں تند و تھک سے کام لے کر ترمیم دہی تدنی
تقدیر اور نصیبات سے نجات پانے کی راہ نکلی، تنہا سدا سے راحت پسند تھے بے دلوں محرموں کو
ایک ہی راہ سے دیکھا، چنانچہ اس طرح سرسید محرمک و شریعی سے ملنے کا ارادہ کیا
اور آج بھی چہ سلسلہ کسی۔ کسی شکل میں جاری ہے، بالکل ای طرح ترقی پسند محرمک بھی اور اول
عی سے مطلوب رہی اور آج بھی جس حضرت اس کو مدد ملے گا موقع ہاتھ سے سیں جاسکے دیتے
یہ بھی عجیب حقائق ہے کہ اس طرح سرسید محرمک کی ملاقات کا جواب دیتے، اس کا مدلل دواع
کرے اور اس کی افلاحت منوانے کے سلسلے میں مولانا مدلل سے آگے تھے بالکل اس طرح، ترقی
پسند محرمک کی مدد افلاحت اور مدد شریعی و مدد افلاحت کے لیے احتشام حسین مہدیان میں اثر ہے
مدد مدلل اور بہلول دلوں ملاؤں پر احتشام حسین سے یہ حکم اپنی اور کون کر سکتا ہے کہ کامیاب میں

رہے

ترقی پسند محرمک کے ملازمین کا پیدا کردہ تھا جو ادب برائے ادب کا شیدائی اور خیالی
باتوں کا رسیا ہوئے کے صاف ادب اور زندگی کو لکھم و طر و صبی مانے کو تیار تھا۔ یہ بات کہ ادب کو
زندگی کا ترجمہ یا رہنما ہونا چاہیے اس کو وہی کہہ سے بہر قومی و دہخردوں اور قلیہ و سنیات کے
سابقے میں حکمران ہوئے سے جان اور بے رن افلاحتی و شاعری جتنے تھے اور سماجی افلاحت سے
عادی اوس ملائے والی چکارے و شریعی کو ادب علیہ لکھتے تھے سرچند کہ ان میں بیشتر وہ تھے جس
کے بارے میں عالم کے محققوں میں کچھ جانتا ہے کہ

ان کے دنیوں کے ہیں چہ کوٹ انھیں کچھ نہ کو

جس آگے دنیوں کے یہ کوٹ اتنی دنی خدا میں تھے اور ان کا تو رہا تعلق تھا کہ اس کو
نظر انداز کر کے ترقی پسند محرمک کے صاف مشکل تھا چنانچہ جس ترقی پسند محققین کو رد اوس
ہی سے بحث مباحثے میں الجھا رہا تھا جس کے حار و ناچار ہے۔ یہ ہے ملوں کا جواب دینا چاہئے ان
ملوں کا عمل ہے ہوا۔ ترقی پسند محرمک کے صاف دلوں کے حرات میں یہ طرح کی شدت و قلی
اور جارمیت و دشمنی جگ پائی۔ ادب برائے ادب کے بہ ستاروں کی تعداد بہر نسبت رہی قلی و دھوں
سے محرمک کے خلاف ادب برائے ملا کام رہا تھا ان کے رویت ترقی پسند محرمک اور اس سے
مسک ہار شعر و ادب ہے وقت تھا، خلعت، مدد مولانا مدلی اور سرواڑی کا ریدہ تھا، عربی، فلسفہ
نگاری اور ضعیف تمدنی کا تھک تھا، نظریاتی حاد پسندی کا امیر اور حاد سیاسی مسک کا مسلح تھا، جلالیاتی

اقرار اور شعر و ادب کی لطافتوں سے عاری تھا۔

حقیقتاً یہ وہ لوگ تھے جو ادب کو محض لذت خوردی کا وسیلہ اور ایک طرح کا ذلیل سامانِ تفریح اور سماجی خوش چلنی جانے رکھنا چاہتے تھے لیکن چونکہ ان کے اختلافات و اعتراضات میں ربط و تعلق نہ تھی اس لیے ادب برائے ادب کی اساس پر قائم کیا ہوا ہے محاذِ تاویز قائم۔ وہ نکالنے کے ہوا کہ تھوڑے دنوں بعد ترقی پسند تحریک کے افراض و مقامات کی پرچھائیوں خود ان کے یہاں بھی نمودار ہونے لگیں بعض کے یہاں یہ عمل محض تقلیدی و مصنوعی اور ہوا کا سونگہ کر سستی مقبویت کے لیے تھا اور بعض نے ترقی پسند تحریک کے مقامات کو زندگی کی چٹائیوں کے طور پر قبول کر لیا تھا اس آخری شدتِ اقدام کی ترغیب میں دوسرے ترقی پسند نگار بھی شریک تھے لیکن اس میں اصل کامیابی کا سراغ حقیقتاً مشہور نویس کے سر نہ دھا ہے کہ ان ہی کی خواہش و توفیق اور ان ہی کے پیرو ادب و لکھنے نے ایک کی طاقت کا دور توڑا ہے

یہ ترقی پسند تحریک کی ابتدا میں بیرونی طاقت کا تحمل نہ کر رہا تھا لیکن چند سال کے بعد یہ ہوا کہ خود تحریک کے اندر کئی مختلف خیالات گروہ پیدا ہو گئے۔ تحریک کے مقامات کی وضاحتوں میں طرح طرح کا تناقض و تضاد پیدا ہو گیا، کسی نے اشتراکی نقطہ نظر کو بطورِ حاصل اچانے پر زور دیا کسی سے مارکسیت کے پرچار کو عین ادب جانا کسی نے آزادیِ قلم کے نام پر ہر قسم کی آزادی حتیٰ کہ لٹریچر کی آزادی اور عریالی کو بھی ادب سمجھ لیا، کسی نے ماس کے بارے ادب کے بارے میں "فرقِ مینے ناب اولیٰ" کا حکم لگایا اور محض ترقی پسند ادیبوں کے رہبر ادب کو حاصل ادب جانا بعض نے وہاں ادیبوں کے اصول و قواعد سے مدد بھی کر لی، انھار و الما میں ایک طرح کی افادگی کو جسم دیا جس سے ہر قسم کے موضوع و مواد کو اس کی بے معنویت اور کھردر سے بچنے کے موجودِ نوبت کا کام دیا جس سے ہر ایک تنگ نظری کے بجائے ادیب ہی کو جس طرح کا مشاء چاہیے ہی کو طاعری اور ادب سے تعبیر کیا، طرح طرح کے اعتراض و توجہوں سے دست کش ہو کر ادب کے تقریباً ہر شعبے میں عریالی و نظریاتی تضاد پسندی پر تیار اور راجح لگا کر ادب حقیقی معنی میں ادب رہا جانتا سمجھتا اور پروہیگز اس گیا

اس داخلی انتشار اور باہمی اختلاف کی شدت یہاں تک بڑھی کہ خود انھن کے اراکین ایک دوسرے کو انھن سے خارج کرے گئے بعض مختصر سفیدہ اہل قلم نے خود ہی اس سے سہارہ کشتی اختیار کر لی، اس صورتِ حال سے تحریک کے ملاحین نے پور زائدہ اٹھایا، نتیجتاً ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۱ء کے درمیان عشرے میں ترقی پسند تحریک کے خلاف مضامین کا ایک مستقل سلسلہ قائم ہو گیا یہ زمانہ

انھن ترقی معصین کے بے بری مشکوں اور انھنوں کا تھا اور اس میں اگر پروہیر احتشام حسین صبر عالم رہیں، ادب فطری اور درکسیت و جدیت کا چاشنی اور رتھے والا وہ ہے۔ اٹھاتا دیہی مٹوں کا دھڑ۔ رتا اور ادب و فطرتی فطرتوں کو پوری سچیدگی دے دے ہی سے بچا ہے کی کوشش۔ کرتا تو شاید ترقی پسند تحریک میں اعتبار اور قدر سے محروم رہتی جو آج اسے حاصل ہے

پروہیر احتشام حسین کے ترقی پسند محرک اور ترقی پسند ادب کا دفاع ہے بعض دوسرے ماحولوں کی طرف کسی حد تک اقدم سے طرے، فطرت نگاری کی حد تک یا بدبختی سے طرے طرے سے ہیں کیا کہ اپنے حسیوں پر ان کا طرہ و ادوات اور اس سے مختلف تھا، ان کی دفاعی تحریریں اور تنقیدیں ہیں ان کے رسم و طبع، لیکن بددل مسدو کے کو تو سیر و مل تھا ہی لیکن اسی کے ساتھ ساتھ سوں سے ترقی پسند ادب کی بدعت و ترقی کے بے جن بھندوں سے کام لیا اور حقیقتاً ان کے اعتدال پسند تنقیدی رویے اور اصول تھے۔ یہ اصول نیا تھے۔ ان پر ایک نظر دیتے چلیے

"ہر صہروں پر لکھے میں اکثر جھگڑ محسوس ہوتی ہے مجھے آئینوں کو نہیں لگے میں لطف میں آتا۔ جلی تک جو کتاب ہے اس سے بچاؤں میں چہا کہ میری وجہ سے کسی کا دل دیکھے کوشش کرتا ہوں کہ ہم صہروں کی حقیقت کے بارے میں سچے سچوں کا ذکر کریں انھیں دھند و صحت تر نکلتا ہوں اور انہوں میں بہت سہولت۔ لگا دیتا ہوں" (ادب لطیف جولائی ص ۱۹۳۳)۔ نکوالہ لہوں وہ لکھتو احتشام حسین ص ۱۲۹

"تجدد نگاری سے میرا مقصد ادب کی حقیقت اور جدیت پر غور رہا، شاعر اور ادب کو اس کی فطرتی کاش پر نظر کو اس صحیح شعور اور ادب پر دیتا اور ادب کو زندگی کے اندر رہنے میں دیکھا ہے" (نہار اور لکھتو احتشام حسین ص ۱۲۹ ص ۱۳۰) میں کہتا ہوں ادب کے بارے میں اس نے لکھتا ہوں کہ ادب کی طرف وہ بھی ادب ہے وہ بھی پڑھا جاتا ہے اور اسے پڑھا جانا چاہیے میں بھی اسے پڑھا ہوں اس کو لکھتا اور اس سے لطف لیتا ہوں" (نہار اور لکھتو ص ۱۳۰ ص ۱۳۱) جس کا ذکر ادب میں آیا ہے وہ تہہ ہے گا۔ تاہم سے مجھے کے بے اس جذبے کی بدلتی ہوئی تداعی اس کی رتیب اور قدیم اطلاق سے اس کے تعلق اس کے معاشی پس منظر کو ملاحظہ رہی ہوگا، غور کرتا ہوگا کہ اس کا اعتبار اس کی مشکوں

کی ساس پر احتشام حسین سے خواجہ معین بخش، گروپنک، کبیر دس، نظام الدین اویسا اور بعض دوسرے صوفیوں کے ہارے میں بعض ریاضیاتی تقریریں لکھ گئی تھیں جو قیام پورہ اور ہامی کا پہاڑی تنگ کما گیا تھیں۔ یہ بھی نہ ہانے کس کاغذ کے ہو گئے تھے کہ۔ تو کسی کسی سے منقطع ہوئے اور۔
اپنے راسے طے کو تیار ہوئے

لیفٹننٹ احمد علی کا کام قدرے آسان تھا وہ شاعر تھے اور شعرات و کلمات کے پردے میں ان کے لیے قلم کے میں دخل اور جڑ میں کل کو دیکھ دیکھا مشکل۔ تھا لیکن بحیثیت شاعر یا شاعر کا احتشام حسین کا کام بہت دشوار تھا۔ ان کے لیے حرفی پسندی کے عمل مضمون کو خود سمجھ دینا یا قلم کے میں دیکھ کر دیکھ دینا ہی کافی نہ تھا بلکہ دوسروں کو دکھانا اور سمجھانا بھی ضروری تھا۔ احتشام حسین سے یہ مشکل فریضہ بحسن و خوبی انجام دیا۔ صرف صبروں کو نہیں اپنوں کو بھی حرفی پسندی کے اصول مضمون اور اس کی عرض و غایت سے آشنا کیا۔ انھیں ان کی مہر و ادبی پروٹوکا، رادراست پر لگایا اور تحریر کی شیرازہ دہی کو بہر حال برقرار رکھا، مثلاً عرض کروں گا کہ حرفی پسند تحریر کے سب سے بلند قامت شاعر سردار جعفری و محمد جعفر سلطان پوری کو اگر احتشام حسین بروقت نہ نوکے رہتے، تو ان کی بددلی شاعری کا رنگ اور بعد کی شاعری کے بھی بعض جڑ جاتے ہیں کہ ان کی شاعری محض ہو مسلم کا جوش ثابت ہوئی، محض معرہ بازی و رمارکت و اشتراکیت کے باب میں نظریاتی پسند کا شکار ہو کر رہ جاتی، لیکن احتشام حسین کی تفسیری اور مخلصانہ عقیدے انھیں بچایا۔

سردار جعفری کی ایک نظم کے یہ دو مصرعے جدت سے بھرپور گئیے جو صورت و رنگ کا اپنے واسے ہیں۔

ہاتھ سے میرے، میرا قلم پھینک دو

اور مجھے ایک بددلی دے دو

اسی طرح محمد علی کی ایک غزل کا یہ مطلع اچیل کے اعشارتے دکھانا اور تو ناظر آتا ہے

اب جوں ہے وہ راحت پہنچی کہ اسے محمد

آج رگم سر بہتر دل ہے چوٹ کھائے سے

لیکن احتشام حسین کی ناقدانہ بصیرت سے انھیں ان شاعر کو عام اور ناقص ٹھہرایا۔

کے ہارے میں انھوں نے اشعار تیار میں رائے دی کہ کسی شاعر کو سب کے لیے فن نگاری ترک کر کے میدان جنگ میں چلے جانا اور قلم کو بھینک کر بددلی، مٹا دینا یا بیانی اور روایتی تصور کا نتیجہ ہو تو ہو۔

انکلی شہور کا تہہ میں ہو سکتا اس ہے کہ قلم کے مقابلے میں مدق، ایک کمزور ہتھیار ہے اور اسے قلم سے زیادہ قہر جانا قلم اور صاحب قلم دونوں کے مصائب سے حسری کا سراغ دیتا ہے مجروح کے شعر کو بھی انھوں نے خوبصورت سمجھا ہے کہ "سوئی ہے جس سے دہ پر جوت میں کھان دو سر پر جوت کیسے کھائے گا" سر پر جوت کھانے کے لیے دہ پر جوت کھانا ضروری ہے اس طرح کے ایک دو میں سیکڑوں مقامات پر احتشام حسین نے گرفت کی اور زنی پسند تحریر کے ارکان کو راد سے بے راہ ہونے سے بچایا۔

اسے بھی احتشام حسین کے کلمہ گہر یا ان کے کتب کی زمرت اور ان کا فیضان نظر کر لیجئے کہ احتشام حسین کے دہ پر جوت اور ان کے فوائد کچھ ایسے ہیں قلم سانس آگئے جنھوں نے ترقی پسند تحریک کی ترویج و تائید میں کم و بیش اسی قدر استعداد لال اور حیرانہ اظہار کو اپنی تنقید میں اپنایا جو احتشام حسین کی محرموں کا طرز امتیاز تھا میری مراد اس جگہ ڈاکٹر علوی، ڈاکٹر محمد مسن، پروفیسر مسٹر حسین، پروفیسر بھی حسین، ڈاکٹر سید محمد عقیل، صوفی، ڈاکٹر رفیع امام، ڈاکٹر قمر رحیم، ڈاکٹر ثواب، ڈاکٹر علی مدنی، ڈاکٹر عفا سیل، پروفیسر حقیق احمد، ڈاکٹر حنیف لونی، پروفیسر انجم، عصفی، ڈاکٹر محمد علی مدنی، ڈاکٹر سلیم اختر، پروفیسر محمد احمدی، پروفیسر راجہ مدنی اور بعض دوسروں سے ہے۔ یہ سب یکے بعد دیگرے ترقی پسند تحریک کی دعائی لائن میں شامل ہو گئے اور تحریک کو عصری تقاضوں کے خاطر میں دیکھے اور لکھے لکھے کلمے کی ایک نئی راہ ہموار کر دی تحریک کو کسی نہ کسی طور پر فعال و متحرک رکھا، اس کے شہر کے لیے کارہ مقامات پیدا کرنے کی کوشش کی اور احتشام حسین کی یہ رود تنقیدی روایت کو سر حال زندہ رکھا۔

احتشام حسین راد کے ان دہروں اور فائدوں میں میں سے میں سے ہمیشہ۔ جاننے کہیں ایک خاص طرز کا نگار غصوں سے تھا اگر میں یہ کہوں کہ مدیدہ راد تنقید نگاروں میں دوسرے سب سے زیادہ محبوب و پسندیدہ تنقید نگار ہیں تو سچہ جاہل گائیڈ اس صاحب ان کا لکھا ہوا "مدیدہ راد" تنقید نگاروں میں جس کا ذکر ہر میں سے کیا ہے نہیں خیریں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں ذاتی طور پر پروفیسر احتشام حسین سے بالکل بلا تکلیف ہوں۔ ان کو دیکھا۔ ان سے کئی ملاقات ہوئی اور نہ کسی ناخوشگوار تمنہ۔ ترقی پسند معصوم کا کہنا ہے کہ "مدیدہ راد" تنقید نگاروں کے "نگار" (انکسوم) میں جب ان کا ایک خاص مضمون "مدیدہ راد" کے عنوان سے شائع ہوا اور اس میں یہ مشورہ دیا گیا کہ وقت کے تقاضے کے مطابق ایسا کوئی نیا رسم الخط اپنی ہی میں لکھا جانا چاہیے تو اس وقت

میں سماجی اہمیت رکھتا ہے اور کن شکلوں میں محض لکش نگاری بن جاتا ہے (ادبی
ادب اور شعور میں، مطلوبہ اور ضروری اور (تھوٹو ۱۹۵۵ء)

"ایک تصور حیات کچھ دلوں تک جا رہے کے بعد، انا بوجھا ہے اور بار
بار کے تصادم سے اس میں نئے، دیے پیدا ہو جاتے ہیں، اچے مواقع تو سرعت آنے
رہتے ہیں جن میں جدلی ہو سکے، لیکن جب کوئی نظام ہے، پھیلے اور بڑھے کی طاقت
نکھوڑتا ہے اور مختلف عناصر رکھے، دلی قدروں کو اپنے میں جگہ نہیں دے سکتا، اس
وقت تدریج انقلاب کے دور سے گزرتی ہے اور نئی قدروں کا راسخ سوجھتی ہیں (ادبیات و
بلاغت میں ۱۱۲)

"ترقی پسندی کچھ بھی نہیں ہے، مگر کسی حد سے نئے اصول کے تحت
ہر مسئلے کا فیصلہ کر دیتی ہے، انسانی شعور کی تنقید کہوں کو سمجھا کر انکار کے حل مقصد
کو دھونڈ لگاتا، اس کے من کے محرکات کا پتہ لگاتا ترقی پسند تھوڑا سا کام ہے" (۱)
تنقید اور عملی تنقید میں (۱۹۵۱ء)

"ادب کی تخلیقی تنقید کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ تھوڑا بھی
ادب کے حیرات کی حیرت کو دھونڈ کر اس کی دبی کاوشوں پر اعلیٰ دبی رنگ میں افسار
جہل کرے اور ادب کے سماجی شعور کا جائزہ لے، من کی رائیوں پر نگاہ لے اور عام
پڑھنے والوں کی رہنمائی کرے (تنقید اور عملی تنقید میں ۲۷ء طبع ۱۹۵۳ء)

"ترقی پسند تھوڑا قدریم ادب کی اہمیت سے کسی وقت بھی انکار نہیں کرتا
دوست پر مکتا ہے، اس سے غلبہ حاصل کرتا ہے، دوست سے اس سے، اس کے مزاج
فلسفہ حیات اور مختلف نظریات کی چھان میں کرے گا متعلق ہوتا ہے کہ تعلق کس کردہ
سے تھا، ان کے علاوہ اس معیت کو حل کرنا چاہتا ہے، انہوں سے منشی اور دوسری
بیادوں کی وجہ سے، مکتا، رہبر سے خوف زدہ علامات و علامات کی شکل اختیار
کر لی (تنقید اور جائزہ میں ۱۸۹ء)

"ادب میں رہنمائی اس طرح میں چل سکتی جیسے رہنمائی کر امت کی،
میرے مزید کی، یا پھر ملار ہے سپاہوں کی رستے میں، میں یہی رہنمائی کی
جدلی اور شخص، پہلے کا سوال بھی میں ہے، یہ رہنمائی، معیار اور اقدار کی باہم مشغول

میں سے ان کے مضمون کی رد میں ایک مضمون لکھا ہے مضمون امیر اہلادی مضمون تھا۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء کے ٹکار (کنفرس) میں شائع ہوا۔ اعتقام حسین صاحب صاحبہ کے بجائے مجھ سے خوش ہوئے۔ یار صاحب سے میرا پتہ حاصل کیا اور مجھے حوصلہ افزا لکھا۔ مجھ پر ان کے تحسینی کلمات کا یہ اثر ہوا کہ میں سبید کی سے رد تحقیق و تنقید کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ایسے میں اگر میں یہ کہوں کہ مجھے دہ کی طرف لائے والے حقیقتاً اعتقام حسین صاحب میں تو ملتا ہے۔ ہوگا

میں کے بعد دو چار خطوط کے مبادیے درج ہوئے۔ ان کے ایک خط کا ایک فقرہ مجھے بتا جاتا ہے اور خوبصورت لگا کہ میں سے سے شعوری یا لاشعوری طور پر پہنچی یا یہ فقرہ ان کے اس خاکہ ہے جو انھوں نے میرے ایک دعوے کے جواب میں معذرت کرتے ہوئے امر کہ جانے سے کچھ دلنا پہلے لکھا تھا فقرہ یہ تھا۔

یہ معذرت ظاہر ہے نہیں امر واقعی ہے۔

یہ فقرہ میرے بعض دوستوں کو میرے حلوں میں ملے گا اور میری سہ دوری کا ثبوت دے گا۔ اتنے کہیں سے کہیں جا لگی، جتنا صرف یہ چاہتا تھا کہ اعتقام حسین صاحب سے میرا کبھی کوئی ذاتی تعلق نہیں رہا لیکن مطالعے کی حد سے میں نے انھیں جانتے پہچانتے کی پوری کوشش کی ہے۔ درمیان نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ اپنے عہد کے ساریت معتمد ستون بن گئے ہیں۔ در ترقی پسند تحریک و کلامت جس خوبصورتی اور ناقص نہ بصیرت کے ساتھ انھوں نے کی ہے کسی دوسرے سے نہیں کی

ارتقاء دستیاب ہے

لاہور

گلشن بک ہاؤس

مرنگ روڈ

کی شکل میں ہوگی اور گھٹنے کی کوشش میں ہوگی کہ کیا چیز کسی سے بہتر ہے، حکم دے،
 لٹکائے اور نگلی تمام کر اپنے ساتھ چلنے سے میں ہوگی، راستوں کو ہموار کر کے
 بندھیں، میں چراغ طارک، فوجی دھجی یا میں کرتے ہوئے اپنے ساتھ چلنے کی کوشش ہی
 میں اچھا دوسرا یہ ہوگا " (۱۶) (۱۷) (۱۸) (۱۹) (۲۰) (۲۱) (۲۲) (۲۳) (۲۴) (۲۵) (۲۶) (۲۷) (۲۸) (۲۹) (۳۰)

"ترقی پسند ادب نہ تو یہی ہے۔ لٹریچر میں ہی اس کی حمایت کرتا ہے۔
 ادب سے بیزار ہے، نہ لٹریچر کی توہین اس کے مسلک میں شامل ہے۔ - شکل و طوالت
 کری۔ - فن و دہشت پسندی کو زندگی کے شعبے میں جگہ دے، بلکہ زندگی کی کشمکش
 میں اس بات کے لیے جو ترقی پذیر عناصر ہیں، انھیں حکومت پہنچاتا ہے " (روایت اور
 طاقت ص ۱۳۸)

"ترقی پسند ادب بدلیسی نہیں، لٹریچر اور عریض کا حالی میں، فن و فحش
 کا دوست نہیں، مزاحیہ کو اپنا کام یا بیچو اس میں گھٹا، ادب کی توہین اس کا مسلک
 میں، جن نئے ادبوں کے میں یہ مابین نسبت میں پائی جاتی ہیں، ترقی پسندی
 انھیں اپنا نہیں بنا سکتی " (روایت و طاقت ص ۱۴۰)

حجید کے مندرجہ بالا اصول اور رویے بتاتے ہیں کہ پروفیسر احتشام حسین نے اپنی تحریر
 کے بارے میں یا حاکمانہ رویوں سے نہیں، بلکہ حدود و معطل رویوں، اصولیہ و شعوریوں اور دل میں گھر کر
 جانے والی باتوں سے ترقی پسند تحریک کا جنم کیا ہے

پروفیسر احتشام حسین مزاجاً گود مٹا کر، شاعری کے نہیں، مد نہیں تھے، مولیٰ مثل حدود
 رو، لیکن ریلی دوسروں کی منظرین سے بے پروا اور اپنے من میں ہاں دس من میں من ان دونوں
 کو حیدروں سے زیادہ خود نفس ترقی پسند تحریک کے منظر میں سے مدد ملتا تھا، کسی نے انھیں
 بروں و کشمکش، کسی نے مابین پرستی و رحمت پسندی کی نسبت لگائی، کسی نے تحریک سے مسلک
 شاعروں اور ادبوں پر لکھنے سے دانت کر کے الزام لگایا، کسی نے بد نسبت اور اشتراکیت کی کھل کر
 چلنے۔ کرے کا وعدہ دیا، کسی نے مرثیہ، فحش نگاری، بے باک حقیقت نگاری اور محض پروپیگنڈے کو
 ادب۔ تسلیم کر کے کو میں کی تنگ نظری سے تعبیر کیا، کسی نے ان پر ترقی پسند تحریک کے مفاد
 سے دانت کر کے اور اس کے مفاد پر دانت کر کے الزام لگایا، کسی نے ان کے رام اور مدحم سب دیکھے
 کو تحریک کے لیے ہم نوا کر دیا، میں تک کہ جب دوسری جنگ عظیم کے بعد السیت اور السان و مدتی

نیک
خواہشات
کے ساتھ

دادا بھائی سلکٹ ملز (پرائیٹ) لمیٹڈ

سید احتشام حسین کی تنقید نگاری

سید محمد عقیل

مجھ میں نہیں تھا کہ مات کمال سے شہد کی جاے سید احتشام حسین کی وفات کو
 فکر یا نہیں اس کر چکے ہیں اس عرصے میں اردو تنقید میں کتنے سارے چمکاتے آئے ہیں، مگر احتشام
 حسین کی تنقیدوں کا چارہ اس کی وفات کے بعد متعدد مصروف میں نئی مخلوق سے پایا کہ اس وقت
 یہی معلوم ہوا کہ اس وقتوں سے بہتر احتشام حسین کی تنقیدوں میں اور کیا تلاش کیا جاسکتا ہے مگر اب
 جب کہ حدیثیت اور یوگرنی مخلوق کی رہ اور محضانہ بقی ہے، ایک مرتبہ مگر احتشام حسین کے
 تنقیدی نظریات، ان کی عملی تنقیدوں اور ان کے گہری حجت پر مبنیہ، کچھ باقیں ضرور آئندہ کرے گی
 اور اگر جانتے جیشہ کی پابنت صحیح ہے کہ ”فلا کی اہمیت اس میں نہیں کہ سب اس کی بات مان
 لیں اور نہ کہ سب اس کی بات نہ کر دیں“ آئندہ اس کی اہمیت اس سے واضح ہوتی ہے کہ فلا کی اگر کو
 بار بار بحث میں لایا جائے، تو اس نقطہ نظر سے احتشام حسین کے فلا نظر اور ان کی تنقیدوں کا، مگر
 سے جائز دست سے معید تاریخ نہ کر سکتا ہے۔ آج کی تنقیدی حوالہ بندی کے حالات سے احتشام حسین کی
 تنقیدوں میں تضرع نظر کی جی ہے اور دین سلامت بھی، اپنی تاریخ بھی ہے جو تاریخ سے ملے کر
 سہا جیات علم، فلسفہ اور تمدنی تاریخ سب کا احاطہ کرتی ہے اس کی تنقید میں دوسروں میں بھی ہیں جو

تحقیق اور تعمیر کے راستوں سے ہمہ تن اور طبعی صورتوں، سب سے دب اور اویس کا عارضہ بنی
 میں احتشام حسین کے ساتھ بقیہ و تہجدی صورت میں عام میں ہوں تھیں جو جدید تخلیقی رویوں تک
 صاف میں جسکی تمام مشرقی اور مغربی تخلیقی اور ادبی رویوں کو مدد کرے کے لیے علم و علالت
 (semiotics، ساختیت Structuralism) اور اضمحلال (Deconstruction) کا نام دیا جاتا
 ہے اسے جدید امریکی تخلیق سے بطور خاص پایا ہے۔ اس میں کہ احتشام حسین کی تخلیقوں میں فکر و رائے
 طرف کے تخلیقی صوفے موجود ہیں۔ میں کہوں سے دب زندگی اور تاریخ کے مطالعے سے حاصل
 کیا تھا

احتشام حسین سے چاروں سفر، انسا، نگارنی سے شروع کیا کہ اس وقت ہم طرف بھوں
 کے مسائل کی دھوم تھی۔ اسے پر، مہرہ بھی تھا، بے حقے مگر پر، ہم چند کو مسلم مذاہن نکلاں
 مسلمان Elite (جدید نکلاں میں درجہ تھا۔ ان سے احتشام حسین کے انوں میں نظریں طور پر بنا
 محسوس ہوتی ہر طرف بواحد ہی تھی۔ چونکہ ہر صحت سے بے ویز ان میں کچھ روایت اور کچھ کہ
 صحت ناشوق نظری ہوتا ہے اس لیے احتشام حسین سے بھی بیز کے درمیان مسائل سے متاثر ہو کر
 متحد اسے تھے جیسا کہ انھوں نے یہاں تھے بولے ہے ایک مضمون میں ان کا عبارت بھی یہاں
 ہے کہ "ان زمانے میں نگار، دریا، صحت کا جلا، اولیٰ دوم، پر چل گیا۔ اس زمانے میں جو اسے
 تھے سامنے۔ صرف ان کے ایذا صحت کے بعد انہیں کے قتل کرے کی کوشش کی بلکہ حیالات
 و کیفیات کی نیس میں بھی کسی کی بیرونی کی اعتبار نظر بیز صحت ایکہ جائزہ اور ایک سما
 بنا ہے۔ لگا و گھج یا اور بھارت اسے تھے کہ ایک عموماً "دن" کے نام سے
 "نہ" سے یہ بھارت میں ہے۔ "احتشام حسین۔ صحت بھارت بھارتی کی طرف سے اس لیے
 "نہ" سے ان کی اصاحت انھوں سے اعتبار نظر میں ایک اعتبار کے جواب میں ان طرف کی
 ہے

"تخلیق کو خاص طور پر اچانے کا سبب بنانا ہے۔ ۱۹۸۸ء میں

درست میں یو یو رتی میں پر صحت کی نتیجہ ہوا کہ پر صحت کے لیے کچھ زیادہ ناقدی
 سے پر صحت طلبوں پر محسوس اپنی رائے مسلمان کرے کے بجائے انھیں ان صحتوں
 سے حیالات سے واقف کرانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بہت سی انی سید محمد یوں کو
 پھر پھر اس لیے کچھ اصولوں کی تلاش شروع ہوئی کسی طرف دلائل میں بہت تھو

حکایت میں جس کا ذکر کیا گیا، اس میں ہر طرح کے مباحث غصہ کے ہیں اور اصولی طور پر ان کے جوابات بھی وہی تھے ہیں اور اس طرح ترقی پسند اپنی نظریات کی تلاش اور مضامین، مباحثوں، مضامین میں دیکھی جاسکتی ہیں اور ہمیں سے ان کا شعوری طور پر المقصد جمہوری سطر شروع ہوتا ہے ان میں سے کچھ، میں ایسی میں جو میلائی ہیں اور آج تک ترقی پسند ادب کی کیا، تمام ادب کے ترقی پر اور باہمی ادب کی اس پہ، اس ہے اور تمام ادبوں کے ہے مگر یہ ہمیں قابل طور میں ملتا

۱ "ادب مقصد میں وسیع ہے، اس کی میں متحرک ہے، جامع نہیں
تغیر پذیر ہے، اسے عقیدے کے چند مفروضہ، اصولوں اور نظریوں کی حد سے نہیں
کچھ جاسکتا کہ ایک فلسفہ، تحریر ہی کام آسکتا ہے جس کی میلا تا تاریخ کی ہر ترقی
اور ارتقاء، مقصد کے اصولوں پر مبنی ہو" (ادب و تخلیق حارے)

۲ "ترقی پسندی کہ ہماری حقیقت ہے، اسے معاشی یا معاشرتی
تبدیلیوں کی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے، اس تغیرات کے باہر اس کا صرف ایک
موجد، تخلیقاتی تصور، رد چاہے گا اور یہ تصور تغیرات کے گھمے میں مدد کی دیتا ہے
ملک اور ہر دے کا ادب، اس حد کے رجحانات کا شعوری یا غیر شعوری پتلا ہے، اس
کے تحریر میں معاشی اور معاشرتی حالات کا اثر، صورت و حال دے گا" (تخلیق حارے
ملک ۳۳ پلاڈیشن)

۳ "ہر لمحہ بدلتی ہوئی وہ متحرک دنیا میں حقائق کی اصل و حقیقت کا گرفت
میں لگنا انسان میں وہی فن کار یا ادب اس سے بھی طبعی صورت اور آہستہ ہے جو
حد بین نقطہ نظر رکھتا ہے اور حقائق کو گھمے میں اس سے کام لیتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ
چیز حقیقت نگاری کے معمولی تصور سے بالکل مختلف ہے، اس میں ہماری حقیقت،
احساس میں اور تصور، رد کی سب سے ایک روحانیت ہیں، یہی ادب کو چاہتا ہے،
نوع صورت، اس میں دوست جانے کا تصور ہے" (ادبی ادب اور شعور، ص ۱۱۴)

اعتماد ہمیں کے اپنی نظریات میں اس کے یہ میلانات، اصل امر میں جن پر اس کی
تجربوں کی دوا میں نظری میں، اس میں، انھوں سے ترقی معاشی صورتوں کو حاصل طور پر پایا ہے جس
میں تاریکی کی جگہ، رنگ آمیزی ملتی ہے کیونکہ تاریخ کے پیچ و خم کا اندازہ لگنے بغیر، سماجی اور کسی
حد تک معاشی تغیر کے اسباب بھی تلاش میں نہ جاسکتے، خاص طور پر دو پیچ و خم جو علمی طور پر

الفاظ کے سماجی تعلقات، سماجی، فکری اور معاشی ربط سے تبدیلیوں کو تلاش کرتے ہیں، صرف کرے دے واقعات اور تذکروں (Dates) سے کسی اس سے اختتام حسین جب بھی کسی شاعر، ادیب یا کسی دوری اپنی شخصیت کی حقیقت کو آنکھیں ہیں، تو سب سے پہلے وہ تذکرہ کی پر میں بنا کر مدتی ہوں صورتوں کو دیکھ جیتے ہیں اور اسی اسباب کی مدد سے میں شخص کو پرکھتے ہیں۔ اسی طرحوں اور صورتوں کو تاریخ کی تنقیدی راہ میں اختتام حسین کی مدد سے (Expertise) گھمنا چاہے ایسے مطالعے میں انہوں نے مطلب کے مختلف سے عربی اور فکری نظریات کو بھی ماخذ یا ہے مطالعہ کسی ایک شاعر کا ہوا کسی تحریک کا حتمی ہو کسی تدبیر کی تقسیم کا مستند ہو، مصوری یا ادبی تاریخ کا محاسبہ ہو، ان کی تنقید اسی اصولوں اور اسلوب کی مدد سے چلتی ہے۔ مگر اکبر آبادی، اکبر الہ آبادی، جگر صاحب، غوثی، ایک مطالعہ، اردو کی دو ماہی کیلیات، احقر شیرانی، محار، سید طہیر، مہینت، تدبیر، سبوں کے مطالعے میں ایسے بصیرت افروز جیسے مٹنے میں جن سے فکر و فن کی ترقی، ایم، بھوکتی ہیں ان کی ایسی فکر و دل میں چلے اور محاسبہ قہری کو اکثر نظر آتے ہیں

۱۔ "محض صلی نسخ اور کہاں سے پیدا ہوئے دی شاعری، مطالعہ لکھت کی شاعری ہوتی ہے لیکن جب اس میں شاعر کی شخصیت اصرار ہے اور محروم کا مسلسل نمایاں ہو جائے تو وہ حکمت سے آگے نکل جاتی ہے جگر کے یہاں اسی مسلسل نے حد اقلت پیدا کی ہے (پلے کی موٹ نکس اور آئیے)

۲۔ "آصف اللہ اللہ کا لکھو، مگر یا ایک حریر سے کی طرح اس ہونانی دور حیات میں اصرار ہے اور اپنے دامن میں وہ مداف صیبت بیٹا ہے جو کسی تدبیر کے مایل، پسوں کا آئینہ بن جاتی ہے سیاہی مہینت سے اسے تو ترقی کا راہ۔ کہ کچھ میں سکون کا، لیکن رچی رمدست بلدی قیمت لوار کے آصف اللہ اللہ نے ایک طرح کا قریب سکون خریدیا تھا" (احبار نظر، اردو کی ادبی نگار)

۳۔ "فلو کا کام تحریر نہیں، تکلم، ترتیب، انتخاب (Choice) اور تعمیر ہے، اگر فلو کا کام علوم سے کرے تو وہ اصل ادب کی پیدائش میں حصہ بن جاتا ہے" (ادب اور سراج)

۴۔ "کیا سماج میں ادب کی کوئی جگہ ہے؟ کیا اس سے کوئی قدری مقصد پورا ہوتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو کھسے، انداز کی کے مضمون میں سوالات کے متعلق کچھ

۔ کچھ نظریے ضرور رکھتا ہوگا۔ کوئی شبہ اس بارے میں رہا یا نہ رہا اور تمام انکار
وہابیات سے بے یار و مددگار ہو سکتا ہو اس کا مفہوم اس کا سماج و اس کا شعور اور اس کا علم
سب ظاہر اس کے لیے مہیا کرتے ہیں۔ اس نقطہ نظر سے ادب کی حیثیت سماجی اور
مطالعی ہو جاتی ہے۔ " (حمید اور علمی عقیدہ)

۵۔ ادب اور شعر کی دیا، السلائی محرم سے باور کوئی وجود نہیں رکھتی اس
لیے وہ "ادب" ، "طبیعی" ، "مخصوص" ، "محدود" اور "مختص" کے بلحاظ "سلائی" تھیں ہی
رہتی ہے (حمید و نظریہ ادب عمل)

سید احتشام حسین کا یہ تحریراتی مطالعہ مست و سچ تھا۔ انھیں تاریخ و تمدن سماجی
و سیاسی تاریخ و ادب پر اس کے راجع سے بطور خاص دلچسپی تھی۔ یہاں تک کہ دوسرے گھر بہر تحریر
اور ادب و علم کی گفتنی اور دوسری صورتوں کو اسی کسویدہ جانتے اور پرکھتے تھے۔ تاریخ و سیاست اور
سماج "ایک طرف کا سرگرمی میں جس سے کوئی الگ نہیں ہو سکتا" احتشام حسین کے اس شعور کا سب
سے مست صرف "علی گڑھ تحریک کے اعلیٰ پلو" اور "نوجوانی کا مطالعہ" میں ملتا ہے اس
مطالعوں میں جس طرف انھوں نے صدی کے بعد وصال کے بعد طالعہ علمی انصاف و حدود ستانی
مسلمانوں کی معاشقہ اور معاشی صورتوں کا جائزہ لے کر علی گڑھ تحریک "سر سید اور اس وراثت کی
پیشکش" کے نام میں "نئی دنیا" کو سوانحی ۱۹۰۷ء میں پیشکش کیا۔ انہیں اسی پیشکش کے
موجودہ مسودہ ۱۹۰۷ء میں دیکھا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ "سر سید کی باتوں کے
عقائد" ، "معلیٰ پسوں" ، "بحث کی کمی ہے" ، "لکھنؤ کی حدود ستانی صورت حال پر تنقید" ،
"لکھنؤ کے نئے حدود ستانیوں" ، "انگریزی زبان کو مسلط کرنے کے مددگار طالعہ وراثت کی سازش" ، "علی
گڑھ کے" ، "پیشکش کا مسئلوں اور حدودوں کو متعلقہ کر کے" ، "۱۸۶۰ء میں ماسٹر کی فاطمہ میں
"جدی" ، "۱۹۰۷ء میں علی گڑھ کا چلنا اور تمام سرکاری مدارس میں "ادب" اور "فارسی" رسم الخط کو
موقوفہ "راستہ" کی کوشش "سر سید کا مسئلوں کو انگریزوں سے روکنے کے لیے تاریخی و سیاسی اور
معاشی حالات کے تحت "مشہور" دیا اور "گھر اس تحریک سے" ، "ادب" ایک کھیلے دیکھن اور "نئی پسند
صورتوں کا راجع ہونا" اس سب کا نتیجہ میں مدلل "قانعی" (CONVINCING) دھمک سے اس
مقالوں میں پیش کیا گیا ہے "اس سے احتشام حسین کے تحریراتی "ادب" اور "لکھنؤ" ادب و "پیشکش" کا بھی
لکھنؤ "۱۹۰۷ء ہے" یہ انگ بات ہے کہ "اصل کو توں کو" ایسے تحریراتی مطالعوں سے دلچسپی نہیں بلکہ اس کو

۱) ایک غیر ادبی اور غیر تنقیدی رویہ سمجھتے ہیں آج امریکی ادبی تحریکات کے تحت آئی ہوئی روایت (Textuality) کے مزاج سے۔ بھی ایسے تنقیدی تجربے پسند سیں کے جلتے اس طریق تنقید میں صرف سرسید کی تحریریں علی گڑھ تحریک کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں اسی طرح ادبی اور سماجی آزاد کے مطالعے میں صرف یہاں واقعہ ۱۰ اس کا طریق مطالعہ اور ادبی نکتہ کا سمجھ بیانی کافی ہے کہ مصنف کا بھی مقصد تھا سرشار سے آزاد محض غلط لیے اور اپنی فی صورتوں کو پیش کرنے کے لیے لکھا تھا اور یہ بھی کہ اگر ۱۰ دور کی سیاست اور سماجی ہی کا جائزہ لیا ہے تو نظری کو معاشیات سوشیالوجی اور سیاست کی کتابیں پڑھا چاہیے ادب کو صرف ۱۰ اس کی جو صورتی اور ریوڑ سے ریوڑ رہاں کی حالت ۱۰ حویوں اور ۱۰ ایوں کی حد سے ہی سمجھا چاہیے اس میں کل ہے مگر ہر تحریک یا فکر اور تخلیق کے پیچھے جو محرکات اور قوتیں ہیں بجا ہمار کام کرتے رہتے ہیں اور تبدیلیوں کی مشافی بھی کرتے جاتے ہیں کیا ان کو چھوڑ کر ۱۰ کوئی ٹیکسٹ مکمل طور پر سمجھا جاسکتا ہے؟ جو لوگ "عالم ادب" اور "عالم حقیقت" (Textuality) کی بات کرتے ہیں ۱۰ اس کی اس سوچ کے بھی حساب میں جن پر ایک تنقید کے طالب علم کو فائدہ کرنا چاہیے۔

ثابہ ہمارے نئے تنقید نگاروں کو معاشیات اور اسلوبیات کی مختلف صورتوں کے ساتھ اس بات کی بھی ضرورت کہ ادب اور مطرب میں جدید ترین ادب کی تقسیم کے لیے ۱۰ ہر اسی طرح کے تحریراتی طریقے سے ۱۰ ہے جس میں تمام سماجی اور سماجی علوم سے دلچسپی اور حدوں جاری ہے۔ دلائل ہر جہاں معاشین فکر کنندہ ۱۰ سماجی رہاں در ۱۰ سطر و س کے اسلوبیاتی اور لسانیاتی تنقیدی رویوں کے ساتھ نیلی۔ لیکن ۱۰ ہر منصفہ ہم ۱۰ ایڈورڈ سعید ۱۰ ادب ۱۰ مسن اور فوکو (Foucault) کی تمام تحریروں میں بھی طریقہ کار پایا جاتا ہے ۱۰ اس میں سے کچھ فوکو اور ادب ۱۰ مسن ۱۰ خاص ۱۰ اختیارات کے مسائل میں بھی سماجی علوم کو شامل کر رہے ہیں ۱۰ یہاں تک کہ ذہنی کی فکر "قواعد سے متعلق" اور ادبی پلے (Freeplay) نظریے میں بھی سماجی علوم کام کرتے رہتے ہیں کسمی انکار کی صورت میں اور کسمی اقرار کی شکل میں (ذہن کا قرار ۱۰ تمام سماجی علوم ۱۰ انسانی علم (Human sciences) ہیں ۱۰ خود ہی سماجی علوم کی اہمیت کا اقرار ہے ۱۰ ایڈورڈ سعید کی حالیہ کتاب "دی ورلڈ ۱۰ دی ٹیکسٹ اینڈ دی کریٹک" (The World, The Text and the critic Published by Harward University) کے مختلف مقامات میں ایسی بحثیں اٹھائی گئی ہیں اور اس کی بھی بحث اٹھائی گئی ہے کہ انگریزوں سے ہئی و آجروٹ (Colonies) میں انگریزی ادب کے اس خاص صنف کو حساب (Text) ہے کہ انگریزوں سے ہئی و آجروٹ (Colonies) میں انگریزی ادب کے اس خاص صنف کو حساب (Text)

میں سے مست ی صور میں ، مغرب کی تاریخی ترقی صدیوں سے قریب میں اگرچہ اختتام نہیں
کے سامنے یہ حلیہ ترقی صورت میں ۔ تو عام ہوئی تھیں اور ۔ وہ اس سے واقف تھے یہ بات محل نظر
ہے کہ تمام ممالک مغرب کی طرف متوجہ ہوئے رہے ہیں ۔ کنوینشنل عدلیہ کی تاریخی اور کچھ کے
مطلے میں اس اور کے ساتھ سے بڑے طور پر ترقی کے ساتھ ہی کتاب کچھ ایڈیٹنگ کی
(Culture And Anarchy) میں کی تو اس سے اگرچہ حاکموں کے نظام اور ہر کلاس کی حدود
اور کچھ رکھاؤں سے کچھ کو نام ہے جس کا سب سے قیمتی عین اصطلاحات اور دینی اور کی میں تلاش کیا ہے
اس نے Sweetness And Light سے تعبیر کیا ہے ۔ جس کنوینشنل عدلیہ میں جو کچھ کونوں اور
مردوں کے استحکام کی آوازیں ، مشغول تھیں تھیں ۔ جس اور کلاس کا دشمن سمجھا جاتا تھا کہ کوئی
کچھ ، اندکی روایت میں کر سکتا ، ترقی کا میل تھا کہ انتظامیہ کا سرکاری دینا کچھ کی حدود میں رکھوں گا
محافظ ہوتا ہے ۔ دراصل ، آئینہ کنوینشنل عدلیہ کے کچھ اور جب کا یہ ایک ترقی میں ملکہ ایک طرح سے
ان کا مقصد ہے ۔ ایسے آدمی کو کنوینشنل عدلیہ کی مختلف تحریکات سے کچھ پسند تھیں اور ایسے اس سے
کچھ کی بحث میں حتمی کی آوازوں کو اندکی (Anarchy) سے تعبیر کیا ہے ۔ یہاں ہمارے کام کی بات
یہ تھی کہ ہر بڑے طور سے ، کسی اور کی حدود اور اب کو جب صحیح طور پر سمجھا جاتا ہے اور حدود کا
مطلے اس کے لیے ناگزیر ہو گیا ہے ، جس میں وہ اب اور حدود پر وہاں چڑھی ہے ۔ خود ناقد کس کا
طرز رہے ۔ یہ ایک ایک بحث ہے ، اختتام میں سے ہے ۔ ہر کے مطالعے میں ، سرسید اور ان
کے رکھائے گا کی اچھی صورتوں کو بھی رہا ہے ۔ جس جو استحکام کی آوازیں تھے کہ اگر پری عدلیہ
حکومت حدود اور حلقہ سرکاری کی حالت ترقی تھیں ، ان کے یہ ، کم تو بھی پیش کر رہا ہے کہ
اس اور کاسی صحیح مطالعہ ہے جسے صرف مثبت (Textuality) سے نہیں سمجھا جاسکتا

ہندوستان پر حکومت رہے وہوں نے ہر تعلیمات لازمی کے آگے تھا کہ ہندوستان میں
۔ کون علم ہے ۔ تعلیم کی روشنی میں کبھی پہنچی ہے ۔ تمام میں اور ، مندرجہ ذیل میں سے مطالعہ کیا ہے
اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تمام مشرقی ادب ، کسی بھی یورپی لائبریری کے ایک شرف پر رکھی ہوئی
کتابوں کا مطالعہ میں کر سکتا ۔ یہ مطالعہ میں ہے ۔ کہ میرے حلیہ میں کہ حتیٰ بھی اصطلاحات ، مسکرت
وہاں میں ترقی کے حلقوں میں ۔ ان سے کہیں زیادہ اصطلاحات ، ان کی زندگی کے ترقی اور جوں
کی کتابوں میں میں ۔ " یوروپسید کے لیے کتاب " دی آرڈر ٹیسٹ ایڈریٹک " میں لکھا ہے کہ
جب جان اسٹورٹ مل نے ، " ان لبرٹی (On Liberty) لکھا تو اس کے ساتھ یہ بھی واضح کیا کہ یہ

میں صرف ہی مراد کے لوگوں کے لیے ہیں جو کلی مذہب میں اور اس کی مطابقت رکھتے ہیں کہ
 بے مضامین کو عقلی اور منطقی دلائل سے کھ کھتے ہیں اور یہ کہ جلدستان اس لائق میں (دہلی)
 جلدستان میں صرف منطق، اعلیٰ لسانی حکومت کرکے ہیں "تو کیا یہ ایسویں صدی کے
 جلدستان کی عقلی صورت تدبیر، گہر اور ادب کا جائزہ لیا جائے گا تو میکا کے درمل (Mili) کے
 اس سیاسی سٹار اور جود مراد، اصولوں اور تحریروں کو جو زرا جائے گا اور اس وقت کے جلدستان کے
 سیاسی، سماجی، اور تعلیمی نظام میں حیالات کے اثرات کا تجزیہ اور ان کے اثرات کو معرقل بحث
 میں لایا جائے گا؟ در تمام دینی، عقیدتی اور اپنی تحریک کے بعضے صرف حروف کی بازیگریں کر کر اور
 صرف ٹیکسٹ کو پڑھ کر ان کے حسن و بھگ پر بحث کر کے ہی کیے جائیں گے؟ احتشام مہسین کے تمام
 اپنی مطالعوں میں، تمام پس منظر، تاریخ کے ستر چھلکاؤں، تمدنی صورتوں سے آئے والی باتیں اور
 ان، توں کو کسی خاص مقصد میں اضمحل کرے والی غلطیاں (Repression) (احتشام اور
 معاشی اجارہ داریوں اور حیالات ممنوعات، سب سے رتیب پائی، بول بھری اور سیاسی صورتوں کی تلاش و
 جستجو اور تجزیہ شامل ہوتے ہیں۔ علی گڑھ تحریک کے مطالعے میں بھی سرسید کی مجبوریوں، ان کی
 حدود (Limitation) عقلی پروگرام میں مطابقت اور سرسید کے رکھے کار کی کوششوں کا جائزہ
 پیش کیا گیا ہے۔ لیکن جو اجتماعی، تاریخی، اندر کر انگریزی حکومت کی بصیرت کر رہی تھی، ان کے کیف
 و کم کو بھی پیش کیا گیا ہے کہ ان تمام باتوں کو صرف خ (Text) کے ہی مابین سے سیں سمجھا جاسکتا
 مطالعے کا یہی طریقہ "ادب کی اپنی لغت" "ان کا، اہم، پو" "تعلیم کی صورت" شاعری، ادب و ادب
 انقلاب ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں اعلیٰ اور جبرانی مطلب، ستر کا دامن، یہاں تک کہ ان کے سفر نامے
 حاصل و معذور ہیں بھی یہی تاریخی، سماجی نقطہ نظر کار فرما ہے ان مضامین اور تحریروں میں کہیں
 مدد سے یہ پ ستر اور ان کے لیے وہ صاحب "دلی جانب داری میں ہے جو مغربی ادب کے نظریہ باز
 دور کے ہیں، انہیں دیکھی جاسکتی ہے

اپنی مطالعے کے مطالعے میں احتشام مہسین یہ طرز کے آزاد فکر (Free
 Thinker) تھے، نہ دھڑکے میرا مطلب یہ ہے کہ وہ ادب کے تمام کیف و کم کو، ان کے وسیع
 انداز میں سمجھا اور پیش کرنا چاہتے تھے، اگرچہ ادب کے حلقوں میں کا ایک اچانک نظر تھا اور یہ اس لیے
 کہ بغیر نظریے کے۔ تو کوئی ادب تخلیق ہو سکتا ہے۔ اس کی تعلیم کا حق مدار قائم کیا جاسکتا ہے۔
 ان کے مطالعے کی مشاغل پر ای لیے عام طور سے تمام علوم و فنون کی پر جماعتیں نظر آتی ہیں کہیں

تھی اور کہیں کہیں وہ سلی گھر کی تمام کمرؤں کا بھی صلب دکھایا ہے جس میں امرنیز کی گھر، شر اور شنگ کی مصیبت اور مصلحت اور حکیم سٹائڈ کس کے دہن کی جولائیاں، اور گروں کے ساتھ معاشی وسائل، اور یوں اور ان کے اسباب کا بھی صلب ہے توہر سری طرف، تاریخ اور سیاست کے وہ بچاؤ بھی ہیں جو قوموں اور ملکوں کی رہ کیوں بد کرتے ہیں۔ یہ صراحت اور گھر پر ان کے اثرات کی تفہیم بھی احتشام حسین کی تقریباً تمام تحریروں میں ہے تمام صوبہ میں ملتی ہیں اس کی فکر کا محور۔ انداز ہی سے اساتذہ کی زندگیوں اور اس کی کیفیات میں رہی ہیں مگر اب تک سے ٹیکنگ اور میں اس کی تفہیم مکتی میں اس صورتوں کو ملکوں سے شعرا اور ادیبوں کی تھکیت کے بچاؤ اور اس سے تلاش کر کے اٹھایا ہے۔ مگر یہ مزاج اس کے پاس ہے۔ جو تا تو ادب اور اخلاق، چمکتے ہوئے حقیقت پسند صبر جدید، نظریہ کہہ سکتی اور عوام اس سے میں مصیبت کا عنصر، اقبال کی رجائیت کا تجربہ، حسرت کی غزلیوں میں مشاطہ عنصر ادب میں جیسی جدید سہارہ حضرتی، روان سے انقلاب تک، غالب کی بیت نکلی عدم چھوڑ سکتی مصوری پر ہم چھوڑتی مرنی پسندی اور اسی طرح کے ست سے معامین اور مقالے وجود میں آتے اس مقالوں میں جس طرح کی بخشش ہیں، ان سے احتشام حسین کے انداز تجرید اور طرز فکر کا انداز دکھایا جاسکتا ہے اس کے معامین میں اس طرح کے پھوٹے پھوٹے نمونے بار بار آتے ہیں۔

”ادب، ہونی قلعہ حاسے کا نام میں اس لیے ادب اور شاعر کا کام

میں ختم میں ہوتا کہ وہ جو کچھ دکھتا ہے، وہی لکھ دے لکھ دے لکھ دے جس طرح محسوس کرتا ہے کہ ایسا ہونا چاہیے، اس کا بھی اظہار کرے، تجرید کو سبک دینے کی روشنی میں سمجھے کی کوشش کی جائے اور اس کے صولوں کو اس طرح مرتب کیا جائے اس کی مدد سے زیادہ سے زیادہ انسان، ادب سے لطف اندوز بھی ہو سکیں، اسے سبق مفاد کے کام میں لائیں، اور وہی پسندیدگی اور ناپسندیدگی پر تجرید کی عیار رکھ کر اصول کا یہ جامع علیک۔ فعل ہے ادب بھی عام انسانوں میں ایک سلیج میں پیدا ہوتا ہے

پہلی ساری طراوت پسندوں سے تعلق اور محبت کے باوجود وہ سب سے تعلق رکھنے پر محسوس ہے، اکتھ اور بہت حال۔ کی حد تک اس سے لکھوں کی وسعت، نہیں ہی ہے یہی میں میں کائنات کی جستجو۔ میں کی جاسکتی اور ہوں کا مرض ہے کہ وہ ایسے عالمگیر انسانی نظام کی تشکیل کی خواہش کریں جس میں کوئی ملک کسی دوسرے کا دشمن نہ

را جائے، انسان دندے نہیں، انسان میں جو آپے شعور اور اپنی کوششوں سے زندگی کو
مستزما کرتے ہیں، ان کے مطابق عصر کا احساس نظریہ میں کہ چاہتا انسان نے آپے
تبدیلی، تقابلی ہے، ذوق آہستہ آہستہ حاصل کیا ہے، احساس عمل، طبیعی کیفیات کا
تاج ہے۔ غریبی، مصلحتی، غریبی، دیکھنے والے کی داخلی کیفیات میں طرح احساس عمل
کریں گی، وہی حقیقی حسن ہوگا، ہر دور اپنا ذوق اپنے ساتھ لے آئے ہے، اسی وجہ سے ادیب
کے ہر عالم، علم کو اس صوبہ کے تمدنی، سماجی اور حیثیتی معیارات کی واقفیت حاصل
کرنا ضروری ہے۔" (یہ نکتہ سید احتشام حسین کی مختلف کتابوں سے لیے گئے ہیں)

احتشام حسین نے کسی مصلحتی اور کھٹی صورتوں کے تحت مضامین میں لکھے کہ یہ کام
جعلی (Pseudo) تھا، ان کا کہنا ہے جو طلبہ کو کلاس ٹوٹ مصلحتی اور کھٹی صورتوں کے تحت لکھاتے ہیں
اور بعد کو انھیں کتبلی شکل میں پیش کر کے دیہے، خود میں اپنا عہد قائم کرے کی کوشش کرتے ہیں۔
احتشام حسین، "دو تہ صورت تھے مگر ان کی تجدیدیں، "دو تہ" اور کھٹی ہیں، اسی ہے ان کے میں
اصول، سخن، الگ الگ مضامین بھی نہیں ملے جو اکثر جوہر رشتی کے نامزد کا شیوہ ہے جو مختلف
ویڈیو شیوں کے مصیبت کو نظر میں رکھ کر مضامین اس لیے لکھتے ہیں کہ طلبہ استقامت میں اپنی مدد کے
لیے ان کی کتابیں خریدیں، لیکن کوئی چاہے جو احتشام حسین کو ترقی پسند وہاں باز کی نگہوں کا
حالی (Defender) کہ کر ان کے تجدیدی نظریے کو محدود رکھتا ہے، لیکن احتشام حسین کی
ہر کسی نظر اور مبالغہ جتیدہ، انھیں دوسرے نظریہ، دوسروں کی طرف متوجہ ہونے سے روکتی ہیں ہے
اور اس طرح وہ کینیڈا، ناقد ہو کر بھی محدود نہیں رہتے، انھوں نے کبھی کسی پہلوئیں لاس کو حد نظر نہیں دیا
بلکہ تمام عمر ان صورتوں، سے اس کی مستزما اور صاف صورتوں کو سے رہی تجدید کے طاق دیواں
جائے میں تاہم اگر حقی کے ساتھ حد حدی نہ جات تو احتشام حسین صاف ہر کسی طرف فکر کے جانے
میں رکھے جائیں گے اور اس طرح ان کا آزاد، مفکر، بڑا مہود نظر آتا ہے مگر ان طرح تو دنیا کا کوئی
مفکر، ادیب، غیر جانب دار نہ رہے گا اور یہ بات بھی چاہیے کہ آج تک جو مختلف ہیں سکول اور
ظہریہ و جماعتیں آئے ہیں، وہ جانب دار ہیں اور کسی خاص گہرائی حمایت ہی سے انھوں میں آئے ہیں
یہ مگر بھی احتشام حسین کی تجدیدوں میں دوسرے افکار سے جہ مہربانی کسی مدد کی خاطر، ان کا نظریہ یا
مخالفت برائے مخالفت کی صورت کہیں نظر میں نہ آئی وہ بھی ان کا تاثر اور بھی ان کی ترقی پسندی ہے
جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اور اسی وجہ سے ان کی تجدیدیں "اورو تجدید کا اعتبار بھی ہیں۔ احتشام حسین

ہر گز ہر کوہندہ سے دیکھتے ہیں اور اگر ان میں کچھ بھی صوفیوں میں عام انسانوں یا ادب کے ارتقا کی چیز تو وہ، انہیں اپنی عقیدوں میں سموئے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک زمانے میں احتشام حسین پر یہ اعتراض شہید ہو چکا کہ ان کے پاس وہابیت کا کوئی تصور نہیں ہے اس مسئلے میں راقم الحروف کا ایک چارہ مسئلہ احتشام حسین نظریہ وحدانیت کی روشنی میں، شاہد کے احتشام حسین سر میں موجود ہے جس پر مزید بحث یہاں قلم بند کی جاتی ہے۔

احتشام حسین زندگی کو عمریں میں دیکھنے کے حوالے تھے۔ اور اسی طرح ادب کو بھی وہ مسلسل اور سیال سمجھتے تھے جو اپنے ساتھ تو بدلتا ہے مگر زندگی اور ادب کے اصل دھارے سے الگ نہیں ہوتا اور یہ دھارے انسان زندگی اور سماج کے بیچ سے بھڑکتے ہیں اور یہی زندگی اور انسان ان کا محور رہتے ہیں۔ وہ ادب کو محض صنف ہیے کی پیروی نہیں سمجھتے بلکہ ادب زندگی کی لڑائی انسانوں کا آلہ کار بھی بناتا ہے اور ان کی جدوجہد کا کرتا بھی۔ ان کی محرومیوں میں، قصیدہ، پنجنگ یا ہوا کہیں نہیں ہے۔ کون اگر ان کے نظریات سے اتفاق نہیں کرتا تو ان کی عقیدوں میں کسی پر اپنی فکر اور پرکھ کو مسلط نہیں کر سکتے کہ اس میں اور صرف ہی طریق ادب کو آگے کا ہے، بلکہ اس کے برخلاف یہ عقیدوں دعوت گہرونی ہیں کہ یہ بھی ایک طرف ہے، اس طریقے سے بھی ادب کو جانچا اور دکھا جاسکتا ہے۔ احتشام حسین کے بتائیں کہ یہ خیال ان کی ہر تحریر میں دیکھی جاسکتی ہے۔

احتشام حسین کی عقیدوں پر باہم کرتے ہوئے، ان کے ادب کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے جس میں طرح طرح کی پیچیدگیاں تھیں۔ سیاسی، سماجی، کردار سازی اور شکست کردار، اسی والی پر مدد اور حل سے ان کا ساری حرفت حل میں داخل ہوتی ہے۔ ان میں علم اور آراء و علم کے مابین جمل رہے تھے۔ علم معری کا علم تھا اور ان میں علم نگار بھی خوش دور میں کے رہتے تھے (Traditional) انہوں نے ساتھ ساتھ صنفی انداز پر چمک رہی تھی۔ ذرا تنگ دماغ ناں اور بدلتی ہوئی زندگی کو پیش کر کے والے انسانے، عالمی ادب سے ان کا رابطہ اور اس کے درپے داخل ہوتی ہوئی شکست اور حتمی تقدیر اور یہ ضرور احتشام حسین کی اپنی طرح کا زندگی اور اس کے مسائل، یہی سماجی پیچیدگیاں اور صور میں ان کی عمریں میں ہر جگہ اپنے جیسے دکھائی دیتی ہیں۔ گہری اور حسری اعتبار سے بھی ان کے یہاں ماضی اور مستقبل میں ایک رس کشی جاری رہتی تھی مگر یہ احتشام حسین کا جینٹیل ہے کہ انہوں نے ہمیشہ مستقبل ہی کو نظر میں رکھا، گرچہ سماجی روابط اور رشتوں میں وہ کسی حد تک قدامت پرست تھے۔ یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ انہی تمام تر قریبی پسندوں کے باوجود،

کسوئیل اور معجزہ بھی ہاتھ آجاتے ہیں۔ کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ اشتہام مسین بہت سے مختلف سوال و جواب اور اعتراضات میں بھی لکھ جاتے ہیں ہو سکتا ہے کہ اس وقت جب یہ جوابات دیے گئے ہوں اس وقت ان کی اہمیت رہی ہو مگر آج ان کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ سوالات ہی کیا تھے جن پر عاقبت در تھیدی ملامت صلاح کی گئی اس سوالات میں سے کچھ ایسے تھے جو محض لٹھائے کے لیے تھے، کچھ محض بحث چلائے کے لیے اور کچھ کی حیثیت محض Stunt کی تھی کچھ کا تمام معنوم تھا کہ لاکھ ان کا طبعی بخش جواب دیا جائے مگر چونکہ مسائل کو مسائل جانے والوں کی بہت صاف۔ قہمی اس لیے اشتہام مسین صاف کے مسکت جواب بھی ان کی نشانی کر سکے۔ ایسے معامی میں ادب اور محمود، ادب صاف کو طبعی اور نظری "ادب شاعری میں قومیت" مسلمان اور ہندی "ادب کا سنا ادبی معاشرے کے ور سے نہیں" ہیں۔ اشتہام مسین نے حامی ماحتمالی اور اہمیت کے ساتھ ان کے جوابات تلاش کر کے اپنا خطہ نظریہ یا مگر چونکہ نتائج سے ملے تھے اس لیے اشتہام مسین کی دہکرت اور دلائل محرمین کی بیچوں کو مدلل۔ کئے ان معامی میں سے کچھ کی نوعیت تو مست کچھ دین الوتھی کی سی ہے اس لیے ان میں بلند تھیدی صورت، ادب اور "ہنگ بھی پیدا ہو سکے اور محرم بہت کچھ عذر و محدث ہی کر دہی ایک دہے میں عمد حسن ہنکری جب ترقی پسندوں پر اعتراضات کرتے تھے اور اپنے رویہ کبھی سبق سکھانے تھے تو کچھ اپنی قلموں بھی چھوڑتے رہتے تھے انھوں نے ایک مرحلہ پر کہا کہ

"من کردوں کو چہ صعب کی پکار پکار لگائے رہا چاہے"

ظاہر ہے کہ یہ بات عسکری صاف سے ایک اپنی نظریے سے متاثر ہو کر کہی تھی جو ٹرائیڈ سکوں کا نظریہ تھا اور جس سے مطلب ہی نکلتا ہے کہ ادب کچھ پس ہے، صرف اعصاب کی پکار ہے۔ یہ اس لیے کہا گیا تھا کہ ترقی پسند، ہندی حالت کا اثر، دہن اور مگر کی داخلی کیفیت پر دیکھئے۔ یہ تین رکھتے تھے ترقی پسندوں کا کہا تھا کہ "و ادب کبھی مٹی ہو ہی نہیں سکتا جس سے اسلی ظلم، اسلی مسرت اور اسلی مشکوں میں اصلاح ہو اسلی قدس میں تاریکی فوٹوں کا ہاتھ ہوتا ہے اور ہی سے قدسوں کا نہیں بھی ہوتا ہے اور ادب ان سب صورتوں کا ٹکس ہے" (اشتہام مسین)

چنانچہ اشتہام مسین نے جواباً یہ بات کہی کہ

"اعصاب اعصاب کی پکار پکار دینے کے سہی۔ بونے کہ ہمارا"

شور کام میں کر رہا ہے اس کے برعکس اصرار کو جس میں کئے والے اپنے شور سے اس کو (اصحاب کو) اس راستے پر دالے گا جس کی طرف دالے جلا چکا ہے۔
(اعجاز نظر ص ۱۳۳)

عسکری صاحب اور اس کے موید میں اس کا صبر کا انکار کرتے رہے اور کہتے رہے کہ یہ دوسرے کی فکر اور طرہ دست پر ایک طرف کا قدم نکلا جو اور اس سے اطرافت عملی ہوئی ہے اور اگر دوسرے اصرار کی آواز پر کس نگاہ سے کچھ نہ دیکھتے تو اسے اور طرہ بھی اس طرف کے سمت سے ٹکوتے محمد حسن عسکری کی تحریروں میں موجود ہیں "جسٹیس" کے نام سے اس کے حوالوں سے شائع کر دیا ہے اس میں فرانسیسی شعراء و ادیب کے متعلق صرف سمت سے نکشیدات اس طرف میں تو یہ بات صرف محمد حسن عسکری صاحب ہی جانتے ہیں ان باتوں کی بھی تین رد و احوال کو مہر میں ہے محمد حسن عسکری کو اس طرف کے مطالعے ایسے میں موزع تھا

اختتام حسین کی تحقیق میں اس طرف کے حیات مند دے تھے جس اور کی صحن میں سوالات بھی تھے جسے میں یہ صورتیں نظریاتی مضامین میں بھی ہیں علمی تنقیدی صورتوں میں بھی درجہ تنقیدی تحریرات میں بھی سوئیں جو بہت سی صورتیں مثلاً یہ اس میں ملتی ہیں جس میں اب کے ساتھ ہمہ پہلے ہوتے ہیں اس کا درجہ سچا ہوتا ہے دیکھیں صرف مطالعی جو ان کا ادب میں کہتے تھے نہیں اختتام حسین کے یہاں بھی علمی کی جان دار و نیل ملتی ہیں جس کا تھیر امت و سچ ہیں ہوتا اور اس سے کوئی اہم بین مسد بھی مل جاتا مثلاً مقدمہ کے طور پر اصرار اس پر جس و دیر "اٹکس اور تھیرے اور اسے مضمون میں لکھے تھے یہ محمد و احسن فاروقی کے حصے پنے حتمات کا قصصی جواب حال اور بیرونی مطلب ہیں حتمی حتمی کا جواب اس خوبی کا "اس میں کہیں کہیں اس کے یہاں مدرس و لکھنؤ کے کتاب "اقلم محفوظ کا نیل ہے کہ ہے اپنی نظر نظر کی وضاحت اور اس کی علمی اور ادبی لکھنؤ میں ستریں جو ان فاروقی ہے جس کی مضامین اختتام حسین کے یہاں تم سے ہیں حتمی حتمی صورتیں بھی عامی میں مثال کے طور پر انکی در بیان حتمی کے کچھ مومنے مسد مل ہیں

(۱) "فلو کو تو یہ کچھ کر لکھ چکا ہے کہ کسی کو کچھ سکھایا ہے کسی کی رہائی کر رہا ہے کسی کو اپنی درود و نکات کے کہنے میں حتمی رہا ہے"

(۲) "نبلی سے سے (مرثیہ کو) ایک یا الیہ میں قرار دیا اس بات کی

طرف ضرور متوجہ کرنا کہ مرثیہ دے دالے کے لیے سعی نکھایا جاوے اور انہیں صرف
 جن کے شاعر ہیں خود ان کے کلام میں اعلیٰ پایے کی شاعری کی ساری خصوصیات
 پائی جاتی ہیں۔ (پیکس اور آجیٹے)

• بہت صحیح یہ ہے مرثیے کے درپاڑے، دونوں کا اصل مقصد ہمیشہ گریہ و زاری و شدت
 حسین ہی رہا ہے۔ مگر مایہں مروی ہیں اس میں۔ اور یہی کی صورت میں خود میر انیس سے بھی
 مرثیوں میں اس طرح کے اشارے کیے ہیں۔

• مخمّر پانہ کے دالے کے مانی میں جدا

• مشیر، پکا کو کہ مخمّر کام ہے

• جو مل کر ہے گا وہ بحر شہ کو دالے کا

• دالے دالے شہ والا کے دلی خلق میں شاد

• ہیں ماتم امام اسی شہ پر ہے ختم

• مشرہ دے عا، بد گشتی میں گرے

• مہوش ہیں اب کہ تڑپا ہے دل دار

• کمال ہے دالے کو تری درد کی سحر

اور اسی طرح کے مت سے شاعر مرثیوں سے پیش کیے جاسکتے ہیں۔ احتشام حسین ابھی
 طرح حاستہ تھے کہ مرثیوں کا اصل مقصد کیا تھا مرثیے کی بلی مایہں مروی اور ترمین کاری کے لیے
 تھیں کچھ محض Interlude کی بنیاد تھی۔ اصل تھیں یہ اور مت ہے کہ مروی اور مصلح مایہں ہی
 مرثیے کو اپنا دہ میں لے آئیں۔ بحر مرثیہ اگر ایک یا الیہ (مغربی طرح پر) آئیں اس کا تو لوگ
 کہیں مرثیے کو پیک ثابت کرے پر غصے ہوئے ہیں؟ یہ کیا سہار ہے کہ مشرق کا براہی سور، مغربی
 ادب کے مقابل ہوا اس کی کسوٹی پر پورا اترے۔ یہ وہی نوآبادیاتی (Colonial) ذہنیت ہے جو
 انگریزی حکومت کے ساتھ چند صدیوں تکوں میں داخل ہے اور آج بھی اس کی صورت میں موجود ہیں۔
 جب ہم اپنی تہذیبوں کو انگریزی تہذیبوں کے اقوال سے مرین کرتے رہتے ہیں۔ غلامی ہوا، حلی کے
 ساتھ مدد عقید میں داخل ہوئی ہے اگر ادب میں ایک یا الیہ (مغربی) دھنک کا پس تو کیا جاتے
 غم ہے انگریزی ادب میں بھی یونانی ادب کی طرح کے ایک اور ایسے کہاں ہیں؟ مغربی ادب اور
 شاعری میں غزل، رباعی اور شہری موصلا دم جیسی چیزیں کہاں ہیں؟ احتشام حسین جیسا بلا نظر قلم،

اگر یہی بحثیں پیچیدہ ہے تو سے من کے کچھ وہ تو اندر ہی اندر ہی کی تریہ سمجھا چاہئے کہ ایک دور الہیہ، انسانوں کا سماجی سنگسار ہے، عورت اور، شہسبزی میں اور اسی صورتوں سے آج کے ایک اور ایسے بن گئے اسی طرح محمودان، صدی، مذہبی، مذہبی پر کچھ خیالات، آفاقی شہسبزی، زامہ نگاری، بکے، بکے، قلمی معاشیں میں من میں ریڈ پوٹ، صحتی صورتوں میں نظر آتی ہیں ان میں کہیں کہیں کچھ تنہیدی جملے صورت مل جاتے ہیں مگر یہ معاشیں ختم نہیں جیسے قد آور، میں، بکھتے، کہیں کہیں دسب، یہ کیفیت طاری ہوتی ہے کہ وہ اپنی تمام تحریروں کو یک جا کر دے ایسے جذبے کے تحت تمام رعب و بائیں، ان تحریروں میں داخل ہو جاتا ہے کہ ہر وقت ہر دسب قدر اول کی تحقیقات پیش میں کیا کرتا ہے ایسی ایسٹ سے فخر، یہ معاشیں لیسے ہیں جس میں سے ایک ایسا جہاد ہے کہ حاضر بیکانہ معلوم ہو جاتا ہے تمام، احتشام میں کے ہے یہ، اتنی محنت میں

احتشام میں کی تمام تر کوشش یہ رہی ہے کہ اور تنہید، ان منزل پر پہنچا چاہئے۔ مغرب کے سرور اور انقلابوں سے تنہید کو پہنچا ہے وہ اس کے لیے وہ بیسٹ مغرب کے اہم قادیوں اور مغربی ادیب کا مطالعہ کر کے ان کے طریق فکر کو دیکھ کر ان کے کامیابی میں شامل کرنا چاہتے تھے مشرقی قادیوں میں اسی لیے اپنی نظریاتی صورتوں میں وہ ملحق سے متاثر تھے مگر تحریروں اور اصطلاح سے پیش کر کے کا طریقہ انھوں نے سبلی سے سیکھا تھا ادب کے کامیابی میں اختلاف اور اتفاق، کبھی کبھے ہوتا رہتا ہے کہیں دلائل در این خطہ کے ساتھ ہوتے ہیں اور کہیں جدایت بھی، احتشام حسین، اگرچہ ظاہر بھی تھے مگر تنہیدی سبلی میں کبھی جدایت و سارا، اس کے ساتھ کہ جدایت کا دور ان تحریروں میں ہوتا ہے ملحق و سبلی اور مسکت بائیں ساتھ بخوبی لکھی ہیں یا نکالنا واپس، اہمات اور نظریات کو رد نظر آتے ہیں، احتشام میں کے بلی، مولیٰ، جلی، اور مطلق، ملحق سے چلتے ہیں ان کے اختلافات میں بھی آپس کی اور رومانی ایسی ہے کہ قادی یا ادب کو یہ اختلاف، مشورہ یا تحقیقات کو آگے کا یہ یا مشورہ (VISION) معلوم ہوتا ہے ان کے اختلافات کبھی بھی پر عمل میں ہوتے وہ، اتفاقات میں والدہ طور پر یہ جاسے کی صورت ہوتی ہے وہ وہاں طرف کی امتیاز سے بچ رہے صورت تلاش کرتے ہیں جن کا محض کبھی بھی شخص پسند و پسند نہیں ہوتا جن کی طرہ کی طور پر کسی شاعر دسب کا جائزہ لیا گیا ہے اولیٰ انھوں سے شاعر یا ادیب کی فکر میں کے تمام کوششوں پر بحث کر کے اپنی رائے پیش کی ہے ان کے اختلاف اور اتفاق دونوں میں یک دلی اور تنہیدی و قدر حادی رہتا ہے کبھی کبھی وہ طریق صاحب کے سے امانیہ (Asides) میں کہا کرتے تھے

کہ آخر انھوں نے عراق صاحب نے اصل میں کوئی ایسی ہی باتیں کہی ہیں جو اردو کے شعر اپنے
میں کر چکے ہوں اس کے ساتھ عراق صاحب کے پاس اپنا ایک انداز میں ہے، کچھ انگریز دہائی شعر
کے Catchwords ہیں اور کچھ نئے الفاظ درجی سب کچھ ہے مگر احتشام حسین نے شاہکار
کے عراق صبر کے لیے ایک مقالہ "پھر جن" کے عنوان سے لکھا تو اس میں یہ بات کہیں نہیں
لکھی اور اس کا کوئی ثبوت دیا شاید اس لیے کہ عراق صاحب ان کے اچھے بھی تھے اور احتشام حسین
مشرقی تہذیب کی بے اداری میں ہے ایسے ٹیبلوں کو قریب کرنا کرتے تھے جس میں احتشام حسین
صاحب کی نظر پر ان کے تفریق طے میں عراق صاحب نے چند عنوانوں میں جو کچھ احتشام حسین
صاحب کے ہے کہ تو اس کا اثر ملد ہے تھا کہ "احتشام کی تحریروں میں کس کی بدولتی ہیں" جو
ایک نندہ۔ عقیدت (Tribute) مگر ہے اور احتشام حسین کی تحریروں کا صاحب بھی عراق صاحب کی
پر تقریر بہت زیادہ حیثیت رکھتا تھا دوسری ۱۹۴۵ء یا ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی تھی

آخری بات۔ احتشام حسین کی سابقہ وچسپوں سے متعلق ہے سلیت سے ان کی اتنی
وچسپیں شائد۔ ہوئی اگر چند سال میں آراؤں کے بعد مجدد بن آراؤں کا سلی نقطہ نظر۔ بدل گیا ہوتا۔
تقسیم سے پہلے انھوں نے ہندوستان کے سلی مسئلے پر کوئی نگری مقالہ تحریر نہیں کیا صرف ایک
مقالہ اس کے پہلے مجموعے تنقیدی بارہ سالہ ۱۹۴۳ء میں شائع ہے جو لیکن ترقی اردو ہند کی
میسری کاغذ میں منعقد ہوا بعد جون ۱۹۴۳ء کے کسی طے میں پر مباحثات تھا جس کا عنوان ہے لفظ زبان کا
مسئلہ اس وقت تک سلی مسئلے پر مابعدہ اس طرح کی کوئی بحث نہیں اٹھائی گئی تھی کم از کم راقم
العرف اس سے باخبر نہیں۔ مگر یہ بھی ہے کہ سلی مسائل خصوصاً اردو کا مسئلہ اور زبانوں کے مسئلے
اس وقت تیزی سے اٹھے جب ہندوستان میں مولوں کی تقسیم سلی بیج پر کی گئی احتشام حسین کے
اس مقالوں میں تو ہم سوالات اٹھائے تھے وہی تھے کہ اردو کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے
لیکن اس کے بعد اور خود کی تو باتیں اٹھائی ہیں لیکن "عام طور پر لوگوں نے اس کے ارتقا
سلی نظریات پر غور کرتے ہوئے معاشی معاشی حالت کی جگہ قند لکھ کر یاد اہم کچھ یہ ہے"
زبان کسی کے۔ کچھ نہیں کی ہے بلکہ معاشی مدتی سر کرنے کی کوشش میں پیدا ہو گئی ہے زبان کی
ضرورت ہوا اس کے کچھ نہیں کہ زبان ایک دوسرے کو سمجھ سکیں زبان کا مسئلہ ادب کے مسئلے
سے الگ نہیں ہے زبان لغات میں ملتی لکھ رہی ہے اور قواعد مرتب کر دیے سے میں سختی ہے اس لیے
تفسیر کا ساتھ دے کے ہے مگر ہے جو اس کی جتنی زندگی میں رہا ہو رہا ہے اگر وہ جتنے رہ گئی تو

س کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی، اگر رہیں تو ایک جلد از ادب میں مشغل کر دیا جائے تو یہ خطرہ بہت کم ہو جاتا ہے کہ وہیں مشرقی ہے یا مغربی پھر ہے، رہیں گے تحفہ کے بارے میں غور کرنے ہوئے جدائی سے بچا سہری ہے صرف سہری کا وہرانا کھلی سہری ہے، دھماکوں کو برا سمجھ کر اس کام نہیں آسکتا۔

۱۹۴۲ء تک اس بات کے مسئلے پر دہلی میں جو کچھ میں نے لکھا ہے اس میں سے کسی میں اور دہلی کے مسئلے پر اس طرح میں سوچا یا لکھا، صریح ۱۹۴۸ء میں احتشام حسین نے حال ہی میں کتاب کا ترجمہ کیا، اس پر ایک طویل مقدمہ لکھ کر "جدو سنی اس بات کا خاکہ" کے نام سے شائع کیا تو دہلی کے نئے مسائل کی طرف ایک خاص دھتک سے توجہ دینی، اس کتاب میں دہلی کی تاریخ، اس دہلی کی جدو سنی کے فلسفہ سماجی دہلیوں سے ہم آہنگی اور مختلف دہلیوں سے اس کے رشتے اور عقائد، اس کی خدائی صورتوں سے ان رشتوں پر ایک منطقی بحث اور دہلی دہلیوں کے انسانی مسائل کا حل، کچھ خوب دہلیوں کی بات جتنی میں ملک کا سب سے بڑا حل اور Convincing بحثیں اس مقدمے میں پیش کی گئی ہیں، اگرچہ یہ ایک جہانی مسئلہ بھی ہے مگر اس میں بھی احتشام حسین کا معاون، عید جہانی اور اسلام، تقسیم والا تحریکی دہلی، اپنی جہاں انگیر اور فلسفہ جہاں کے ساتھ موجود ہے جس سے اسلئے مسئلے کی شکل ہونے کے بجائے تحید ادب کے مسئلے کی حالت میں

مناسب کچھ کہنے کے بعد، جب عمومی محاسبہ کی نظر احتشام حسین کی تحید پر ڈالی جائے گی تو دہلی اور دہلی کا کہ جس تحریر سے اردو تحید کو جلد بخشنا، جس سے دہلی کے اچھے ادب کی تقسیم کے لیے ہمدردی اور احترام کا جدید دیدہ کیا، جس سے تحید کو مغرب کے شاہکار اور اہل کار کر دیا، جس سے ادب کو کہ جس میں تاریخ، ادبی مہارت، علم و فلسفہ کی تحید نہیں اور عمومی صورتوں کو شامل کر کے، اردو تحید کی تاریخ میں گھر اور سوئی کی فی مساجد قاسمی، دہلی احتشام حسین کی تحید ہے جس کی گونج ست دہلیوں تک اور ادب کی تاریخ میں ملتی رہے گی، ان کا نظریہ، جنس، شعور اور فکر کی تحقیق پر گرفت کا تحید اور حیدر دست لال، ہمیشہ تحید کی اہم میر میں ہے رہیں گے

جہاں تک ہو سکتا ہے

نہ دیکھو چشم حسین بوحید حاضر اکبر نہی حاضر

سید عاشور کاظمی

محضر اراکین مسجد حضرت ا

میں اپنی گفتگو کا آغاز پروفیسر احتشام حسین مصوی کے ایک جلسے سے کرتا ہوں جو ہے

" جہاں تک ہو سکتا ہے " میں رات دار ہوئے کی کوشش کر رہوں "

معاذ اللہ! بہت سے اوقات میں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میں کسی موضوع پر

بات کروں " ترقی پسند تحریک کا اس میں ذکر ضرور آئے گا مجھے یہ آرام بھی پیدا ہے اور اس کے

مئے میں جو یہی سنگ داری بھی تکرار حسنہ لفظی دیکھیے کہ آج بھی میں اپنی حرکت کرے جا رہا ہوں

لیکن آج کوئی نہ کہہ سکے گا کہ میں خواہ لواء ترقی پسند تحریک کو درمیان میں لے آیا ہوں اس لیے کہ

حکایت ہم وہاں " فسد " ہم وہاں

کس سے بہت بڑے " خیر سے " ذکر تک پہنچے

پروفیسر احتشام حسین کا کوئی مطالعہ ترقی پسند یا اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے

مطلبے کے مبرا مکمل ہی نہیں ناممکن ہے احتشام حسین کی تحریر و تخلیق کی وہی طرح ہے جو اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کی جب تحریک کی عہد ہوں تو وہ جو ان تھے انہوں نے قلم اٹھایا تو تحریک کے ساتھ اٹھایا وہ اردو جو ترقی پسند تحریک کے عہد یا استاد کا رد تھا۔ سوں سے پورا سنی کے ایک بیور مطبعہ سلوکی میں "آواز" وہاں جب ترقی پسندی حرم قلمی اور سیکر قلمی کے امریکہ میں امریکیوں کے بیوں پر ہو گیا وہ رہے تھے اور جب گلشن قلمی برقی نہ تھا تو انہوں نے سید احمد کے ایک حوالے میں یہ فیصلہ کیا کہ سہ ماہی ہو گیا اور وہی بات کہی ہو "تاج ہمارے" "نی جیل دار" "جانکین رستے میں تو ہم اس کا دفاع کرتے ہیں یہی "ترقی پسند تحریک اپنا کام کر چکی ہے کہ وہ الب انجمن ترقی پسند معصومین کی صورت میں رہی۔ "ہی میں حسین کے عہد کو اس قدر خطر ظہری جیسے ادبوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور احترامات شہداء ہو گئے ان وقت دانش عمل لکھنؤ سے پروفیسر احتشام حسین کی پر اثر اور گہرا انگیزہ دے اختلافت طبع ہوتی تو اس دور کے بوجوان جب ان کے ہمنوا ہو گئے احتشام حسین دور ان کے ہمنوا "ادبوں کی گہری دماغت بخت دورہ" "آئینہ" "گلت۔ اشاعت ۱۳۶۱ھ بمطابق ۱۹۴۰ء میں چھپے والے قیصر عثمانیہ کے ایک مضمون "ادبوں کی عظیم کامیابی" سے ہوتی ہے تحریک و عظیم کی یہ بحث اس حد تک چلی کی بچوں کو ان کا راستہ ہی دھانسی کرنی پڑی ماسی کے اس حوالے کی تفصیلات پر نظر ڈالنے تو پروفیسر احتشام حسین دور ان کی طرح سوچنے والے ادب جو سوال اٹھ رہے تھے "راج مادی سے زیادہ وقت گزرنے کے بعد اس کی فائزیت و صورت کا اندازہ سو اور ۱۹۴۰ء کی دہائی کا طرز میں جب احتشام حسین کی عقل اور عقل ہوتی تھی پر گفت و شنید کی حدت تصویر کی تھی تو جو گہرا نتائج بھی ماسی سے "اس کا طرز میں شاید پہلی بار گہرا خیال کے ادبوں سے ترقی پسند معصومین کے پیچھے سے آواہوں میں نکلے دل سے بات کی اسوں کہ اس کا طرز میں کی گہرا ولی تفصیل طور پر بھی تک شائع میں کی ماسی حالانکہ اس میں شریف اکثر ادبوں کی اسے تھی کہ یہ کا طرز میں ترقی پسند تحریک کی صفراء و معیہ ترین کا طرز میں تھی

صاحبو اگلی تحریک سیاسی و سماجی بوجہ بھی دینی کوں چاہت و فوہ و فوہ پارہ انہیں ہوتی اس کی ابتداء اردو ادب و عقل تک پہنچنے کے واسطے فہرے سے گزرا کہ ختم سے شریک کا ایک دورہ درجہ حاصل ہوتی ہے جس طرح صاحب ختم رہی اور کثرت کے سہ رہیں "آب ہوا اور موسم کے اثرات طوفان کے جاتے ہیں اسی طرح تحریکوں اور کثرت کے اہم موزوں کے بارے میں بھی قدم قدم آگے بڑھے اور حازر ایسے کی صورت برآئی ہے یہاں ماسی کے حوالوں کا مقصد قصہء

پاریس کو دھرا سکیں مگر ان حالات کا عارضہ یہاں ہے جن میں ترقی پسند تحریک کی ابتدا ہوئی اور یہ دکھنا ہے کہ وہ آج کے حالات سے کس حد تک مطابقت یا مطابقت رکھتے تھے ہر نئے سوالات قائم کرنا مقصود ہیں جس پر ماسی کی روشنی میں آج غور کیا جائے

پہلی جنگ عظیم کے بعد مغربی دانش کلاں میں عصری تقاضوں سے یکساں ہیزاری کی شریعت ہو گئی تھی ایک خطہ تو اور ہیٹ ایکسپریس Orient Express اور جیڑ کی جیس اٹھرائی سائنس سے دن سلا رہا تھا اور دوسری وہ کم کردہ شریعت مسل تھی جس کے ساتھ Wasteland کے تر تھری طعنہ انگلے دن، ٹھہری سبیل اور قدس کی بے مقصدیت جیسے ٹھہروں کا استقبال کر رہے تھے ان میں سے کسی کو بھی جھڑی دیا کے مسائل تو کیا، اس کے وجود کا بھی احساس نہیں تھا اور تھا تو اس حد تک کہ آج جن ٹھہروں کو جھڑی دیا کا سہرا جاتا ہے وہ اتصال کرنے والوں کے لیے بھار گاہ کا درجہ رکھتے تھے۔

مغربی ارباب دانش کی اس کم ٹھہری مایوسی ہیزاری اور مدح و تھیبہ کی رقم خوردگی کے اس دور میں، اسی ناقابل توجہ جھڑی دیا کے کچھ اہل نظر سہزادت یونین کے نقاب سے سٹار ہوئے خود مغربی ممالک کے کئی اہل دانش نے اس انقلاب کو ٹھہری ہوئی سیاست کے لیے عمر غیبت تصور کیا۔ گویا جس وقت یورپ مغربی بحران کا فطر تھا شہزادوں میں مڑی پھلتی ہوئی تھی ہسپانیہ کی ملانہ جنگ سے دل برداشتہ ہوئے والے عمر غضب و اسبیت، دن اضطراب کے اسیر سبکیت کے سلاں جانب میں پناہ گیر بن رہے تھے اس وقت ایشین یونینوں کے دلوں میں بابت کی کاسے ایک جدہ تصویر مہم سے رہا تھا حاصل وہ دشواری سنیں مقرر کی حدی تھیں دلچسپ بات یہ ہے کہ مرقی پسند تحریک کے آغاز میں ہی یورپ ایک اور خوفناک جنگ کی ہیٹ میں آگیا اور مدبران آفاقیت کی نیندیں ناسی جوتوں کی چپ و در حرم ٹھہری کی مددی سے اپٹ ہوئیں اور وہ ٹرہ وجود میں آگیا جس کے ہوناک سامنے الی ایس ایلیٹ اور ٹھہری (Wysten Hugh Auden) کے ٹھہرات کو مریدہ سبکیت میں پناہیے، مجبور کر رہے تھے

خوش قسمتی سے، عصر کے ادبوں سے جرتخ کے اس اہم موڑ پر سام آقویت و ٹھہرت خوردگی سے اس پکار ایک ملع حوں تصویر سے کام لیا میری مرد ٹھہری ترقی پسند سٹھہری کے قیام سے ہے۔

ماجو، زندہ قومیں اپنا کاسبہ خود کرتی ہیں ماسی کی غلطیوں اور لوگڈاٹھوں کا حساب

مستقل کی تعمیر میں مدد دے۔ اسی جذبے کے تحت یہ سوشل محیر معذب نہیں کہ تحریک کے
 بیوں اور عام طور پر عہد کے آئے والوں سے بہت کچھ نصیب کے بیوں میں گئے پر کبھی توجہ دی کہ
 تحریک، معیشت کے عناصر میں کدہ مالی عناصر کی اہمیت، تجارت اور پیشہ جیوں کے عناصر
 میں ایک عہد انہیں تحریک تھی اور ان لوگوں جو "انٹرویو کرتے" حشر میں ہوگا، محشر بھی "کے کے قافلے
 یا قابل تھے کہ قافلے کے ساتھ ساتھ کسی مہلک شہر کو بھی اپنے اور مہلک معیشت کو بھی اجدا
 سے ساتھ لے کر چلنے تو کون جاسے یہ تحریک اور معیشتیں یا مہلک کے معیشت کی ایک ہل کی کائنات
 ایک مالی تحریک تھی اور تحریک کے متقدمین اور بعد کے آئے والوں کا لہجہ جو کبھی ناقابل برداشت
 عہد تک مدد دیر اور کبھی محدثت خواہاں رہا ہے۔ ہوتا اور طاقت، حیا پرستی، اور نسوانی توام پرستی
 کے مقابلے میں سپاہ یا صحت پسندی کے جو مظاہرے تھے جو رہے ہیں وہ شاید۔ ہوتے اس دور میں
 مغرب کے ایوانوں میں تو اتنا سامنا تھا کہ وہاں کے معیشت یا توسل آدمی کی تاریخ عرب کرے میں
 لگے ہوئے تھے یہ محشر ایسے رہاؤں کے آلودہ تھے حب بھوں، کشمکش، بیویوں اور عورتوں کا
 وجود کبھی رہا جائے گا (یہاں پر میکس بیرام (Max Beerbaum) جی جی وینر اور خودی ایس۔
 ایلٹ کے نام لے سکتے ہیں) اور وہ عقاب سے بھر کر کہتے تھے آخر کار وہ سال کے ساتھ کے عہد ۱۹۵۰ء
 کے زمانے میں 'Angry Youngmen' (غیر مطمئن حیدر کی جہ میں اور لہجہ ان لوگوں کی
 انہیں سے پر کیا

جو کتاب ہے آپ اسے میرا خوب ضروری ایک ایسے مسرہ خوب ضروری امید ملنے
 ہوئے آخری چرما کے بچے کے عہد بھی رہوں پر اس کا شغف، عہد ضرور ہوگا، رہے ضرور
 نظر آئے گا

عامیوں میں خودی سے منکر میں ہوں کہ ایسے لوگوں کی تعمیر دور کی بات ہے جواب
 دیکھا بھی کیسا قابل غور معاملہ ہے کہ ۱۹۵۵ء کی لندن کانفرنس کے عہد میں سے تو، ویشن کی تھی کہ
 مغربی ایشیائیوں کو محشر میں لاکھ چنانچہ حکمران اتحاد کے قتل سے Ack Landda) جیسے شرہ
 آفاق اورب کی "شیر" اور دستگیریں اور کراہیے انہوں کی شرکت سے سولہ میں ہے حاصل
 ساتھیوں کو قاتل۔ کرنا جس میں اس صورت حال سے بڑی سبب ہوں ماضی کی لڑکھائوں سے
 میں سے یہ سیکھا ہے کہ بات انہیں ترقی پسند معیشت کے عناصر کی ہیں۔ بات انہیں کی رکیت کی
 بھی ہیں کہ بات میں ترقی پسند شعور کی ہے جو اس تحریک نے انہوں کو لڑا یہ شعور جو میں پہل

نکھر ہوا تھا، انہوں نے اسے دھرا لیا اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس شعور کی آبدلی کی جائے
 برصغیر کی تحریک آزادی اور مٹنی مٹک کے تندی انتشار نے صاف مدی قبل جس انقلاب کا رستہ
 ہوا اس کا اسی ترقی پسند شعور نے اسے گھر سے محل کی منزلوں تک پہنچایا، اس صورت حال کی
 جھلکیں احتشام حسین نے "ارب و سلیج" میں پیش کی ہیں بہت حد حاصر کے گہری اور بلی خاطر
 کی ہو رہی ہے تو اب یہ سوچنا ہے کہ مطرب ایک بار مہر مٹائی مد علی کا نظار ہے جو کئی ہفتوں
 کے استعمال پر پانڈی کے معابدوں نے مٹنی مصیبت کو حملہ کر دیا ہے اور مشرقی ملک کی فکست و
 رکت پر لٹوئے، بجائے والے اپنی مٹائی مد علی پر پریشان نظر آرہے ہیں۔ آج مہر مطرب کے
 ایوانوں میں اجالا کرے کے بے مشرق کا نور نکھرے، سو عراق کے سنے حوام کا ہوا بندو سنے کے
 مسئلوں کا، سر حال عیسوی دیا کی رگوں کو نچوڑ کر ہی حاصل کیا جاسکتا ہے بلکہ کے گیس چیمبر
 (Gas Chambers) بھری مسجد کا اندام، جندو سنے اور بوسیا کے مسئلوں کے ٹوں سے بولی
 کھینچا یہ سب در ایسے سارے واقعات نظیر قوم پرستی کے شمسائے نظر آتے ہیں لیکن حقیقت
 کا شرم کے مطالبے ہیں چھوٹی قوموں کے سروں پر مالی قوتوں کی خمیر حوں آٹام ٹنگ رہی ہے
 اقوام متحدہ کی حیثیت ایک در شیمپ سے راجہ سیں دہی لب دندگی کے برادر قرض پر اعتراض
 کرے والی کوئی طاقت کرہ ارض پہ ملتی سیں دہی برہی قوموں کو گھرمیں میں بانٹ دیا گیا ہے جو بلی
 میں دو عقد اس حالت سے دوچار ہوئی جائیں گی چنانچہ اب ترقی پسند شعور کے حوالے سے ادبوں
 لی دمر دار میں بڑھ گئی ہیں اب سیں یک بار مہر بلی تحقیقات کی سمت متعین کریں ہوگی اور اس
 مدد ملیں پر کوئی نظر رکھی ہوگی

یہاں پر احتشام حسین رصولی کے ایک مضمون کا حوالہ لے جا۔ ہد گانہ اموں نے ایک
 انگریز کے سوال کے جواب میں لکھا تھا

"میں اپنی ناک کی تسکین، دو پسندی کے جذبے سے سرشار ہو کر سیں بلکہ سماجی
 حالات اور اس بارے میں اپنی شخص اور ذاتی دمر داریوں سے مدد لے رہا ہوں گے ہے
 لکھتا ہوں"

اس نئی "ذاتی دمر داریوں سے مدد لے رہا ہوں گے" ہر لب کو، سر و اجا کر کرنا ہوگا
 اور اپنی فکر کی سمت متعین کریں ہوگی تحقیقات کی سمت متعین کرے سے سہلی مرد یہ بالکل سیں
 کہ ادب شخص نظریات و تصورات کی تحقیق کا اس حد تک پلندہ ہو جائے کہ اس کی اپنی فکر کے شہر

عمل مابین ماسی سے ہمیں کسی سبق ملے کہ اہل روایت و بیعت اور اپنے مشاہدات پر اعتماد کر کے
 شکار آ کر دہ تخطیعی عمل سے گریباں اچھا وہب تحقیق کرتا ہے اللہ صحت کا تحقیر ہو تو سے معرفت
 وہب تحقیق کرنے میں جو وقت کا رہیں ہو سکتا ہے اور بے ی سے بچ سکتا ہے فکر کی صحت
 متعین کرے کے مسئلے میں ماسی کی شدت پسندی کا حال یہیں ہوں اور عقلیں ارمیں عقلی کی رائے
 سے متعلق ہوں حال تک پلاچ ۲۰۲۰ء ۱۹۹۰ء کے تک تک اسوں نے اپنے کسی معنوں میں لکھا
 تھی

”اگر ترقی پسندی کسی حد سے نکلے اصول کے تحت ہر مسئلے کا دو ٹوک فیصلہ کرتی ہے

اور ایک ہی لادھی سے سب کو ہانپتی ہے تو وہ ترقی پسندی ہیں“

خود پروفیسر احتشام حسین حمید دہلی حمید میں لکھتے ہیں ۔

”ہر وہب اپنے سماجی شعور کی بنا پر اپنے عقلی رشتے میں اور اپنے معاشرتی عقائد

کی روشنی میں یکساں مسئلہ پیش کرتا ہے“

بھر لکھتے ہیں

”ہر وہب کے احکام اور احتساب کے اپنے اصول ہوتے ہیں“

اس اعتبار سے پروفیسر احتشام حسین کو نگوار احمد زبیر، احتشام حسن سے دوسری کششیں
 نظر آتے ہیں ان کا بھی اسلوب و بھی طریقہ اسکی شدت ملا تھا ہے اب باقیہ مدیں احمد کا
 یہ اعتراض کہ ”احتشام حسین نے جو کچھ لکھا مدیں کا طریقہ ہے اس سے پاس ہی کچھ ہیں“
 کی طرف غلط یا صحیح ہے جیسے انھیں کی پوری حرکت کے متعلق یہ کہنا۔ دو نمونہ ست پانی کے صبر میں
 نہ صاف تھی میں ذاتی طور پر پروفیسر احتشام حسین کے اس میں عمل کا قائل ہوں کہ
 ”میں تک ہو سکتا ہے میں دیانت دار ہوں کی روشنی کا ہوں“

اس بیان میں قابل توجہ الفاظ ہیں ”میں تک ہو سکتا ہے“ کاش مدیں نے ان کے کرمی
 قدر ناقدین بھی کی غرور چلی کے ساتھ اپنی محروم کی حالت سے احتشام حسین دھولی
 باقیم الدین مدیں کے دوسرے اعتراض بھی کے اور طرح عمل میں سے ایک آواز جمع بھی ہو تو
 بھی ان پر مصلحت اندیشی یا صبح و صبح کا صلب رکھے کارہم میں لکھا جاسکتا کہ ان کی عقلیت
 مدد رحمت کے قائل تھے اور اسوں نے اس عقلیت و رحمت کو ہمیشہ قائم رکھا اور ”میں تک ہو سکتا
 سے“ کی عاجزانہ عدالت ہمیشہ ان کے ساتھ رہی یہاں تک کہ وہ میرا بھی کے مرتد سے بھی

داسن آرنکس مشیر ماش کر۔ سے امراد جونی کی طرہوں سے بھی ہے اور ملکی معاشیہ سے بھی (روئے جس کسی کی طرف ہو تو رسید لیں اور سوچئے۔ تہ کئے تھوہیں کے متعلق یہ بت لئی جاسکتی ہے۔ یقیناً۔ سے تو ہر وقت باطل ہے ہر دار لکھ حضرت کی عیب میں برائی لکھ دہل کر دیکھئے کئے وہی ناہانوں میں ادب کے دانش لکھات ماسے نظر آئے میں ۱۱ اس رسم ہوں کی مقبولیت سے اور Genuine Writers کو نقصان پہنچا رہا ہے وقت کے گھسوں پر سوچئے اے ادبوں اور قلم کی حرمت کے پاس رہتوں کو پہنچے دھنیا دار ہے

عام اس وقت پوری کی قسمت و رغبت کے بعد سے زیادہ تر ادب اس تجربے میں لگے ہوئے ہیں کہ موجودہ صورت حال بدتر ہوئی قسمت ہے یہ مصلحت کی بنا پر۔ میں اس تجربے کے خلاف ہیں ہوں لکس اس کے ساتھ ساتھ اس میں دشمنی کی حسرت کرنا چاہتا ہوں کہ اس مخالف پر پہلی خواہ حکمت عملی کے باطن ہوئے کی وجہ سے ہوئی ہو یا کوہ بلو کے ناقص ہوئے کے جب اس پہلی کے نتیجے میں ظاہری فتح حاصل کرے والوں کو جو مطلق انعطاف مل سکتی ہے اس کے مقابل ہر اور صرف تجربے کے عمل میں مصروف رہنا اور مسلسل مصروف رہنا توئی دشمنی انصاف میں ہیں پہلی معوں کو اس سر کو ترتیب دنا ہوگا جی جی خدمت عملی وضع کرن ہوگی اور جس کے خلاف دفاعی اندر اختیار کرے کی بجائے ہمیشہ قدمی کرن ہوگی آئین کے یورپ میں خود یورپ والوں کی توقع اور Planning سے کہیں زیادہ قسمت میں رہا ہوئے وہی مدنیوں سے حوصلہ کو اہم میرٹ کا امیر کر دیا ہے اب ہماری حکمت عملی ہے ہوں چاہئے کہ اس بدنام اپنی فکر کو اپنی معوں تک مصلحت۔ رہیں بلکہ مغرب کے ان روش دہل اہل قلم کو بھی ساتھ لے کر چلیں جو آئے و لے طرہات کا اندر دکر رہے ہیں

اس سلسلے میں کہ شہ مال ادب سے اب بدنامی کی تھی اور مغربی دنیا، مغرب اور بد صغیر کے ادبوں کی خدمت میں ایک جہل، دہل و گئی تھی کہ وقت آئے پادش چل پڑا ہے اور دہل لے آیا ہے جنہاں جگہ اور ملاؤ غل سمجھتے ہیں جیسے عالمی لہجہ کے تحت وہ صورت حال پیدا ہو گئی ہے کہ جیسری دنیا میں مستقبل میں پیدا ہوئے والے بچے طوطی ملائی گئے میں ڈالے پیدا ہو گئے (چیک و بیلنس) کا نظام حم ہو گیا ہے اب لے دے نے صرف ادبوں کا ہی ایک طبقہ رو گیا ہے جو اس طرح کہ میں پہلی کی آواز بلند کر سکتا ہے۔

ہم سے اتنا ہی کی تھی کہ اہل قلم صورت حال کا جائزہ کرنے ہوئے اپنی آواز اور جواز

محدود نظری سے ہٹ کر دیکھنے والے کے ہاتھ جو دھرتی اندلی مسزوں سے گزر کر محل کی طرف قدم
 بڑھایا جاسکے جس نو دھکی اس اجتن میں حاضر ہوں گا اور اس رسم میں موجود کینڈ سے تشریف لائے
 ہوئے ہمارے درگ دکھار جو شید عالم صاحب کی تصدیق فرمائیں گے کہ کینڈ امریکہ اور پورپ
 اور افریقہ سے مسافروں میں اجتن میں نہیں گئے اور ہم کو آپ سے جوان کمٹوں کا مطالبہ کریں
 گے یہ قیام و مقام کا اس ہے کہ ہم سب قوبے چلی سے اس اعتبار میں ہیں کہ کوئی احتشام نہیں
 کر دلی گھر و نظروں کے راستوں میں جس اور مطلق تعلیق کی علی ہوئی دیواروں کو کرادے
 ہم مغرب میں گناہ جب قوبہ سمجھ رہے ہیں کہ فاضلزم کا سیلاب ایک بار پھر ہمارے
 گھر میں تک پہنچ گیا ہے کیا اب بھی اس گھروں میں بنے رہیں گے اور سے روئے گے بے گلی مل
 کر نہیں چلیں گے؟

صاحبو! ہمارا موقف تو بڑا واضح ہے :

اب ، ریوں سے نکلیں گے نئے شمس و لہر
 ہم نے ڈکے ہوئے گھروں کی قسم کھائی ہے

(ار قاضید "راپی" ۱۱ نومبر ۱۹۹۳ء)

کراچی
 دوسرے

بہی ہو مل جنگ
 آئی آئی چہرہ سگر رونا

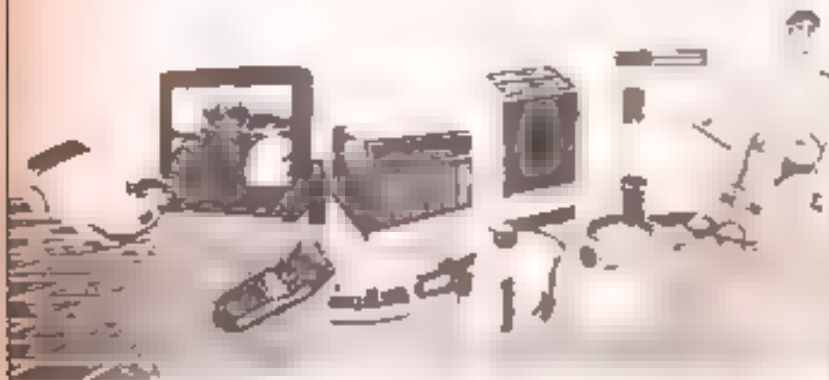
ارتقاء دستیاب ہے

حاس ایڈ حاس
 دیگل چوک

کعبہ دنیال

عبد اللہ ہارون رونا

خسرداری کا نادر موقع چند قدم کے فاصلے پر!



تقاریر، اسٹاکس، ایکسچینج، بینک، سٹاک
مصرفات، مالی خدمات، بینک، سٹاک
محکمہ، کاروبار، خدمات، بینک، سٹاک
تقسیم، کاروبار، خدمات، بینک، سٹاک

وچر، کاروبار، خدمات، بینک، سٹاک
تقسیم، کاروبار، خدمات، بینک، سٹاک

ڈیوٹی فری شاپس (پرائیویٹ) لمیٹڈ



Branch	Address	Phone	Telex	Facsimile	Branch	Address	Phone	Telex	Facsimile
Branch	Address	Phone	Telex	Facsimile	Branch	Address	Phone	Telex	Facsimile
Branch	Address	Phone	Telex	Facsimile	Branch	Address	Phone	Telex	Facsimile
Branch	Address	Phone	Telex	Facsimile	Branch	Address	Phone	Telex	Facsimile

زمانہ حال کا ادبی تناظر اور احتشام حسین

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

زمانہ حال کی حدود کا تعین کبھی بھی بہت زیادہ آسان نہیں رہا۔ آیا ہمارا زمانہ حال انٹرویو
دہائی سے شروع ہوتا ہے جو مائیکرو لیکٹرانکس اور خورد میاتہات کے میدانوں میں بے مثال ترقیوں سے
عبہات ہے یا بعد معنی دور Post industrial کی ابتداء سے پیل ساٹھ کی دہائی سے کرہ ارض کی
سطح سے زیادہ طاقتور تہذیب، مغربی قوم، جس کی اس سائنس اور ٹیکنالوجی پر مشور ہے ایک
طرف انسانوں کے درمیان دلی استعداد کے موردی نظریہ کا حاکم کر رہی ہے۔ اور دوسری طرف دو مغربی
ہلاک کی معاشی طاقت کو ہانک رہی، ہمارا داری کے در اثرا سے پر کمر بستہ ہے۔ جیسری دنیا کے غریب
ممالک۔ صرف نو آبادی دور کے حاکم کے بعد "نو گلوبل" زمانہ کے داغ کے عزات سے نظم
گنہیں بلکہ خود اپنی میراث اور اس کی ہائے سند میں بھی معرط شک میں ملتا ہے ۸۹ ۱۹۹۰ء میں
مشرقی یورپ میں جو کچھ ہو اس نے ریا کو بڑی حد تک یک قطبی (unipolar) بنا دیا تاکہ رکھ رہا ہے
اور سرد جنگ کے زمانہ کی معاشیتیں، جو اکثر و بیشتر چھوٹے ممالک کی عزت نفس کی حالت کا اختلال
بہت بن جایا کرتی تھیں اب ایک قطبی دنیا کے ایک سمتی بل ڈور (Ball Dozer) کے سامنے پکڑیں
مستدرجہ بلا صورت حال کا ایک مطلب ہے کبھی یہ جاسکتا ہے کہ اب دنیا امریکی یا سوویت

بالوئی کے پاسے اقوام متحدہ کے جسر دیہاتی سب سے بڑی حالت کے باہر ان کی خلاصہ بن چکی ہے
اور حارسہ حالات ان کے ذہنی تعداد اقوام متحدہ کی مقامی کمیوں کے میں الاقوامی ایڈیشن بن چکے
ہیں

کرپوریشن حشام مسیح کے انتقال کے ۲۱ سال بعد ان کی سالانہ رتبہ کا جائزہ لیا جائے تو
یوں نکلتا ہے کہ ان کی بددی کے قومی رسوم میں پہلی مرحلہ بنی و دنیا کی کمزری پر دیکھی جانے والی
جستہ جاری تھی اور شرفی پہل کے بعد ان میں مرید کے خلاف سے بڑے مظاہر کے سال تھے ۲۲
جولائی ۱۹۹۰ء کو بعد پہلی میں "سیارہ" میل میں آتی اور پہلی ۱۹۹۰ء میں بعد پہلی محمد اور
کسی گشت ہو گیا۔

کہا جاسکتا ہے کہ سید حشام مسیح کا انتقال ان کے بعد کے دور شباب میں ہوا
امریکی ادیب اور ناول نگار جے جے ہام کے بعد اس کی حق بنے خود چاہتے تھے بعد کارٹون سے
جولائی ۱۹۹۰ء کے بعد روس کے شعل سسٹم سے سحر میں ہے اور است خلق قاتل اور ان کی حد کا
اعمال آیا جو فلسطینی میں انقلاب ثور ۱۹۹۸ء پر فتح و دینا و سری سہ جنگ کے باوجود
جنگوں Proxy wars کے ایک ایسے گرداب میں پھنسی جو یہ ان انقلاب ۱۹۹۰ء کے بعد مرید
چچہ در پیچ ہوتا تھا اور ان صورت حال میں جس دن یہ لکھنے سے سب سے زیادہ ملکیت حاصل کی وہ دینی
تخلیق کے متن (Text) کے حالات اپنی مباحثوں سے ظاہر ہوں اور اس میں کوئی مطلقہ اور آسٹریا کی
مخصوص لکری لکھ میں پڑا ان چارے ہوئے یہے نظریات سے آگے نہیں ترسے (بظان The
Text underground) کی کوششوں سے موسوم کیا جاسکتا ہے رحمان اور مرثیہ اور خود مشرق
ادبہ کی کثرت سے کی یہ لکھنے کے خلاف سرکیت اور اس کی بددی پر مبنی اور ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۳ء
تک کے بول خطبات کی سرست میں ایک بھی ایسا بول نہ ملے ہیں یہ اس سے پر خلعت
(Pritchett) کے اس قول پر عمل کیا ہو کہ "صرف یہ ہے کہ ان کی قوموں کے سبے لکھتا
ہے ہم دیکھتے ہیں کہ دیا اس کی حقوق کی ہم میں بعد راج امرو کے ساتھ جنگ طویل اور جنگ
طویل دو م کے دو پہلی رسوں کی "مٹی گھری سجدی" کی طرف جاتے ہیں "مشرقی یورپ کے
سحر میں یہ تعداد میں بعد راج امرو سے بھی یک لکھی ہیں اور ایک ایسے ہیں الاقوامی اپنی سماج
اور سال زندگی کے کشمیر مسیح کی طرف توجہ دلائل جو اس سے پیشہ بھی موجود تھی لیکن اب اس
کے یہ دین الاقوامی سیاست بھی موجود تھی جو اسلئے اقدار کے مٹی کو بھی سمجھنے کے مدد یا غیر



کٹر جد علی صدیقی، منہ سن، درویش، ڈاکٹر ایم ایچ صفی، اہل خانہ، منہ سن، درویش، ڈاکٹر ایم ایچ صفی

مردب گراتے پر آسانی تھی جسکے کہ دس پندرہ برس کے بعد انڈر مالفیٹ (Muliphar Effect) پیدا کرے والی تدبیر کے کلاب ٹیکنالوجی نے جس نے فلسفہ کو بھی ٹینک مارا تھا۔ انسان فکر اور وہ کو بہر حال وہ اہمیت ضرور دی جو اس سے پہلے "وجودیت" اور نرانی انفرادیت پسندی کی بدولت انسانی تدبیر اور ہمت کے اٹھائی تیر کی ملی کر رہی تھی

اگر ہم درست نام کی جنگ کے عاتق (۱۹۷۱ء) کے سال سے "تج" کا علاء شراع کرنے پر تیار ہوں تو یہ دیکھیں گے کہ اس عرصہ میں جو تقریباً ۱۸ سال پر محیط ہے کیا کچھ نہ ہوا نہ جانے کتنی ہی بد حالاتیں، امریکہ، چین اور روس کے سرحدی تنازعات، درگزر اور لاطینی امریکہ کی Proxy Wars سے یوں لگا کہ انسانی تدبیر اپنے مختار پر مبنی مشغلی ہے اسٹریٹجک آپشن (Strategic Option) کے نظریہ نے دورانی طاقتوں کے عظیم قلمروں کی اپنے سروں پر سے گرنے دسپہ کا جو رہ پیدا کر رہا تھا اور علی ادب سے وجود دور مشرق میں ہوا مغرب میں "اپنے بہترین ٹھک دماغوں کے درمیان طاقت کے درمیان تدبیر انسانی کی سراسر بازی کے نظریہ کا تسخیر اڑانا شہد کیا اور وجودیت کی دوسرے جو جنگ عظیم دو نم کی ہوتا کیوں سے روک پڑ گئی تھی "آخری جنگ" کے خطرہ کے باعث تدبیر

امریکی کی مثال کے لیے جو واحد کامیابی اب (Ecological Balance) کے خاتمہ کے حالات پر ابھری ہوئی ہے اور (The Greens) منظر عام پر آئے۔ امریکی کی جگہ نے جدت کو خاصہ کمزور یا ہمارے برعکس کے لئے اور دیگر ممالک کے لوہے میں بھی "مکمل" مسائل پر رد عمل کی برائی سے یہ بار محسوس کر دیا کہ اپنے ممالک کی تاریخی قوتوں کی تقسیم اور مقصد (Currents) میں سے کسی ایک رو کا انتخاب جو بہتر اور اعلیٰ ہو رہی ہو ہے اور اس میں ہر دوسرا احتیاط مسکن کی گہرائی میں ای قدر اہم ہے جس قدر کہ ان کی زندگی میں تھی

اسی نظریہ میں سید احتیاط مسکن کے بعد کا دور، مگر یہ، منطق میں سہولیات اور شکایت سہولیات اور اس کی تاریخ اور سہولیات اور حسب کے تعلق سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ سید احتیاط مسکن مواد اور صحت کے مطلق استخراج کے خواہ لڑاؤ، فاضل میں تھے۔ بعد ۱۰ سے تاریخ کے (Canvas) پر نظریہ (Theory) اور عمل (Practice) کے جوڑ کا مسئلہ سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مطلقاً حالی کے مسائل کے آخری پھر جدول کو جو بینک کے لئے ہمارے اور غیر قدرتی رجحانیت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے، مواد اور صحت کی آرزو کیا تو بعد حالی کے حالات پیدا نہیں غالب کے میں بھی آزادی کے لیے خارجی حرکت، سحر، نظریہ، آقا اور شاید اس نے کہ غالب سے سیاسی غلطی کے خلاف اپنی فریب کو جس ممالک میں وہ دنیا تھا، "دراستی شعری" میں ہوتے ہوئے بھی حصولی اصلاح کی سادہ تھی اگر ہم (Theory) اور (Practice) کے درمیان عدم مطابقت کے رجحان کو پہ ۱۱ تک لے آئیں تو ہمیں ۱۲ کے بیشتر اپنی اور گہری مباحث اور سیاسی انقلابات میں جس سے پہلے ہم مشرقی اور پ کا انقلاب ہے، مندرجہ بالا گہ میں سامنے ہیں

سید احتیاط مسکن کے بعد ہمارے تجدیدی سفر میں صحت پر مبنی اور اسلوب پر مبنی کا عمل اصل رہا۔ ہماری عقیدہ سے ہماری اپنی مخصوص اپنی اور گہری مباحث کا عصر قدرے کم ہوا۔ ترقی پسند عقیدہ تو سہولت اپنی رجحان پر گہرائی میں جس صحت پر مبنی ہے وہی اس سے حرکت فرشت، انھوں نے اس طرح "ہیرس کے بیٹ بینک اور امریکی صحت کے مسائل" اصطلاحی وضاحت کے مسائل بھی ہماری تجدید میں اس طرح در آئے تھے جیسے ہم ایک بھی صحتی ممالک کے قلب میں شامل ہو چکا ہو، ہمارے میں فکر و ادب تکنیک (Technique) اور وہ نفسی پرورش (Diagnostic Reports) میں کر رہا ہوا۔ اس حوالہ پر ہم کہتے ہیں کہ سید احتیاط مسکن کے بعد بعض ممتاز ترقی پسند نظریوں کی نئے اپنی مباحث کے باب میں سس انگریز کی وجہ سے سرکاری دہائی میں

مسائلِ مباحث نے وہ اہمیت اختیار کر لی جو اس سے پہلے ملید تھی اور یہ بات بذاتِ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارا ادب اس گھٹیل و شیخ (Global Village) میں ملحقِ حدیث کی گھری و آگاہی میں کر رہا ہے۔ بیشتر آزاد ملک کے اردو کا یہی حال ہوا خود اردو ادبی قوم پرست امریکن ازم کے سامنے سرسجود ہو گئے۔ جب ادب اور زندگی یکساں طور پر ناقابلِ تفہیم بننا مقصود ہو تو یہ ضروریات اور معصومیت کا سوال اہم ہو جاتا ہے۔ دورِ احتشائی کی مطلق مولانا عبدالجبار آگاہی نے خواہ مخواہ سین و صغ کی تھی انہوں نے کہا تھا کہ میں دور میں سید احتشام حسین سے بڑھ کر تو نہیں اور کیا ہوتا کوئی ان کے برابر کا۔ ان کی فکر کا کل آنے والی نئی بات ہے میں اپنے حلقہ کو دہراتا ہوں کہ ہمارے یہاں عقیدہ بہ مشیتِ حق کے "دورِ احتشائی سے" نہیں اور میں کہیں سے آئی تھی اور دو کا موصوع ادب اس موصوع پر مفہم خٹائے گا اور اس فن کے بچوں کے نام کمانے کا اردو والوں میں عام علی شان والا احتشام حسین کا ضرور آنے کا فروغی کو تکہ پوری نے کہا تھا کہ عالمانہ تجزیہ کی حد تک احتشام حسین کے بغیر مکمل نہ ہو سکے گی صلاح الدین عبدالرحمن نے انہیں دارالمصنفین اور مغربی تعلیمی مراکز سے یکساں استفادہ کرنے والا تصور قرار دیا تھا لیکن ہم آج دیکھ رہے ہیں کہ سید احتشام حسین کا گہری پس منظر سارے فی سلسل کے لیے عطا ہوتا چلا جاتا ہے دارالمصنفین کا ورثہ تو ایک طرف رہا اب فارسی و عربی زبانوں کو ہمارے انکوں سے نکالا جا چکا ہے اور غالباً اُردو وقت آچکا ہے جب غالب اقبال اور فیض کی شعری زبان ہمارے لیے لاطینی اور یونانی زبانوں کی طرح ہو جائے گی اگر ماحول یہ ہو تو یہ ضروری مسایات اور معصومیت کے مباحث ہی اہمیت اختیار کریں گے۔ سید احتشام حسین کے پہلے عقیدہ کی مجموعے "عقیدی جائزے" (اشاعت ۱۹۸۵ء) سے "اعجازِ نظر" (۱۹۷۳ء) تک سات عقیدی مجموعے شائع ہوئے اور انہوں نے مجموعے "روانے" امریکہ کا سفر نامہ "ماحول اور سمندر" اور کچھ ترجموں کے علاوہ بعد از مرگ تصنیف "ادب ادب کی عقیدی تاریخ" (۱۹۸۵ء) تک کے مضامین میں ایک مضمون بھی لسانی تجربے کے کتب گہر پر نہیں ہے۔ سید احتشام حسین نے پارٹیکلپٹیشن اور باڈی کاؤنٹس یا ہے فن کی محرومیوں میں خود احتشام حسین کی طرح لسانی تجربے کے اثرات میں تھے لیکن ستر کی دہائی سے نوے کی دہائی تک ملحقہ عقیدے کے مباحث مشرقی ادب کے روحانی و ترقی پسند مباحث سے یکسر مختلف ہو گئے۔

احتشام حسین کے زمانہ ہی میں جدیدیت نے جس نوع کی اعلیت (Subjectivism)

ذاتی حسیت شروع کر دی تھی اس کا ایک اپنا مطلع نظر ہے اس مطلعِ نظر کے حقدار رنگ (Shades)

موجود تھے احتشام مسکین کے صدر میں اردو عقیدہ میں نفاذ و دستِ آبی ہے اور وہ اس کا یہ خیال کہ "ادبی روایتیں تاریخی اور سماجی سبب اور میدان میں معاشی صورتوں سے جڑی ہوئی ہیں" سماجی تدبیروں سے نہ بھٹکتے ہی سے فن کاروں کی "ادبی حیثیت" کچھ نہیں "تسلیم" کی جس سے ادب ختم لیتا ہے سید احتشام مسکین۔ معاصر ادب کے بارے میں فرمایا تھا

"معاصر ادب میں شاعری، تجربہ، اپنی، سام پر مبنی، تعلیمات پر مبنی اور مقصدیت سے مستحضر کوئی ہے۔ یہاں تک کہ "کی شاعری" کیلئے دئے جہے تو سب سے الگ رہنے کے لیے شاعری کی کئی روایات سے پھٹنا توڑنا ہے جس میں ان کا نقطہ نظر اروپ اور امریکہ کے کچھ فلسفیوں، معضوں، و شاعروں سے ملتا ہے۔ اور جو کچھ وہاں بچکا ہے اس کو ہمارے فن و فنکارانہ جہان سے بدلتی ہوں صورت حال میں جدید شاعری کی جسم قدرتی ہے مگر محض مادی یعنی مستقیم (Formalist) شاعری و "نئی" کہے کا اصرار کچھ نہیں کہ وہ نہایت سب سے جو مادی کی قدروں کا مطالعہ کرتی ہو اور سماجی شعور کی راویں روزگاری ہو ان شعرا میں جدید شاعری کی تحریک میں شامل ہیں کچھ وہاں جو پچھلے یا تو "نئی پسند" کے جاتے تھے یا عصرِ حاضر کے عمومی تغیرات سے متاثر تھے کچھ ایسے ہیں جو سماجی شعور کی مصلحت میں آتے ہیں مگر شاعری کے لیے نئے تجربوں اور نئے مسائل، اظہار و روایت میں وہ کچھ ایسے ہیں جو وہاں امیال، فن، کے سبھی عناصر کو نو نیا ہے شخص کے ثبوت سے بے ضروری کہتے ہیں وہ اس بات کو نہیں مانتے کہ کوئی شاعر اپنے احساسات و امن میں کسی امن خاطر کر سکتا ہے اس لیے اظہار ہمیشہ نامکمل ہی رہے گا۔"

اگر احتشام مسکین کی مصدقہ بات دیکھیں تو معاصر مکتب کا سب سے بڑا بھی شاعر کیا جائے تو بلاشبہ اسے قائم کی جائیگی کہ گذشتہ میں انکس جلد میں سب سے تعلیمات کی شاعری شری علم طور واحد و سید شری علم، اہمیتات مکتب، فن طرز، انتقاد اور اس مکتبیت کے تمام مکتب میدانی طور پر بحث (Form) کی مختلف انواع شکلوں ہی سے عبارت ہیں۔ سب سے تعلیمات کی مطلق و شگن سائنس سے (Linguistic Reconstruction) کا پر اور دستِ آزمائش ہے اور اس کے نتائج سے مستفاد ہے و شگن سائنس سے (Tractatus) میں روایتی زبان کے بارے میں جو موقف اختیار کیا تھا اسے دوسری تصدیق (Philosophical Investigation) میں واپس لے لیا یا تھا اور اس طرح قابل

تصدیق دیاسیانی زبان پر اصرار ختم کر دیا گیا تھا۔ ستر کے دہائی کے آخر تک اس نظریہ سے دم توڑ دیا اور ہم سے دیکھا کہ اس نظریہ کے بیشتر شجر ۷۰ سے ترقی ظہور میں شاعری کر کے کی سوسٹ ہی پر اکتفا کیا۔ یہ سوالات ماضیات کا توں بارے میں ہیں ۹۷۶ میں سہ ماہی اور قی الامور میں شائع ہوا ہے۔ سلسلہ مضامین میں سے غیر اقداری اور طبع تاریخی کتب فکر لڑا دیا تھا اور مجھے خوشی ہے کہ بالآخر شخص اور جس فاروقی سے اسے کر پی کے ایک حریف کی معاہدہ طاعت اصرار ۱۰۹۷ میں قی تاریخییت وری السان دور قی (New Historic and New Humanism) کا جس طرح طہات کیا ہے وہ غالباً ستر کی دہائی میں بعض ماہرین پس ماضیات Post Structuralists کی قدما و تاریخ اور انسانیت کے ارتقاء کی دکالت ہی کے ہمیش نظر ہے جو ۱۹۹۰ تک ایک رر دست عالمی رجحان میں چکا ہے۔ مجھے خاتوں کی میں اتا قوی ممکن کے علموں میں متعدد ماہرین ماضیات سے جن میں Robert Andre اور Brassard بھی شامل تھے ملاقات کا موقع ملا ہے وہ اس ملاقاتوں میں بیشتر ماضیاتی خاتوں سے برضیہ میں ماضیات کے بارے میں جوش و خروش پر نقب کا افسار کی خاص طور سے تعلیم کی اوسط شرح در معاشی رلوں حالی کے پیش نظر ان کا خیال تھا کہ یہ رجحان مغربہ کے برقی پائے سماجوں کی Intellectual Acrobatics سے اگر ہمارے خیال Derrida کی تلمیذ میں "خط" کے متعین "معنی" کا تصور رحم ہو گیا تو ہمارا تعلیم ملی اور فکری اور تصدی وراث ہمدی رہنوں میں منتقل ہوئے سے پسے ہی اپنی اہمیت نکھوئے گا اور دانشاوانیہ ممکن ہوئے گا جس کے بغیر علم و معاش اور ٹیکنالوجی کی ترقی ممکن نہیں ہے۔ نر بڑاے خط کے متعین معنی یا رہن کے بطلان یا Undermining کے نظریہ سے روایتی سماجوں کی خیلائے ست کھری مٹ گیا ہے اور اسے معنی ترقی پسندی یا تاریخییت کا محالہ۔ سمجھانے لگے "تعلیم کار کے Text کی س رہن کی بازیافت کا حالی ہے جو تعلیم کار کے بجائے تدار تعلیم کرتا ہے۔

اس طرح آج کے فکری و ادبی پس منظر کے مطالعہ کے اور اس پانچ درجہ روئے نظر آنے ہیں ایک حلقہ رہی شدہ سے اس نظریہ کو درست خیال کرتا ہے کہ ماضیتک نقطہ نظری کی ہی اہمیت ہے جو کسی بھی میدان میں غیر ماضی مفروضہ کے مقابلہ میں ماضی صداقت کی ہے اہتمام حسین نے کہا تھا کہ "ماضیتک نقطہ نظریہ ہے جو وہ کو زندگی کے معاشی و معاشرتی اور خطائی روابط کے ساتھ متحرک اور تعبیر پرورد دیکھتا ہے۔ یہ ایک ہمہ گیر نقطہ نظر اور ادبی پسو کے کسی ہمہ پسو کو نظر بند اور نہیں کرتا۔"

احتمال ممکن ہے ایک موقع پر سماجی وقت کے ساتھ میرا خیال بدلتا ہوتا چلا جائے کہ نئی ادب، اعلیٰ تہذیب کی پہچان ہی ہے کہ اس سے زندگی کے مسن اور توانائی کو سمجھ کر اسے اگلے میں مدد ملتی ہے اس طرح عوام کا رشتہ حوالی جدوجہد کرے والی طاقتوں کے ساتھ مضبوط ہوتا ہے زندگی ادب کو مضامین ہے اور ادب زندگی کو سلا دے کر "کے برصغارت ہے اچھے ادب کے مطالعہ سے انسان کا سماجی شعور بڑھتا ہے اور اس طرح کو بہتر بناتے اور نصرت کو بہت نکلیں دینے کا اہل میں جاتا ہے اگر کوئی اپنی فکر سے کام لے کر اس میں مدد نہیں دیتا تو صرف ان لوگوں کی فکریں ادب ہوگا جو زندگی کو سترے کے متعلق میں ہیں کسی حد کے تمام ادب شعور کی ایک ہی شکل میں ہو سکتے ہیں (انہوں نے غلطی اور سماجی درنوں کا جواب دیا ہے سے زندگی کی کشش کو سمجھ کر میرا خیال بدلتا ہے)۔

۱۱۔ سرائیہ جدید ادب کے وجود کی کتب فکر سے قطع رکھتا ہے، ہمیں محض بحث پر مبنی جدیدیت کا رویہ ہے جو یہ اعتقاد فکر عام قدامت پسند سے استحقاق کا کتب فکر عقلی کاموں کو علم و دانش کے اجتماعی تقاضوں سے دور قرار دیکر قدامت پسندی ہو سکتا ہے اور جو تقاضے اس (Modernistic Movement) کی شکل میں ظاہر ہو رہے تو محض معاشروں کے

(Automation) سے بیزار کی تہذیب میں قبل، تعصب سماجی روایت کے معج کی طرف واپس لوٹنے کی دعوت دے رہا ہے۔ اس کتب فکر کے مطابق جدیدیت ۱۹۱۹ء میں اپنے اہم کو پہنچ گئی یا ۱۹۱۹ء معنی زندگی معنوں سے نکلت (Nirvana) حاصل کرے گا ہے۔ اس سلسلہ میں ۱۹۱۹ء کے ایک مرتبہ ظاہر اختراع سے مدد کام کیا ہے ان کی تہذیب جدیدی طور پر مغربی تہذیب کے فروغ کو کہ میں لکھی گئی ہے لیکن جدیدیت کے برعکس دیکھا و گویا کہ ایک جدید روایت ظاہر نے نئی جدیدیت کا مسلح نظر رواں رکھی اور نکلت ظہور کیا ہے اور اس کے ساتھ یہ مدد قابل قیاس Modernistic ہو رہے

جدید ادبوں میں اس وقت در دست انتشار ہے ایک طرف وجودی یعنی نقطہ نظر ہے جو طائفہ و شہ شہرہ کے وقت سے جدیدیت کا مضبوط نقطہ ہے نظریہ بیزار کی، معاشی بیزار کی، مقصد تہذیبی اور معاشی بیزار کی سے بیزار کی زندگی کے مفاد میں موت اس نظریہ کے لیے نکلت بلکہ مسرت زندگی کا رعبہ ہے ان دونوں "واحد حکم" کے گورنر تھو سکا (Experiential relativism) نے بڑی حد تک ادبوں کو متاثر کر رکھا ہے جو اولاً تہذیبی اور رابطہ کے درمیان میں ہے

شاعری کی تحریک کی طرف آئے اور سبب تعلیمات کے نظریے سے متاثر ہوئے اور ادب دوبارہ وجودی یعنی ایک نوع سے جدید ادب کی صورت میں شامل ہیں۔ اس میں ناکی سے اعمال ہی میں انکسار کے (Metamorphosis) کا ترجمہ "کاپا قلب" کے نام عنوان سے کیا ہے اور اس سے بیشتر جدید ادب کی ایک اشاعت کا سہ CAMUS ہے جسے شخص رہنے میں ان کے ساتھ ایک گروہ ہے جوئی شاعری کے گروہ کے کچھ شاعرات و Feminists اور کچھ شاعر و کو "ترقی پسند" یا مقصدی ادب قرار دیتے ہیں۔ "تھکنے ہوئے نوک" قرار سے چکا ہے۔ ایک گروہ چنت پسند۔ (Formalism) قسم کے ادب کا ہے جو جدیدیت کے نام، (جوئی فلسفہ کے نواز سے جدیدیت دشمن رویہ صیاد سے جوئے ہے جوئی) "داعہ انتظم" کے نقطہ نظر کی صراحت سے بجائے الفاظ کے مابین سبب رشتوں اور ان رشتوں میں سبب کے لیے اہمیت تلاش کرے جس میں مصروف ہے۔ بلکہ گروہ حقیقت کے پس منظر کو حقیقت ہی گروہ کی ویسی ہی غلطی کر رہا ہے جو اسے ترقی پسندوں کے یہاں۔ حاشیات کو میاوی اہمیت کے اصول میں نظر آتی تھی

اب صورت حال ایک بار یہ صورتی کے ساتھ تبدیل ہو رہی ہے جس طرح مشرقی یورپ میں سوشلسٹ ریاست کے اندام سے نظریے اور عمل کے فرق کا سوال ہم سوچنا ہے۔ بعد از بحیث اور انسان دوستی کا سفر سبب حرموں کے نقطہ کے بغیر ممکن نہیں ہے، اگر ڈیڑا کے فلسفہ سبب و عقیدہ کا مقلد نہ کیا جاتا تو یہ کی وہابی کا غالب رجحان ۸۰ کی دہائی کے آخر اور ۹۰ کی دہائی کے شروع میں برسوں میں محض ایک ضروری موڑ یا کتاب گھر کا ایک باب بن کر رہ جاتا کیا ہمارے سماج میں قرآن کا (Deconstruction) منظور کیا جاسکتا ہے؟ کیا سبب کے مسدوس، اقبال کی نظم "مسجد قرطبہ" اور یس کی نظم "رقیب ہے" کے نئے سبب کی تخلیق سے تفسیق جدید کی غلطی نہیں ہوئی؟ کیا جو ہے کہ اب ماضیات کے فرسیمی نظریوں کے خلاف یک رخ اور ایسا کرنے اور عمل آچکا ہے (New historicism) اور (New Humanism) کی دیگر تحریکوں کے (Post Structuralists) کی صورتوں میں Paul Ricoeur, Merleau-Ponty, Blanchot, Levinas جیسے نام ہیں۔ ان کے میں جنہوں سے ڈیڑا کے ہاتھوں سے لیاوت ہمیں ملی ہے اور اس طرح نوک و زمین Toegve, han ریاست کا حواء ہو رہا ہے اور (New left) کی تحریک کے فلسفوں نے جس ماضیات کے کتب گھر کی چہ بات تسلیم کی ہے کہ ماضیاتی مطالعہ بھی مطالعہ کا ایک طریقہ ہے وہاں یہ حقیقت بھی اہمیت کر رہی ہے کہ یہ ایک یہ طریقہ ہے جو میراث انسانی کے جمع شدہ حقیقت کے

چا سکتا ہے۔

وجودت (Existentialism) بحرِ مائلِ ابدیت جس کا انکارِ حلالِ اسٹین
سپینوزا واپس میں سب سے زیادہ واحد متقدم اپنا اصرار کے ذریعہ جو ان محسوس میں جدید ہے کہ وہ
ہر قسم کی Authority کے خلاف ہے، ایست کے اصولوں کے خلاف ہے۔ اس کا عبادی خیال ہے کہ
کہ انسانی زندگی کو مومن اور ایست کی جڑوں میں بند نہیں کیا جاسکتا اس نظریہ میں بھی ایک طرف
مارتھر Sartre ہے جو لڑکس پہ نازیوں کے قبضہ کے خلاف مقاومت Resistance کا دپ لگتا ہے
لائبریر Fiesch ہوا اور لکھتا ہے ردِ دوسری طرف کا سپینوزا Camus ہے ہمارے یہاں بد قسمتی سے
مارتھر کے مثبت Positive اور اشتراکیت کو بہتر نظریہ تسلیم کر کے کی جمہوری کے جو ب میں کامیاب کا
زندگی میری اور "موت" یا نیستی کا جو کہ فلسفہ بڑی شد و حد سے پھیلایا گیا اور متحد دے لکھیں دے
موت اور نیستی کے سیر میں Saesmen بن کر رو گئے انھوں نے ٹاکا Kafka تک کے انکار کی غلط
تعبیر و تشریح کی ایک یہاں کا جو ناامیدی کے بکسر خلاف تھا اور ناامیدی کا جو کہ غائب اور کچھ حضرات
سے مانتے کی پہلی میں وٹ کن شائیں کا فلسفہ لسان اس شد و حد سے پیش کیا کہ یوں ملک رہا تھا کہ ہم
صلیبی جنگوں کے دور میں داخل ہو چکے ہیں سید احتشام حسین کی دہشت کے بعد ان معنی و محلات میں
مرید اصلاہ ہوا محض ترقی پسند وہ تک سے پرور پوئم Prose Poem کی آزادی کو سماجی بندھنوں
سے آزادی کی علامت مانتے کی کوشش کی لیکن ان حضرات میں سے محض سے یہ چوک ہوئی کہ وہ
صرف "پرور پوئم" ہی کو واحد وسیع اظہار مانتے پروردہ دیتے رہے وہ یہ محسوس گئے کہ اس طرح کی
ایست پرستی ہی تھا جس ایست پرستی کی وحد کو مانتے میں کر لیتی اس موقع پر لگ بھگ ۱۹۷۰ء کی
دہائی میں انسانی تفکیرات کے خلاف پاکستان کی حد تک ایک ایسی تحریک چلی جس سے وٹ کن
شائیں کے پیرو کاروں کو مجبور کیا کہ وہ وٹ کن شائیں کے نظریے کے ملاحض کے لیے آخری دور کے وٹ
کن شائیں ہی کے افکار سے جوڑ کر ہیں

تو جدیدیت کی وہ شکل جو کسی مار تھر کسی کامیاب، کسی ٹاکا اور کسی رواں کی تلاش میں
سرگرداں رہی وہ کسی جوت کی پہلی ہوتی ہیں ہمیں "موت" یا نیستی کے حسبِ ظاہر کی طرف
لپکا رہی تھی اور محسوس اس لیے کہ یہ مائن کو اپنی آزادی کے ڈونڈہ دو لشوہوں کا وہ حال تھا جسے مغرب
وہ نفس زیادہ آسانی سے سمجھ سکتی تھی، اپنے سماج کو تعبیر کو اور تشکیل نو کی صدیوں پرانی چھپی
خواہشات Aspirations کا اندازہ نہ لگا سکی سید احتشام حسین ان نظریوں میں سے تھے جو تعبیر کو

میں سمجھتے تھے اور اب فالسفہ بھی وہی کے سوا چوتھے علم کا دور نہیں آتا کائنات تھا کہ
تخلیق کا اور تجدید میں فرق ہی وہ ہے کہ تخلیق کا غیر منطقی اور غیر نامی ہو سکتا ہے عکس ہے نہ
بے نامی تخلیق کا نام بھی ہو جس تجدید کا ایک نام بھی نہ ہو بلکہ یہ تصور اب پارادوکس
کے ہے حد و قدامتے اب اور ہر ایک روایت کے دہائے ایک مختلف النوع دین و حاروں
کے خاطر میں نہ تھکتا در ایک دور کی سمیت Sensibility دور کے ہے اور اس کا
ناور میں قرار رہتا ہے اور اس عمل میں مختلف علوم میں مدد ہے اور عصری مہمات کا ایک ایسا مہم
نہا رہتا ہے جو اپنی عملی شکل میں ماس ہوئے کے ساتھ ساتھ تخلیق کا نہ پاسکتا ہے نہ تخلیق کے
لیے اس عمل سے کہہ سکتے ہیں کہ

سید احتشام حسین نے اپنی حد و حرکت خارج ہوئے ہیں تصوف " اور " دہائے تخلیقی
تاریخ " میں اپنی مدد کے آخری دور میں سید احتشام حسین نے " آداب و ادب " اور " ادب و ادب " اور
تجدید و غیرہ دور کو محض بحث پرستی کے ذیل میں رکھا ہے اور " دور جدید " کے تحت مہمات
اور Deconstruction کو بھی بحث پرستی ہی کے مہم میں شمار کرتے ہیں " سہائت " کے
مسل بھی Semantics اور Morphology میں مہمات ہیں جن میں سمجھتے رہتے ہیں اور
دوسرے مہمات سہائت کے فہم کے " ان کے " مہمات میں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں
چاہتے ہیں وہ مہمات خود اپنی " رہن " کے مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں
کی تخلیقیت Creativity سبب ہو جاتی ہے " مہمات اور مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں
نظریات اپنی طور پر منطوق ہو جاتی ہے " آخر مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں
اور مہمات ہیں تاریخ مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں
کہ مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں
نکد جو مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں
اصل مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں
تخلیقات کے اور مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں
سب سے مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں
اور مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں
مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں مہمات ہیں

وہ بین الاقوامی تحریکوں کی شناخت بن جاتا ہے۔ سید احتشام حسین جیسے نواز کے مسند فکر کے بے
 باعث حمایت پہلو ہے کہ اس عہد ناپاس میں نئے ادیبوں کا ایک پار تلاء ہے جو انسان دوست و
 حقیقت آشنا ادب کا ریا ہے پاکستان کے اردو ادب اور دیگر زبانوں کے ادب کے بیشتر ادیبوں کے
 بارے میں یہ بات ملاحظہ فرمادیں کہ وہ سید احتشام حسین و ان کے کتب فکر کو انسانی
 شعوبہ کی تہا اور تھا کے ہے ہم خیال کرتے ہیں

متفرد افسانہ نگار

کمال مصطفیٰ

کے نئے افسانوں کا مجموعہ

نیا مکان

رابطے کے لئے، ارتقاء مطبوعات

عہد حاضر کا ادبی و فکری تناظر

خلیق ابراہیم خلیق

عہد حاضر کے ادبی و فکری تناظر پر گفتگو کرنے سے قبل دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے ایک تو یہ کہ ہر زمانے کے ادبی رجحانات یا ادبی تحریکیں اپنا فکری پس منظر رکھتی ہیں اور ہر فکری رجحان کی تحریک اپنے زمانے کے ادب میں نمود و نشوونما پاتی ہے چنانچہ کسی بھی عہد کے ادبی اور فکری رجحانات یا تحریکوں کو الگ الگ حالات میں بانٹ کر دیکھا اور پرکھا نہیں جاسکتا دوسرے یہ کہ عہد حاضر یا ہمارا زمانہ اسی عہد جدید کا حصہ ہے جو برصغیر میں مطلق اقتدار کے خاتمے اور برطانوی ستعمار کے قدم جمائے کے ساتھ ساتھ شرع ہوتا ہے اس عہد جدید کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ہندوؤں نے عمومی طور پر گمخوروں سے تعاون کی راہ اپنائی تھی اور مغربی علوم کی تعلیم و روح دشواری سے حاصل کرے لگے تھے جب کہ مسلمانوں نے شرع میں گمخوروں سے عدم تعاون کا راستہ اختیار کیا اور جدید علوم کی تعلیم کو بے منزل کلمہ سمجھا تھا ادبی اور فکری تناظر کے خولے سے یہ جدید عہد چند ادوار پر مشتمل ہے پہلا ادوار مسلمانوں کے لیے سرسید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک کے آغاز اور روشن خیالی اور اصلاحی اور جدید مغربی علوم کے فروغ کی صورت میں اس تحریک کے برگ و بار لائے گا اور یہ جو کم و بیش اسیویں صدی کی آخری تین دہائیوں اور بیسویں صدی کی پہلی چار دہائیوں پر محیط ہے دوسرا ترقی پسند ادب کی تحریک اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی صورت میں اس تحریک کی تنظیم کے آغاز اور فروغ کا دور

دیتے چلیں کہ یہ قول پر بغیر اشتہام حسین ادبِ قدس کی طرح ایک ناقابلِ شکست تسلسل ہے
جیسا کہ انھی عرض کیا گیا محمد حیدر صبری میں مصلوں کے قدر کے جاننے اور برطاوی اعتبار کے
قدمِ حاسے کے ساتھ شروع ہوتا ہے تاریخ کے اس اہم سوز پر اردو زبان اور اردو کلمہ کے حوالے سے
دیکھا جائے تو اس دیدار سے صدیوں پر اسے جاگیر دار نظامِ مہات کی پسپائی تو دیکھ کر دہائے ماضی
محمد کی ٹیٹ کو اس کر محمد حیدر کے ہر اہل کار دارِ احکام سے ہم آہنگی کے نام سے جانتے
میں غالب کو اس قدس کے احوال اور مہادی کا مدد تھا جس کے وہ پروردگار اور شعر و ادب کے
میدان میں سب سے بڑے مدد سے تھے لہٰذا حوالوں کے طور

ہم میں ہوتا ہے اردوں کو میں ایک طرح

رق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم عام ہم

ان کی ڈرافٹ نگاری سے ماضی محمد کی صدائی لٹاپوں میں ایک غم اور مستقبل کی جھلک
دیکھ لی تھی حقیقت پسندی کے پانچہ ساتھ صاف کوئی غالب کا طرہ اختیار تھی سرسید محمد خان سے
یوٹیلٹی کی "آپس آکسری" کا صحیح خود ایڈیشن تیار کیا تو غالب سے اس کی تقریظ کے طور پر جو
فارسی شوقی لکھی اس میں مصلوں کے پرے نظامِ سلطنت کو تقویٰ پارہ قرار دیتے ہوئے انگریزوں کے
تعمیل جس بانی اور ان کے نظم و سنائی میں انھوں نے تقریب کی اور اس کی بجائے مشکلات کو بے حد
سرہا اسیوں سے سرسید کے نظم و مصل کی تقریب کے ساتھ ساتھ انھیں انگریزی کی صحیح کو سرسید
کی ہمت و دلا کے لیے تنگ و عار کا صبا دیا اور کہا کہ مراد پروردی کوئی اچھا کام نہیں ہے۔ سرسید کو مظاہر
ہے یہ تقریظ پسند نہیں آتی اور اب میرے ملک غالب کی طرف سے ان کے دل میں رنجش رہی
لیکن غالب کا مخلص دور اس کی باتوں کی چائی پناہ کے بغیر نہیں رہی ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ کرادی
سے بعد سرسید نے مسلمانوں کو جو انگریزوں کے جناب کا حاصل مشابہ ہے جسے تو ہم پرستی اور بیانی
سمائی اور معاشی پسندوں کے اندھے فارمیں کرتے دیکھا تو وہ بھی غالب کی طرح کی شیعہ پرستوں کو
جدید مغرب علوم کی روشنی میں مسلمانوں کا رہنے سے باہر نکل رہا تھی۔ کھوتی رہی کہ سے ہنگام اور
ایک بار اگر مستقبل کی طرف کاغذ ہو سکتے ہیں پناہ سوں سے مسلمانوں کا جدید مغربی علوم کی
تفصیل پر اب جاں سے نمودار ہے کہ اسے اس تحریک کا آغاز کیا جو تحریف علی کلام کے نام سے
مشہور ہے حیادی طور پر یہ ایک گہری اور مصلاتی تحریف تھی جس کا مقصد روشنی دینا اور پروردی
کو لوہا دینا تھا قدامت پرستوں کی شدید ملامت کے باوجود سرسید اور ان کے رفقاء کی یہ تھک

عہدِ جدید کے باعث یہ تحریک زار پھرتی رہی و بالآخر اسے مصلحت میں اسبابِ رہی ۱۸۵۷ء میں سرسید سے تحریک کے سرری دار علوم کی حیثیت سے علی گڑھ میں جس مکتبہ انگریزوں اور مشنریوں کی اسکولوں کی مدد پر قومی داغہ ۱۸۵۷ء میں شروع اور نصف صدی کے اندر بعد ۱۸۵۷ء میں مسلم یونیورسٹی بن گیا

عہدِ جدید کے پہلے دور میں جو اسیویں صدی کی آخری میں اور بیسویں صدی کی پہلی چار دہائیوں پر محیط ہے اور عصر میں روحانی اقتدار کے برعکس مصلحتی عہد سے قدم بڑھے تھے مگر مصلحتی ترقی کی رفتار سست تھی روحانی حکمرانوں سے اسے اس کے پیش نظر رہی کے جائیداد و مالی اوصاف کے کور فرار تھا اور جدید مصلحت کاری کو ہی حد تک پسے رہا تھا جس تک اس سے ان کے شعاری مصلحت پر سے ہوتے تھے تاہم اس نے غیر جانبدارانہ ہم مصلحتی نظام کے تحت پیدا کی طرحوں میں خود جدید ملی ترقی تھیں اور جائیداد و حیثیت اور مالی رتوں میں جو فوٹ و محنت کی تھی ان کے باعث زندگی کو نئے ٹینٹوں کا سامنا تھا جدید مصلحتی علوم سے جس کو کہ پہلے غرض سے لیا جاتا ہے جدید تنظیم سے فیض یاب ہوئی ہے تھے سرسید کی تحریک کے نتیجے میں مسلم مصلحتی نے مصلحتی علوم سے بہرہ ور ہوئے گئے تھے چنانچہ عہدِ جدید کے پہلے دور یعنی اسیویں صدی کی آخری اور بیسویں صدی کی پہلی چار دہائیوں کے دور میں روحانی ادب کی تیار کا حائر لیجے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ دور سرسید کی گہری تحریک کے برعکس رہا ہے اور اس دور میں اردو کچھ سے تعلق رکھنے والے بیشتر مسلم اور ہندو ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات سرسید کی گہری تحریک کے دور میں اثرات کی آئینہ دار ہیں۔

عہدِ جدید کے شہساز ہوتے ہی شعراء ادب کی دنیا میں نئے خیالوں سے بھنے اور نئے خیالوں سے عہدِ جدید کے لیے نئی اصناف جن اور نئے ادبیاتی صورتیں جن تو سولہ صدی میں پیدا ہوئی تھیں اور سولہ صدی کے ماقبل جدید شاعری کی روشنی مل رہی تھی مگر اس کی مبالغہ و مبالغہ قدرت پر اور زندگی کے مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھنے والے موضوعات پر نظمیں لکھی جاسے لکھیں جن کی روایتی شاعرانہ روایتیں والے قدامت پر حق سے غمِ جدید و مصلحت کی کلن اور اردو کی شاندار شعری روایت و سلاسل سے نئی کوشش فرمادیا حالانکہ جدید نظم اردو کی محققہ شعری روایت ہی ہے۔ یعنی قومی اس کے شوقیوں، مرثیوں، قصیدوں اور طبع سرسید کی نظموں کی کوکھ سے تسمیہ یا صرف صحت اور عہد کے اتحاد سے مصلحتی شاعری کے وہ مختلف اثرات جنوں کے تھے جو

کے بدلتے ہوئے ماحول میں اردو شعروہب کی ترقی کے لیے ضروری تھے اور اردو کے سائنس اور ادبی مزاج کے متقاضی تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ نئے زمانے کے مسائل اور تقاضوں کے پیش نظر مغربی اثرات کے تحت اردو کے شعری و نثری ادب میں جو نئی اصناف و اسباب نمودار ہوئے اور ہیئت و مواد کے لحاظ سے جو تبدیلیاں رونمائی ہوئیں، ان میں ہاشمی کی روایات کے تحت سند عناصر اپنی ترقی پانے شکل میں برقرار تھے۔ کسی بھی ادبی رویت کے تحت سند ترقی پذیر عناصر ہی ادب کو وہ مسلسل مزاحم کرتے ہیں جسے اشتہام حسین نے ناقابل شکست قرار دیا ہے۔ کثیر کے حیرت انگیز اثرات پر مبنی اور بہت پسندوں سے جو حالات کی تعمیر پیری سے بے نیاز زندگی کے نئے تقاضوں کی طرف سے آنکھیں بند کیے ہوئے تھے، وہی رتھات کی ہر سرے پر ملاحظہ کی، لیکن کوئی لاکھ حق کرے گردش امام پیچھے کی طرف کب لوثی ہے؟

برکیف، الیویس مدی کے اواخر سے بیویں مدی کی چوتھی دہائی تک موضوعات اور ہیئت دونوں میں تنوع اور پائیدگی کے لحاظ سے نظم جدید کی آبیاری کرنے والے شعراء میں حالی، شبلی، قبیل، عظیم طبعی، سید کاوردی، سعید کاوردی، سرور جاس، آجادی، شوق قدوائی، چکبخت، انیس، برق، دوس، جوش، سید، حیدر، جالندھری، عفت اللہ خان، حشر شیرانی، ساحر نظامی، ذوق، مقبول حسین احمد پوری، شاعرانہ، امین، دانش وغیرہ سرعرت ہیں۔ اس زمانے میں فلسفی جانے والی نقیوں میں حاکانی، ربیع، حیدر، بیاض، تاریخی، فلسفہ، انقلابی، دینی، قومی، ملی اور سیاسی ہر طرح کی نظمیں شامل ہیں۔

غزل اس زمانے میں خصوصاً بیویں مدی کی پہلی چار دہائیوں کے دوران سے مضامین، مایہ اور فی، جنوں سے "شبابی، حالی، شاد، مسرت، امیر، لانی، جگر، غزل کی صورت اور انداز کی کرتے ہیں ان کے علاوہ مضامین اور مایہ کے تنوع کے لحاظ سے غزل کے نئے مزاج کو مدعا دینے والے اہم شعراء میں علی، ثاقب، عزیز، چکبخت، مضطر، ربیع، باطن، دہشت، آریز، عشر، اثر، آغا، آزاد، انصاری، آسی، حسین مظہری وغیرہ شامل ہیں۔ یگانہ اور لڑائی سے بچے اور معاشی کی تہذیبی کے لحاظ سے غزل کو لکھی جنوں سے آشنا کر دیا اور قبیل سے معاشی درمیان دونوں کے اعتبار سے غزل کو ہر رنگ اور ہر جہت سے طویل۔

مرتبہ نے بھی بدلتے ہوئے سیاسی و سماجی حالات کا اثر قبول کیا اور اپنے زمانے کے تناظر میں واقعہ کرنا کی صورت کی ترجمانی کر کے جوش نے جدید مرتبہ کی بنیاد رکھی۔

میں تہذیب و ادبی حقی "ادھ بیج" کے بیشتر لکھے دلوں سے جدید تعلیم حاصل کی تھی اور جدید مغرب کے عمرانی صورت کا اثر قبول کیا تھا۔ حتیٰ کہ انھوں نے بھی سینگ کون لکھو میں تعلیم حاصل کی تھی اور مصلحت سے اس کی ذہنی ہنگامی کا ثبوت ان کے اعداد و کلام سے خود ان کے مزید پرچے "بیج" کے نام پر رکھا گیا تھا۔ وہ انسانی کے اندر پر مغرب کی جاتا تھا "ادھ بیج" ایک طرف اس زمانے کے کلاسوں کے مطابق قوم کے بڑے بڑے سیاسی و سماجی شعور کا ہم راہ تھا۔ جمہوریت کا قائل اور سر پرست کا حامی تھا۔ سماجی مساوی اور ہندو مسلم فرقہ کے لئے کوٹھیں تھا۔ مگر دوسری جانب ہر دے کی حمایت، تعلیم مساوی کی پھلت اور جدید شہری تعلیمات کی عزائم میں قدامت پرستوں کا ہم راہ تھا۔ اسی قسم کی دور کی بیشتر قدامت پرستوں میں تھی اور جو ستر قدامت پرست تھے، وقت کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد بھی کم ہوتی گئی اور عزائم بھی کم ہوتی گئی تھی۔

بریف "ادھ بیج" سے ادب میں جس طرف "مغرب کا ذوق" دلا تھا، وہ ۱۹۳۰ء کی دہائی تک پہنچے پہنچے عامی ترقی کر چکا تھا۔ مزاحیہ ادب میں مضامین، انشائیہ، انجیری، کالم، سرائے، ناول لکھے جا رہے تھے۔ اور مزاحیت انگریز، رشید احمد صدیقی، امداد شاہ بخاری (پطرس)، عظیم بیگ، بھٹل، شوکت تھاکوری، ابو حنیفہ، چشتی، عافی، لعل، لعل، مولانا جریغ، مس مسرت (سندباد بخاری) جیسے جدید دلوں سے مزاح نگاری کی مختلف قسمیں روشن کر دی تھیں۔

عہد جدید کے پہلے اور پہلی جیسوں صدی کی آخری میں اور جیسوں صدی کی پہلی چار دہائیوں کے دور میں مغرب کے بیشتر اپنی نظریات اور تعلیمی اصول، وہ کے جدید ادب میں قدم بڑھ چکے تھے۔ اس عہد کے شعراء میں حالی کے مقدمہ "شعرہ شاعری" سے جدید تنقید کا آغاز ہوا، مگر مختلف رو بہ باب نظریات مثلاً تاریخی، عمرانی، مدنی، ملی، سیاسی، فلسفیانہ، تعلیمی، تاریخی، رو بہ سے تنقید لکھی جاتی، یعنی فکر میں شعبے میں اس پائے کا کام نہیں ہوا۔ ادب کے دوسرے شعبوں میں جو حالی کے عہد جدید تنقید کے میدان میں جس ادیبوں کو اہمیت حاصل ہے ان میں بازار چھپاری، امیر احمد علوی، عبدالرحمن بخاری، جعفر علی حالی، نثر، مسعود، مسعودی، ادیب، انجیوں، گورکھپوری، لڑائی، گورکھپوری اور پانڈت اچاریا جیسے شامل ہیں۔

عمومی طور پر اس دور میں تصنیف و تالیف کی سرگرمی بہت بڑھ گئیں۔ حقائق حیات و کائنات، فلسفہ و مذہب، تاریخ و سیر، بشریات و عمرانیات، صحت و طبیعت، سیاست و معاشیات، اعراس و علم و ادب کے سرچشمے میں اس کثرت موضوعات پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں اور مشرق و مغرب

کی بڑی راہوں کے تراجم سے اردو کا ادب جس طرح کی طاعت کی سونہوں و سابل و غیرہ کی اشاعت و نشر و اشاعت کے اداروں کے قیام سے علم و ادب کے پیش پیش میں آئی رہیں سو کر دی تھیں۔
جہاں تک تعلیمی ادب کا تعلق ہے اردو کے ادیبوں و شاعروں نے مغربی ادب کی کاسیکی،
رومان، جمالیاتی و عقلیت پسندی کی دیات و کچھ کچھ طاعت پسندیوں و رومان پسندیوں کا اثر
قبول کیا تھا، لیکن جدید طرز پر اردو ادب کا مالی و جمالیاتی اور تھا وروسی پروردگی بھی حقیقت نگاری پر
عادتی تھی و اس طرح پسند کی انقلاب پروردگی تک جس باطنی حسی تہذیب اور صورت کی ملک عام تھی
اور اس زمانے کا بہترین ادیب قوی دلی تحریکوں کی پیروی کر رہا تھا۔ لیکن مالی صورت حال اور خود
پر مضمر کے حالات کے باعث جس کا ذکر آگے آئے گا اکثر ادیبوں اور شاعروں کی تعلیمات حال سے
بیزاری و ناامنی اور مستقبل کے بارے میں عدم یقین و تشویش و رجحان کی پیداوار تھیں۔ انہوں نے عمل
پرستی کا تصور قائم کر کے نئی دنیا دیکھائی و دیوں کا تعلق سے رد و استیجاب کیا

بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے ان دنوں اور شاعروں میں جس کا سیاسی و سماجی شعور
خاصا ترقی یافتہ تھا، ایک پارہاں پر وہ چرچا شروع ہوا جس رجحان کا اردو ادب سے حقیقت کی جانب
تھا و اس کے پس پشت جو عوامل کارفرما تھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ مصعب میں معضی کارحوالوں
کی تعدد میں بدترجیح معاملے و سرور۔ نظام کی پوچھ کے ساتھ ساتھ محنت کشوں میں بے
حقوقی کا شعور پیدا ہو چلا تھا و نوین یونین تحریک انجور میں پہلی تھی دوسرے دن میں ۱۹۰۷ء کے
شترانی انقلاب سے ماہر دنیا کے مظلوم و محنت کش عوام کے حوصلے مند رہے تھے و انسانیت
دوست و لشکریوں کو شدت سے متاثر کیا تھا۔ قس نے اس انقلاب کا جہر مقدم کرتے ہوئے کہا تھا

انقلاب تلوار چھرا بطن گھسی سے ہوا
آسماں آدب ہوئے نادوں کا ماتم کس تک

وہ کہ قس عمر عدالت کی انہم "مظلوم" "مظلوم" پر صل اشترانی و طامی طوع ہے
۱۹۱۱ء سے قس کی شاعری سے نکلاں رنگ اختیار کیا اور اس میں متعلقہ شخص "معاشری" "وکی
اور "مظلوم" اور "شترانیت" میں مشترک "قدر" کے موضوعات و مسائل کو کی چھ موضوعات ۱۹۰۹ء
سے قس کے کلام میں تقریباً پایید ہیں۔ مسرت بھی کی زمانے سے طانی شترانیت کے سرگرم مبلغ
تھے ان دنوں کے علاوہ ترقی یافتہ سماجی شعور، رخصت والے دوسرے نکار بھی رواں کی پکڑنڈی سے
حقیقت کی شاعر کی پاس کاموں ہوئے گئے۔ ان سفر میں رواں کو حقیقت اور اصلاح و انقلاب تک



ملو ڈاکٹر حیدر امیر ملا "ڈاکٹر غرضی معجمی" کے ساتھ

جو مدنی عقیدوں اور وہاں پر قی بورڈ بانی تھا اور غرضی کے معجمی کے معجمی پر کاری ضرب لگانا تھی۔ قلمی قلم امتیاز پر غرضی نے اس کتاب کو معجمی و دیگر عرصے تک یہ چوری چھپے دست بہ دست گردش دینی رہی۔ اگرچہ خود ہمارے قلمی کے الفاظ میں "انکار سے کی پیشتر لکھاؤں میں تسلیم کی اور ضرر ادا کم اور محنت پسندی اور وقایا بیت کے خلاف غرضی اور انہوں نے زیادہ تھا، بعض جگہوں پر جسکی معاملات کے بارے میں لادکس، جو اس کا اثر بھی رہا ہے۔ تاہم اساتذہ کا یہ مجموعہ کے در ترقی پسند ادب کے ہمیشہ دینی حیثیت سے تیار کی اہمیت کا حامل ہے۔

ادھر عالمی صورت حال یہ تھی کہ دینی حنفی عظیم کے حلقے کے بعد اقتصادیں مدعائی اور سولہ دینی کا جو دور دورہ شروع ہوا ۱۹۲۰ء تک پہنچنے پہنچنے میں سے ملو دیا واپسی بیٹ میں سے یہ صورت حال دیکھ کر انہوں نے نظام کے اس شدید بحران سے غرضی کے معجمی کے معجمی کے معجمی کی سرکردگی میں حریفی اور انہی میں قدم مہیا ہے اور اپنے یہاں۔ مقصد کے حصول کے لئے دینا و لک و عظیم حنفی کی صفائی میں خصوصیت کی تیار ہوں کرے لکلی غرضی تریاں سل کی رتھی سے غرضی پر قائم تھی اور مدنی دینا کو پانچواں سال اور غیر تریاں اقوام کے ہزاروں سال کی علی اور حنفی لکھناؤں کو ملو دیا ہے پر قلمی ہوئی تھی علوم و فنون کی پیش رفتوں کے لادکس کے اور غیر تریاں اور غرضی کے خلاف

[illegible]

کہ کیمبرزم کا معاشی نظام، اسلامی اصولوں کے میں مطابق ہے۔ کیمبرزم میں مگر حد کے تصور کو شامل کر لیا جائے تو دونوں میں مل جلوری فرق باقی رہے گا۔ چنانچہ مولانا نے اپنی فکر میں اپنے اس عقیدے کا اعادہ کرتے ہوئے کہا: "اسلام اور کیمبرزم میں کوئی تضاد نہیں ہے اور اسلام کا مقصود نصب العین اس کا مقصد ہی ہے کہ مادی دنیا میں مسلمان شکر کی نظام قائم کرے کی کوشش کریں" مولانا نے اپنی کتاب "روشمال" میں، شخص کے تاریخی اجلاس کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے مولانا کی تقریر پر یہ حصر دیا: "مولانا صرف مولانا کی فکر سے ہمارے دل مت برضا۔ لیکن مولانا سیاست کی طرح، دہائی میں بھی متحدہ ممالک کے تصور سے ملت جلتی تھی۔ ہمارے خیال میں ترقی پسند دنیا تحریک میں محض سوشلسٹ یا کیمبرسٹ میں بلکہ مختلف عقائد کے لوگوں کے بے حد قہمی، انجمن اس سے وطن آزادی اور مصروفیت پر یقین رکھنے کا مطالبہ کرتی تھی، شکریت کا میں مولانا اس سلسلے میں اپنا پسند تھے ان کے نزدیک ترقی پسند کے لیے اشتراک کی جوتا ضروری تھا ہمارے لیے یہ ضروری نہیں تھا۔"

اس تاریخی کاغذ میں کل چند انجمن ترقی پسند معصوم کا مشورہ بھی اتفاق رائے سے باضابطہ طور پر منظور کیا گیا۔ مشورہ یہ تھا: "اس وقت ہندوستانی سماج میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اور جہاں بہ لب، رحمت پر حق، جس کی موت یقینی ہے، اپنی زندگی کی مدت برصاٹے کے لیے دیوہ۔ اور ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ ہر سے قدری ڈھانچوں کی شکست و درمخت کے بعد سے اب تک ہمارا دہائی ایک گونہ فراریت کا شکار رہا ہے اور زندگی کے حقائق سے گریز کر کے کھوکھلی روحانیت اور بے بنیاد تصور پرستی میں پناہ ڈھونڈتا رہا ہے، جس کے باعث اس کی رنگوں میں یا خون گلاب ہو گیا ہے اور یہ شدید قسم کی اہستہ پرستی اور کمزور کن معنی رکھتا ہے کا شکار ہو گیا ہے۔ ہندوستانی دیہوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہوئے والی تبدیلیوں کا صحیح اندازہ کریں اور دہائی میں مائوسی عظمت پسندی کو نظر انداز کر کے ترقی پسند تحریک کی حمایت کریں۔ ان کا فرض ہے کہ اس قسم کے امور از عقیدہ کو روانہ کریں جس سے غلامان، ادھب، افس، جنگ اور سماج کے دارے میں رحمت پسندی اور مائوسی پرستی کے خیالات کی بودک حمام کی جائے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے اپنی رکھتا کو لٹو دھاپا سے روکے جو فرقہ پرستی، نسل، نصاب اور انسانی اچھال کی حمایت کرتے ہیں۔ ہمارے انجمن کا مقصد ادب اور آرٹ کو نہ رحمت پرست عقیدوں کے جنگل سے لہات دھاپا ہے جو اپنے ساتھ ادب اور فن کو بھی انجمن کے گروہوں میں دھکیل دیتا ہے۔ ہم ادب کو عوام کے قریب لانا چاہتے ہیں اور اسے

مذہبی تفسیر اور مستغنی عن الناس اور بدعت چاہتے ہیں کہ ہے تب تو بدعت مثل قدس
 سے مستغنی عن الناس کاوش گئے ہیں اور بدعت وہ ہے جس میں ہر طرح کی بدعت
 ہندو کے خلاف بدعتوں کے وہ بدعتوں کے ترمیم میں گئے جو ہندو سے اطمینان کو یہ
 کی اور مستغنی عن الناس کے نام میں اس پر اور غیر ملکوں کی قدس و تہوں سے فائدہ
 نہیں گئے کہ چاہتے ہیں کہ ہندو سے مل جائے۔ یہ بدعتوں کے میدانی مسائل کو پانچوں صواع
 کے نام سے لکھا گیا ہے۔ اس میں بدعتوں کے مسائل میں اس تمام نام کی حفاظت کریں گے
 جو کہیں چاروں استغنی عن الناس کی طرف سے حالت میں اس تمام نام کو جو ہندی قوت
 عقیدہ و احکامات لکھتے ہیں اور وہوں اور ہندوستان و عقلوں میں سو رہے ہیں عقیدہ اور ترقی
 کا یہ گھر گھر کر قبول کرتے ہیں۔

ترقی پسندوں کی تحریک، جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے، حقائق و حقائق کی تحریک تھی اور
 اور ہے جس کی فکر میں ان میں ترقی پسندی کا وہ قیام ہے جس کا مقصد انسان پر انسان
 کے حقوق کے انحصار کا حقد سے اس مقصد کے حصول کے لیے وہ اس کا نظام فکر انسانی
 عظمت پسندی کی روشنی میں موثر عقلی لائحہ عمل مقرر کیا ہے۔ اس سے ترقی پسندوں کے نظریے
 کی تشکیل میں ہر کسی انکار کا بھی ہم حصہ ہے۔ کل حصہ ان ترقی پسند معصیوں کے قیام نے ترقی
 پسند تحریک کو ایک مضبوط اور موثر تنظیم فراہم کر دی تھی۔ ہر معصی کی مختلف زبانوں کے سماجی شعور
 رہے۔ اسے نسبتاً دوست اور دشمن میں شامل ہوئے تھے اور اس کی شاخیں ہر معصی کے ہر
 علاقے میں قائم ہو گئیں۔

۱۹۳۶ء میں ان ترقی پسند معصیوں کے قیام کے بعد ان تیار شدہ اور عالمی سطح پر بھی
 اور ہر معصی میں بھی قابل بکام میراث اور اصول کی تبدیلیوں کا اور تھا۔ یہ عالمی سطح پر ہندو اور مسلمان
 کے مابین اور ان میں مصلحتیں جس طرح ان حالات کے نتیجے میں صورت کے حلقے
 دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں اور ظلم سے یہودیوں اور ہنگامی میں قیامت علم امرا ہوسے کے بعد
 جنگ کے حلقے پر اور ہر معصی میں بدعت اور دلی کے آخری مرحلے، کانگریس اور مسلم لیگ کی کشاکش
 ناکامی کے بعد اور بالآخر جنوں نے دلی اور ہر معصی کی شکست پر عید ہے ان حالات کے تناظر میں سماجی اور
 ثقافتی سطح پر قدم اور جدید کی تشکیل اپنے حلقے پر تھی وہ قدمت پرست جدت پسندوں کے مقابلے
 میں ہپا سونے جا رہے تھے، شعراء اور، رقص و موسیقی، تعمیرات، فلم، مصوری، حوالیوں میں بھی

لوگ شاعری، نوک، سنگیت، ہانگ، موٹلی، نکلیں، سرائیک، میر، دب و شب کے تقاضوں کے مطابق
 نئے سانچوں میں ڈھنچے مار رہے تھے سرمن اور بہ نکلیں شیت، دو دو دوں کے بخار سے دور رہیں اور
 سنی میر جبریل علی علی میر ترقی تھیں اس زمانے میں جدید مغربی ادب کا ایک سیلاب اسٹہ آیا تھا
 جو ایسیوں صدی کے دہر اور بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی کے شدید بحر میں اور انقلابی جد بیسویں
 کا تہذیب دار تھا اس میں وہ ادب بھی تھا جس سے رجعت پر سنی کو جدیدیت کا پر لہریں بہاؤ دیا تھا
 اور زندگی سے بیزاری و ریا کی پید کر تا تھا، اور ادب بھی جو زندگی کی تنگیوں میں آنکھیں ڈال کر
 اسے ملکا کر حوصلہ پاروی اور سپرد پاروی کے حدت اٹھا رہا تھا، اور ایک خوش آئیں مستقبل کی
 اشارت دے رہا تھا یہ یا مغربی ادب، برصغیر میں سے دب کی نشوونما پر خاص اثر انداز ہو گئی تھیں کے
 شت، و مٹنی سوکتے بل پڑے اور کے بہت سے ان لکھے، انوں کے علاوہ جن کا دہلی مقام ۱۹۳۸ء سے
 قبل متعین ہو چکا تھا اور اب بھی زمانے کے ہم راہ اور فعال تھے، اے شاعر نے لکھے والے سحر سے
 اور ان سب سے اپنی نشا، کو ر قار نے لکھے، ادب میں وہ شاعر اور سب بھی تھے جو فرد کو جماعت پر
 ترجیح دیتے تھے وہ ادب برائے ادب کے قائل تھے سوں سے مطلب کے اس نے دب کی بیرونی
 کی جو رجعت شعار، حدید سکار میں تھا، اور جن ادبوں اور شاعروں کا سماجی شعور بخت اور ترقی یافتہ تھا
 اور جو ادب برائے زندگی کے قائل تھے، انوں سے کہ جدید مغربی ادب کا اثر قبول کیا جو با مقصد
 سماجی حقیقت نگاری کا تہذیب دار تھا چنانچہ برصغیر کے دب میں در مقامات ساتھ ساتھ چلے در ایک
 دوسرے سے متصادم رہے ایک رجعت شعار جدیدیت کا رملان جن میں شکار کے لیے اس کی ذات
 سب سے ریا وادہم تھی اور دوسرا سماجی ترقی و خوشنئی کے لیے حقیقت نگاری کا رملان پلار رملان سماجی
 حقائق سے دو گردالی کے باعث کسی منظم تحریک کی شکل اختیار نہیں کر سکا جب کہ دوسرے رملان کو
 ترقی پسند ادب کی عظیم السابیت اور تحریک سے پروان چڑھایا اور اس نے برصغیر کی دیائے ادب میں
 زندگی کی نئی روش، محو تک دلی

شہر شعور میں ان دونوں رجحانات یا یوں کہیے کہ جدید رجعت پسند ادب اور ترقی پسند
 ادب میں دکھار نہ تصورات، روایات کی پہل کی کے حوالے سے بعض سنی مائلوں سے جو کہلپا ہوا
 کر دیا تھا اس پر شکوک سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ترقی پسند ادب کی تحریک کے فروغ کے
 سلسلے میں انھن ترقی پسند مصنفین کی پہلی دس سالہ کار کردگی کو دیکھتے ہیں ۱۹۳۶ء میں گل بند
 انھن ترقی پسند مصنفین کی تاحیں کالٹس کے بعد دوسری کالٹس دسمبر ۱۹۳۸ء میں نکلتے ہیں

اضداد اپنی تمام روایت کے مسلسل کو بد دم قلم کر دیے اور اپنے تمدنی دوشے سے یکسر ہٹا کر توڑ پیسے کے حق میں تھے ترقی پسند ادب کی تحریک کو اس گہری اشتعال اور اشتعال پسندی سے بچائے اور قدمہ پر سٹوں کو ناجوہ کر کے میں جملہ طعیرے کلیدی رد اور انجم دیا وہ تحریک کے روح رواں اور ترقی پسندوں کے حقیقی معنوں میں دوست و فلسفی اور ہمارے تھے انہوں نے اپنے معاشی اور اپنی اجتماعات میں کی جانے والی نگاہ پر میں ترقی پسند - نظریہ حق کی مختلف پسندوں سے ایسی جامع تشریح کی کہ مدت سے عام کار ترقی پسند تہذیبی سے بچ گئے اور عام قارئین میں قدمہ پر سٹوں کی بھلائی ہونی مدت کی غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔ اس طے میں سواد طعیر کے علاوہ جھوٹے اور کھپڑے اور اصرار سے ہونے والی ترقی پسند فکاردوں اشتعال حسین در مختار، مسیس و غیرہ نے بھی تحریک کی گراں قدر خدمات انجام دیں اشتعال حسین نے خصوصیت کے ساتھ بے معاشی میں ترقی پسند ادب کی تحریک کے کلیدی اور اصلی پسندوں کی میں خوب اور اصاحت کے ساتھ تشریح کی کہ سواد طعیر نے تحریک کے معادوں میں مسیس معتبر مقام کا حامل قرار دیا۔ میں نے کہ ہم ترقی پسندی کے بارے میں سواد طعیر کی تشریحات و توصیحات کا سبب خود ان کی زبان میں پیش کریں۔ اشتعال حسین کی تحریروں سے وہ اقتباسات دیکھتے چہیتے ترقی پسند ادب کی اصاحت کرتے ہوئے وہ دیکھتے ہیں

”ترقی پسند ادب نہ تو بدستی ہے نہ غاشی اور غریبی کی حمایت کرتا ہے نہ مذہب سے بیزار یا خدا کی توہین کے مسلک میں شامل ہے نہ عقل و غفلت گری و مسن و داشت پسندی کو زندگی کے کسی شعبے میں جگہ دینا چاہتا ہے، بلکہ زندگی کی تشکیش میں انسانیت کے لیے جو ترقی پدید آ رہی ہے اس میں حکومت پسند ہے دنیا کو ہر قسم کے ظلم و جور و نا انصافی، ظلم و جبر، نا انصافی اور غفلت خوردگی سے بچانے کا مسئلہ ہے چاہے اس پر پردہ لگاندے یا الزام لگایا جائے لیکن وہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں کو چند برگریدو کوں کی پس منہ عام انسانوں کی ملک ٹاڈنا چاہتا ہے“

ادب میں جس معاملات کے اظہار کے مسئلے میں اشتعال حسین نے لکھا ”جنس کا ذکر ادب میں آیا ہے اور آتا رہے گا یہ ذکر زیادہ تر اپنے جس میلان کا مظہر ہوگا جس حالوں میں انفرادی شخصیات، انسانوں کی کج روی یا بیماری کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے۔ تاہم سے سمجھنے کے لیے اس جذبے کی بدلتی ہوئی سمجھ، اس کی تریب و تہذیب، احوالات سے اس کے تعلق، اس کے معاشی پس منظر کا جاننا ضروری ہوگا۔ اگر اس میں توازن قائم کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ محض ایک حیوانی حیوانیت

وضاحت کرتے ہوئے سہارنپور کے لکھن

”اپنی قدیم مذہب کا جو اس پروردگار کو رحمت پر مبنی ہے اور جو اس سے
 ہے اس لیے کہ اس میں اس کی اسالی کے بہترین دلائل اور شریک تریں ہوں سے
 اپنی غیر مضمون دہانت اور ذات اور اپنی عصامیت سے کام لے کر ہے عہد کی سماجی
 حقیقت و اسلوب کے تجزیوں اور مابھی رشتوں و ان کی عصبانی کیجیوں ان کے سب سے
 زیادہ مسکس ہو یوں وہ فکر کی بندوبست کو ہمیشہ کے لیے مسخر کر لیا ہے۔ ” مسلسل
 ہمیں زندگی کو سترتا ہے، اس سے اسے اس کا تہہ کرے اور لطیف سے لطیف
 تر ہے وہاں ہم دینے میں یقیناً ہمیں ان جو اس پروردگار کے اور ہر کھوت اور میل بھی
 نظر آتا ہے۔ جمادی ترقی پسندی کی یہ مقامی ہے کہ ہم کھوتے اور کھوتے کی پرکھ
 کریں اس کے معنی یہ ہوتے کہ ترقی پسند نوٹ لکھ کر عہد کے معانی میں کر
 ایک طرف سے اور پلے سے مختلف لکھ کر تعمیر کی کوشش کرتے ہیں، اور وہ پہلے کی
 بہت سی ایسی روایات کو جو نے حالات، زندگی کے ارتقاء کی، ان میں رد و ثبوت بنتی ہیں مسترد
 کرتے ہیں تو اسی کے ساتھ وہ اپنی قوم کی جی زندگی اور روحانی روایات کو برقرار بھی
 رکھتے ہیں جس سے آج بھی زندگی کا شعور اور حسن برصا ہے، جن سے ترکیب طس ہوتا
 ہے، جن سے انسانوں کی ملوثی، اخلاقی بار و حالی بہتری ہوتی ہے۔ “

سہارنپور کے ترقی پسندی کی جو تشریح کی ہے اور اسے زندگی و دین کے بارے میں ترقی
 پسندوں کے رویے کے جو وضاحت کی ہے اس سے آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ہر زمانے کا اچھا ادب
 ترقی پسند ادب ہوتا ہے اور یہی بات انھوں نے، انھیں ترقی پسند معنی کی جو قلمی فن ہند کا نظریہ
 سے خطاب کرتے ہوئے لکھی تھی جو ۱۹۴۳ء میں سبق میں منظر ہوئی تھی۔ انھوں نے کہا تھا ”یہ کہا
 لٹا۔ جو اگر تمام تر اچھا ادب ترقی پسند ادب ہی ہے اور اس طرح ہر ایک اور میں ترقی پسند ادب کی
 تحقیق ہوتی رہی ہے۔ ترقی پسندی کے کلام سے ہر زمانے اور ہر عہد میں مختلف ہوتے ہیں سچا ترقی
 پسند وہ ہے جو حالات کی تبدیلی کو محسوس کرے، ان قوتوں کی ماہیت کو سمجھے جو جماعت اور لوگوں پر اثر
 انداز ہو رہی ہیں اور یہ سمجھ لے کہ اس سے انسانوں کو اس انداز سے متحرک کرے جس کا تقاضا تاریخی
 حالات خود کر رہے ہوں۔ “ واقعہ یہ ہے کہ ہر زمانے میں ایسے ادب و شاعر پیدا ہوتے ہیں جن کے
 تدریجی اور عوامی شعور نے روح عصر کو حرکت میں لے کر ایسے فن پرے تحقیق کیے جنھوں نے زندگی

اور انسانی معاشرے کو آگے بڑھانے کے لیے سماجی معاملات پر بھی نو ذرا سائے کے مراز جتنے ہونے کو ہم کو
 ساتھ دے اور سماجی کے تحریکات کی روشنی میں ایک ستر مستقل کی تشکیل و تعمیر کے لیے کوشش ہو اور
 ترقی پسند ادب کے کلامے حالت کا مستحق ہے۔ یہی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ رجعت پسندی
 اور ترقی پسندی کی کشمکش و تباہ کاریاں اور سماج میں ہی منہ اور رہے گی کیونکہ متحدہ قوتوں
 کے ٹکرائے عبور نہ ہونے کے سبب رجعت

ترقی پسند ادبوں اور نگاروں خصوصاً جدید علمبروں کی صوبہ و مل جس میں اس کے بعد قدامت
 پر صوب کی حالت میں وہ خون و جد۔ کسی رہا جو شہر و شہر میں تھا قدامت پرست اور حال
 ادب کو سماجی اور اس سے روئے الوداع میں سمجھتے تھے۔ مگر برائے حق کے قائل رجعت شعار
 رجعت کے علمبروں کی نظر میں ہونے کے بعد ان مسائل اور طبیعیات کے آگے سماجی
 معاملات و مسائل کی کوئی حیثیت نہیں تھی چنانچہ قدامت پرستوں کی جانب سے ترقی پسندوں کی
 حالت میں حد کوئی نام نہیں رہا اور وہ تقریباً سمجھ گچھ کی تہ بھی ہے۔ رجعت شعار ادب و شاعر ترقی
 پسندوں سے خلاف شعراء سے صاف آرا ہے۔ برصغیر کے سماجی و سماجی حالات اور ان کے پس پشت
 کار و کار و سماجی عوامل کے تقاضوں سے قطعاً یہ یاد۔ نو۔ آنکھیں نہ کر کے بے ربط اور بے دھجکے
 انداز میں مطلب کی ان ٹی واپسی تحریکوں کے اثرات قبول کرتے رہے جس کی گہری اساس و اہل
 پسندی اور رجعت پروری پر قائم تھی ان تحریکوں سے (اس میں سرپرست اور رائے حقیقت) (امیر کرم) (امیر
 جبر تراشی) (امیر علم) (شہادت) (مریمت) (امیر شہر) (امیر شہر) (امیر شہر) (امیر شہر)
 (امیرت) (امیرت) (امیرت) (امیرت) (امیرت) (امیرت) (امیرت) (امیرت) (امیرت) (امیرت) (امیرت) (امیرت)
 اور خود یہ حال۔ اطراوت کو لہذا دیا تھا شاعری کی حد تک مطلب کے علمات پسندوں اور بنیت
 پر صوب کو بیرونی کار و کار و سماجی ادب اور دیگر شری مصنف میں ان مصلحت کی پورش تھی جو
 زندگی سے بیرونی اور باہر پیدا کرتے تھے جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے سماج کو کوئی اہمیت نہ
 دینے اور زندگی سے آنکھیں پاند۔ کر کے کے باعث ہے رجعت پسند ادبوں کی کوئی۔ غیر عظیم قلم
 میں ہو سکی۔ علم ادب و ادب کی سر زمین لاہور کے صرف ان طبقے تک محدود تھیں جو شعراء و ادب کو
 مجید اور با مقصد سماجی عمل کے بجائے نفس صبیح کا دریہ سمجھتا تھا۔ تمام طبقے کے شاعریں اور ادبوں
 سے جیت اور اطوب کے بعض خوشگوار اور نادر تجربے کے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ
 لا شعوری طور پر ترقی پسند تحریک کے بھی بعض اہستہ اہستہ اثرات قبول کیے میراجی اور شعراء

فحش رجعت شعار جدیدیت کے سر میں کسا چاہیے، دونوں زندگی کے معادلات اور سماجی حقیقتوں سے مطلقاً لائق پس روٹنے میراثی، جن کے کلام میں جیسی کج روی، اعلاست و شہرت اور 'بہام' کا دھور ہے، اپنی 'تڑی دور کی تھکیات میں حیات و کائنات کے چھوٹی مسائل پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنے نظر آتے ہیں۔ اور ان میں راشد احسن کی بدنامی شاعری زندگی سے غریبی نما ہے اور نہ راتہ راتہ زندگی سے ناگھیں چار کرے کی بہت اور خاصہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں اگرچہ سماجی حقائق کی ادیت تاکہ، مصائب پر در صورت حال ترقی پسندوں کی طرح فحش رجعت کو یکسر تہہ میں کرے کے بے مزاحمت اور تھلیل جہد زندگی اور پس سے جاتی اور دنیا بانی کے کرب میں مبتلا ہو کر خوابوں کی دنیا میں پناہ لیجے ہیں، تاہم پتے کی بات یہ ہے کہ انھوں نے جو اب خود پرستہ انفرادیت کے تحت اپنے ذاتی مسائل کے حل اور اپنی جدائی آسوں کی خاطر میں دیکھے بلکہ سماج کی ہستری اور ترقی اور انسان کی سرپرستی کی خواہش سے فحش رجعت کو بے ادب و کھائے تھے عسکری ترقی پسند ادب کو جو ہر دھڑائی اور قبولیت عامہ میں اس کا عشر عشر بھی رجعت شعار جدید شاعروں اور ادیبوں کے حصے میں نہیں آیا۔

ترقی پسندوں کے خلاف کداحت پرستوں اور رجعت شعار جدیدیت کے علمبرداروں کی محاذ آرائی سے اردو ادب کی توانائی میں زبردست فائدہ ہوا اور ترقی پسند ادب کی تحریک کو خصوصیت کے ساتھ بہت قاعدہ پایا۔ ترقی پسندوں کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں اور بوجھیں اور انھوں نے اپنی بعض خاصوں پر قائم پایا۔ ان کے اس احساس سے کہ عام لوگوں خصوصاً محنت کشوں کی زندگی میں ان کے فخر کا صلہ سرچشمہ ہے اور چھ ادب اور فن وہی ہے جو عوام کی زندگی کو ستر سے بستر جانے کی خواہش کے تحت فحش کیا گیا ہو، ان سے ایسا ادب فحش کر دیا جو نہ صرف حال کی حقیقتوں کا عکاس اور ترجمان تھا بلکہ ایک بہتر روشن مستقبل کا راستہ بھی دکھاتا تھا، برصغیر کی بھی بڑی زبانوں کے ترقی پسند لکھنے والے اس ڈر پر چل پڑے تھے۔ ردوین، اعلا قالی، دیاں ہونے کے باعث برصغیر کی مشترک اور سب سے بڑی زبان تھی (اور ہے) اردو کا ترقی پسند ادب کیت اور کیت دونوں کے اعتبار سے خصوصی اور خیالی مثبت رکھتا تھا

اردو میں ترقی پسند تحریک کے رر اثر جواب پیدا ہوا، اس میں قالی اور عصری حد فحش کا بے لاگ اعتبار تھا اور وہ علی ہائے کے عالمی ادب سے انھیں ملانے کا تھا اردو شاعری میں زندگی کا نیا شعور اور بیا آہنگ پیدا ہوا تھا موضوعات کا نیا بڑھ گیا تھا۔ بہت کے فن میں اہم ترین تجربہ

علم تراک کا حق میں کی ادبیت کا سراغ تصدیق جس کے علم کے سر سے ہی جلد کے بعد میر تقی اور راشد سے
چند تخلیقات کو بھجوا کر اپنی راسخ شاعری کے بے صرف ہی یک مہیب کا خطاب کیا ترقی پسندوں
سے پانچ علم کی مختلف چیزوں کے علاوہ علم تراک کی چلہ زامیت کو بھی بھجوا تا اور اس کے وسیع امکانات
سے فائدہ اٹھایا مگر اس کی کھسوں کو ہمیشہ نظر نہ رہا جو موضوعات کی مسامتہ سے جھینے ہوتے ہیں
علم اور حزن دونوں میں روایں پروری سے حقیقت نکلی اور علم میں سے علم اور اس تک کے سطر کا آغاز
گشت اپنی دوری میں ہو چکا تھا اب ترقی پسند شعر کی نئی تخلیقات میں روایں اور حقیقت یا علم
جانب اور علم دونوں کا امتزاج ہوتا تھا اور بعض میں حقیقت نکالنے کے تقاضے روایں پروری پر غالب
ہوتے تھے بعض شاعروں کے ہاں صافیت کے دھڑ اور محنت اور اعلیٰ رنگات کے ساتھ انقلاب کی
روح و حلی تھی اور بعض کے ہاں سماجی مہموریں اور حقیقی انجمن سے سرواڑا ہونے کے بے
محدود انداز اور انقلابی فکر گرج۔ سماجی شعور رکھنے والے شعر کا مہذبہ اپنی مقام ترقی پسندوں کی
تحریک کے آغاز سے قبل پچھلے اپنی دوری میں متعین ہو چکا تھا ان کی شاعری میں بھی ترقی پسند
تحریک کے زیر اثر تھی جن میں بے اسوئی ملنا خوش سے میل۔ حق وطن کی تہذیب پر غور و فکر اور
انکار اور انکار اور رسوم و رواج سے غفلت تو پہلے ہی سے موجود تھی۔ انقلاب کی فکر گرج ترقی پسند
تحریک کی دین تھی فرق کے لمحے میں گھٹوں کی نرم روی تھی اور دوا و دت حسن و عشق اور جدات
انسانی کی مختلف کیفیات کے اظہار میں حیران کن جنوں کی مشاد ہی تو رہتے ہی تھے اب ان کی
شاعری میں انقلاب کی آہٹ بھی سنی دے لگی آئندہ ان کی فن میں بھی سماجی موضوعات اور
انقلابی رویہ دے آئے سے ترقی پسند شعر سے جدید علم کی رویت کو آگے بڑھایا اور اگرچہ جدید
مردم اور احزابوں کے علاوہ فکر یا فہم ترقی پسند شعراء سے علم، حزن دونوں میں قادر انکالی کا
ظہور کیا مگر ان میں سے اکثر نے اپنے تخلیقی علم کے بے علم و غفل پر ترجیح دی۔ جدید اور مردم
ماہر غزل کے شاعر میں اور احزابوں سے فہم کی کوئی فن کیسے کئی صف اول کے نمایاں ترقی
پسند شاعروں میں علی سہار سہری، محمد امجدی الدیں، حجازیایں، محمد امجدی، کبلی، عطی،
ماہرہ حیوانی، حمید کے جوہر غزل سے زیادہ علم میں کھینچے ہیں اور تاثیر، ہبذ، فیض، جاں نثار احزاب
واسع جوہری اور غمیر کا شیری سے جس پائے کی عظیمی تھی جس کی پائے کی اس کی حزن میں بھی ہیں
ترقی پسند ادب کی تحریک کے آغاز اور مہذب کے زمانے میں یعنی ۱۹۵۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین
کے قیام سے لے کر پاکستان کے حوالے سے ۱۹۵۷ء میں اہد جہدستان کے حوالے سے ۱۹۵۹ء میں

تکمن کے عاقبے تک، جسے ہم نے عہد جدید کا دور اور قرار دے کر عہد حاضر یا ہے، رہا ہے۔ اس میں شامل کیا ہے، ان سرکردہ شاعروں کے علاوہ جس کا نام بھی ذکر ہو چکا ہے جو دوسرے شعراء، محرک سے وابستہ رہے۔ ان میں سب کچھ ہم نام نہیں کرتے۔ حاتم انصاری، رباعی، علی جوادی، پیر علی شاہی، قنبر شعلی، غلام ربانی تلمی، عارف عہد، منین، سلام گھنٹی شری، مسعود حتر جلال، شیخ الہادی، ابو آکے جل کر مصطفیٰ ریدی کے نام سے مشہور ہونے والے، حیدر، الفارغی، ناری، صاحب مدنی، طاہر مروی، عیسیٰ ملک، مظہر حیدر، تادی، بنی الشاء، عیسیٰ مرعش، منصور نظر، محمد مرزا، حدیث علی شاعر، احمد ظفر، رفیق جبار، بعض شعراء، اگرچہ باصلاح محرک سے وابستہ نہیں تھے لیکن ان کا کام ترقی پسندی کے معیار پر ہے، آتا تھا ایسے شعراء میں شاہ، یحییٰ حق کو اختیار بی سلام حاصل ہے۔

شاعری کی طرز، انسانی ادب میں بھی دوہلی پروری سے حقیقت نگاری تک کے سفر کا آغاز ہو چکا ہے۔ پہلے ادبی دور میں سوچا تھا، پچھلا دور جیسا کہ آپ کے علم میں ہے، یہ ادب کا روایتی اور جمالیاتی دور تھا۔ اس دور میں عام طور پر جو نساے اور ناؤں لکھے گئے ان کے لکھے والے قصے کی ست کے دور ان حقیقی زندگی میں پیش آئے والے واقعات کو تو صبر سامنے رکھتے تھے مگر ان کا ادبی انداز نظر اور تخیل کی صورت سے زیادہ ایک آمیزشی قصے کو یہاں طور پر حقیقی کے بجائے خیالی بنا رہی تھی جن انسانوں اور ناؤں میں سماجی اصلاح کو ہمیشہ نظر رکھا جاتا تھا حالات قیاس و افتح اور حیرت انگیز کرداروں کی صورت میں ان میں بھی لکھے والا بجائے اس کے کہ زندگی کے معروضی حقائق کو ہمیشہ نظر رکھ کر سامع کی عقلیت پسندی کی روشنی میں مساعی کا حل تلاش کرے، اپنی ذاتی در اندر دوی خواہش کے مطابق جذباتی حل ہمیشہ کرنے یا اس کی نشاندہی کرے کا روایتی رویہ اختیار کرتا تھا قصے کو دلکش جانے اور انداز بیان میں رنگین اور دلکش پیدا کرنے پر مامور دیا جاتا تھا یہ روایتی اور جمالیاتی نساے اور ناؤں قاری کی دلچسپی اور تفریح طبع کا مادیان تو ضرور ہم پہچانتے تھے مگر اس کی سماجی مصیرت میں کوئی اصلاح نہیں کرتے تھے۔ اس دور میں پریم چند وہ پہلے ادیب تھے جن کے انسانوں اور ناؤں میں عوام کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ وہی پسند ہم مصروں کی طرز (حسن) میں علامہ حیدر ملہ، مہاراجہ، انجمن گورکھپوری، سلطان حیدر، جوش، ال احمد، جلال فاضل علی کو خصوصی حیثیت حاصل ہے۔ پریم چند خیالی کرداروں کے دیگر ہیں، تراشے ملکہ محبت کش عوام کو اپنے انسانوں اور ناؤں کے سرکاری کردار یا حقیقی اور عملی زندگی کی حقیقی جانکی تصویریں ہمیشہ کرتے ہیں۔ اپنی عمر کے بیشتر حصے میں پریم چند عیسیت پسند رہے اور سماجی مساعی کے حل کے مسئلے میں ان کا نقطہ نظر اصلاح

شامل ہیں۔ اور جو ترقی پسند ادیب اردو میں ترجمے کے فن کو اوج تک پہنچانے میں سرفہرست ہیں ان میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، عزیز احمد، ڈاکٹر خالد حسین، پروفیسر احتشام حسین، انصاری، یو یس احمد، مظہری فرید اکوٹی اور علو، جلیل حسنی شامل ہیں۔

عہد جدید کے اس دوسرے دور میں عوام کے مڑتے ہوئے سیاسی و سماجی شعور کو عطا دیے اور اسے صحیح معنوں میں انقلابی شعور میں ڈھالتے کی غرض سے بعض ترقی پسند فن کاروں نے انجمن میں ناقص موجد، 'صبح' اور 'ظلم' کے 'ڈاکٹر' ادیب اور شاعر شامل تھے، انہیں پیشتر تھینٹر ایسوسی ایشن میں چند مقامی حویلی تھینٹر کی انجمن قائم کی جسے عام طور پر "پتا" (IPTA) کہا جاتا تھا۔ اس انجمن کے انگریزی نام کا مختلف تھا۔ پتا کا صدر دفتر ممبئی میں تھا اور اس کی شاخیں برصغیر کے مختلف علاقوں میں قائم ہو چکی تھیں۔ پتا کے زیرِ احاطہ ہندی اور مختلف علاقائی زبانوں میں رقص و موسیقی، فیلیم تماشوں اور ڈراموں کے پروگرام پیش کیے جاتے تھے۔ یہ پروگرام عوامی زندگی کے حقائق پر مبنی ہوتے تھے اور ان میں عوام کے مسائل کو سمجھنے اور ان سے نمٹنے کے انقلابی راستوں کو روشن کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ ممبئی میں خواجہ احمد عباس، پٹا کی سرگرمیوں میں بہت فعال تھے۔ انہوں نے پتا کے لیے مصنف اور ہدایت کار دونوں حیثیتوں سے کام کیا اور پتا کے زیرِ احاطہ ایک فلم بھی بنائی (بعد میں انہوں نے جو اور فلمیں بنائیں ان کا پتا سے کوئی تعلق نہیں تھا)۔ اردو ادب برصغیر کی دوسری زبانوں کے کئی ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں نے پتا کے لیے فلمی خدمات انجام دیں۔ اور اردو کے ادیبوں میں حبیب تحویرے تو مصنف، ہدایت کار اور پیش کار کی حیثیت سے اپنے کو عوامی تھینٹر کے لیے وقف کر دیا۔ پٹا کی سرگرمیوں سے قطع نظر، اس دور کے جن ترقی پسند ادیبوں نے انجمن کے لی ٹھاسوں کے ساتھ ساتھ ادبی معیار پر پورے اترنے والے ڈرامے لکھے ان میں خواجہ احمد عباس، میرزا ادیب، روپنی سرین شرما اور حبیب تحویر سرفہرست ہیں۔

میں طرح گذشتہ ادبی دور میں جدید تنقید کی دائرہ عمل کے "مقدار شعر و شاعری" سے پہلی تھی، اسی طرح ترقی پسند تنقید کا آغاز ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے تاریخی مقالے "ادب اور زندگی" سے ہوا۔ یہ مقالہ نقد و نظر کے جو معیار فراہم کرتا ہے ان کے مرکز و محور کی حیثیت ہر کسی تنقید کو حاصل ہے۔ ہر کسی تنقید دیگر تنقیدی کتاب کی طرح انسانی معاشرے کے صرف حلقے پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ معروضی حقائق کی گہرائیوں میں اتار کر معاشرے کی ارتقاء کے جدیداتی محرکات کی جستجو کرتی ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے بعد ترقی پسند تنقید کی نشوونما کے لیے جن

حسین کا صہ آئے گا۔

مولانا احتیاطی عرشی نے لکھا

"میں اگر کہوں کہ احتشام صاحب جیسے ادیب اور صاحب فکر لفظ و رد کو
ہر توں تک نہیں ملے گا تو سے میری قنوتیت۔ گمما جائے"

ترقی پسندوں نے رد کے قدیم و جدید ادب کا سب سے سہ سے جانور ہوا ہر سامے کے
سمای حقائق کے ناظر میں ترقی پسندی کے قاصوں کا نہیں کر کے اس زمانے کی ادبی تحقیقات کو پرکھا گیا
کئی ایسے گوشے روشن ہوئے جو اب تک تاریکی میں تھے اور ادب کی اشراہی نے نظیر اکبر آبادی کے
ساتھ یہی روایت کی تھی اس کے رد تک نظیر کی شاعری معیار سے گری ہوئی، علمیانہ اور پڑائی تھی
ایسی صدی کے آخر یا بیسویں صدی کی ابتدا میں پروفیسر عبد الغفور شہرے "حیات سے نظیر"
لکھ کر نظیر اکبر آبادی کے بے دری کام کرنا چاہا تھا جو ان کے دست بعد عبدالرحمن بھٹوری نے "عاشق
کلام غالب" لکھ کر غالب کے بے تمام ویا تھا، رام پال سکسینہ نے بھی نظیر کو اپنی ذات میں ایک
کتب قرار دے کر باہر متعارف دیا تھا مگر وہاں پسند اور نورد و اصیاتی کے پرستاروں نے نظیر کو کئی
عاشق توجہ میں دینی نظیر کی شاعری کی اصل قدر و قیمت اور ان کے ادبی مقام و مرتبہ کا صحیح اندازہ ترقی
پسندوں ہی نے کرایا اس سلسلے میں پہلا مضبوطی بنا پروفیسر احتشام حسین نے لکھا تھا قدیم ادب
کی چھان پہ محکم کے معاملے میں تو اصیاتی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا، اپنے زمانے کے ادبی فن
پاروں کو بھی ترقی پسند اصیاتی سے ملنے ہو کر پرکھتے تھے رنگ کی عزل غلوں اور تلخ حقائق کی آنکھوں
میں آنکھیں ڈال کر زندگی سے ہوا کرنا ہوتی ہے اور اسی مسابقت سے ان کا لہجہ چلائی کا کمزور اپن ہو
نوک ملت گئے کی تنک اور رجز کا آہنگ ملے ہوئے ہے۔ و عزل ترقی پسندوں کے نظریے میں پوری
ترقی ہے، چنانچہ ہر جو اس کے رنگ ترقی پسندوں کے شدید مخالف تھے اور غالب (اور کسی کسی اقبال)
کی طرح ترقی پسند بھی ان کے مخصوص شعور، شام طرازی کا بدتہ رہتے تھے مگر ترقی پسندوں کے
اثبات گھر نے ان کے مخالف کلام کا مجموعہ "تکبیر" شائع کیا۔

مجموعی طور پر اردو ادب کی جو پیش رفت ترقی پسندوں نے، انہا میں ان کا قرار واقعی
احتراف کرنے والوں میں اگر ایک طرف بیانیے اور ڈاکٹر مولوی عبد الحق تھے جو ترقی پسند ادب کی
تحریک کے معاملہ سے اتفاق رکھتے تھے تو دوسری طرف پروفیسر رشید احمد صدیقی بھی تھے جو ترقی
پسندوں کے حق مخالف تھے اور اس مخالفت میں آخر تک ثابت قدم رہے۔ بیانیے اور نے ۱۹۵۳ء

میں اپنے ایک مدد ملی جیلے میں تھا

"میں کتابوں اور اس کے کاغذوں میں اس کو مانتے ہیں کہ انھیں ترقی

پسند مصطفیٰ نے پہلے اس کی خدمت کی اور اس کا درجہ ملے کیا وقار کو رہا اور

ادب میں دست پیدا کی اور اس کی عقید میں ان کا کام ساری قابل تھا ہے "

اور رشید احمد مدظلی نے مئی ۱۸۵۵ء میں پھر میں ملے اور اس کی صدارت کرتے ہوئے

کا

"بدعت خود میر میں ہے کہ ترقی پسندوں کا مقصد کچھ بھی رہا ہو "

گذشتہ چند سو سال میں اردو میں موضوع اور ادب کے اعتبار سے جتنے تھے اور

کامیاب اور عقیدہ تحریر ہوئے ہیں اسے ادب کی تاریخ میں کسی نہیں ہوئے اور

اردو کے کہ ترقی پسند مصطفیٰ میرے کچھ ایسے ماضی دار بھی ہیں اس میں اس کا

قابل ہوں کہ اسوں سے اردو کی بہت قابل قدر خدمت انجام دی ہیں "

اسی جیلے میں آگے چل کر پروفیسر رشید احمد مدظلی نے کہا

"تقسیم ملک کے بعد جو قیامت مچی اس کو فہم کرے اور راجت پرست

حافظوں سے ٹکر لے کر ترقی پسند مصطفیٰ کا فنی حلا صرف اردو ادب میں نہیں تھا

اس میں اس کی تاریخ میں ٹکر گداری کے ساتھ یاد رکھا جائے اس فنی حلا میں بعض ایسی

تصانیف وجود میں آئیں جن کا اردو ادب میں کاسیکی درجہ ہے "

ترقی پسند تحریک کو پہلے بکراں کا سال ۱۸۵۹ء میں کہا پڑا آئے اس بحران کے

اسباب اور اس کی وجہ معلوم کرتے ہیں ۱۸۵۵ء میں دسری جنگ عظیم کے مانتے کے بعد مالی

صورت حال یہ تھی کہ اس جنگ سے پورا قریض دے کر اور غیر معمولی مصلحتوں کا مظہرہ کر کے

سودت یونین سے نظامیت کو شکست دے کر اور اس کی تباہی اور ماضی حلقوں کے لیے

محت تشویش باعث تھا اور سودت یونین کو اپنے میں دیکھا جاتی تھی اور بالآخر اسے حم کرنے کے

ورپے تھیں چنانچہ اسوں سے سودت یونین کے خلاف سوجنگ کا آغاز کر دیا دسری طرف جنگ

میں سودت یونین کے کردار سے دیا سحر کے اسلحہ دست و ہتھوروں اور مظلوم عوام کی نظروں میں

اس کے آثار کو بڑھایا تھا چین اور مشرقی یورپ میں کسی سلسلوں کی کمی نہیں ، حکومت اقوام میں آزادی

ن تحریکوں کے قوت پکڑنے اور دنیا بھر میں بائیں بازو کی تحریکوں کی برحق یعنی مقبولیت سے ایسا

محسوس ہوئے گا تھا کہ انقلاب کی منزل بہت قریب آگئی ہے اور ہر صغیر میں جدوجہد آزادی کی

کامیابی کے بعد اگست ۱۹۴۷ء میں ۱۱ مملکتیں ہندوستان اور پاکستان وجود میں آئیں اور ان دونوں مملکتوں کی حکومتوں نے سامراج واداری کی پالیسی اصرار کی، انجمن ترقی پسند معضیں کے ارکین میں کچھ سطوں کی تعداد اگرچہ بہت کم تھی مگر آزادی اور جمہوریت پر یقین رکھنے والے غیر اشتراکی انسانیت دوست اور سب، خاص اور دانشور بھی سرہے دارانہ نظام کے سخت مخالف اور کسی نہ کسی قسم کی اشتراکیت یا انقلابی نظام کے حامی تھے۔ یہ لوگ بھی ایک طرف عالمی صورت حال کے پیش نظر یہ سمجھ رہے تھے کہ انقلاب دھک دے رہا ہے، اس ایک آخری بعد کن حد و حد کی ضرورت ہے اور دوسری جانب اپنی قومی حکومتوں کی سامراجی نواز پالیسی اور عوامی تحریکوں کو کچلنے کے لیے ان کے ظلم و ستم اور جارحانہ اقدامات پر انہیں سخت غم و غصہ تھا چنانچہ انجمن ترقی پسند معضیں کی پانچویں گل ہند کانفرنس میں جو سنی میں حکومت کی اجازت۔ ملے کے باعث مئی ۱۹۴۹ء میں سنی کے قریب ایک چھوٹے سے قصبے بھٹری میں منعقد ہوئی، نظریاتی اجتماع پسندی سے کام لیا گیا اور ایک یا مشور منظور کیا گیا جس کے میں اسطورہ مندرجہ چھاپا ہوا تھا کہ ترقی پسند ادیب کے لیے کمیونسٹ یا مارکسٹ ہونا ضروری ہے

اس اجتماع پسندی نے یہ توں علی سردار جھڑی * اس قوس قزح کو کھیر دیا جس کے ایک سرے پر کمیونسٹ جلاوٹگیر اور دوسرے سرے پر گندھی وادی مٹی پریم چند اور دوسریاں میں درست سے رنگ تھے * پاکستان کی انجمن ترقی پسند معضیں نے بھی سنی اجتماع پسند راہ اختیار کیا ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ بہت سے ترقی پسندوں کو جو اجتماع پسندی کے حق میں ہیں تھے، انجمن کی رگبیت سے خارج کر دیا گیا اور ایک طرف تو دونوں ممالک میں ترقی پسند تحریک انتشار کا شکار ہوئی اور دوسری طرف دونوں ممالک کی حکومتوں نے جو اپنی سامراجی نواز پالیسیوں کی راہ پر شہساز ہی سے ترقی پسندوں پر مظالم ڈھارہی تھی، اب ان کے خلاف اپنی جارحانہ پالیسی میں مزید تخیل اور شدت پیدا کر دی ان اختلافی یا مسدود حالات میں بھی ترقی پسند ادیبوں نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں اور وہ ترقی پسند ادیب بھی جنہیں انجمن سے تنگ کر دیا گیا تھا، اپنے انسانیت دوست ترقی پسند مسئلہ پر ہمدردی کے ساتھ بے رہے اور اعلیٰ پائے کا ادب تخلیق کرنے رہے ترقی پسند ادیب کے بعض شاہکار تحریک میں پیدا ہوئے والے حیدرآباد کے بعد وجود میں آئے رفیع زکریا بعض اجتماع پسند ترقی پسندوں کو یہ احساس ہونے لگا کہ حالیہ حالات کا نامہ اراکے سے میں اور جو کہ کھائے اور اجتماع پسندی کی جو روش اسوں نے اختیار کی وہ غلط طریقہ تھا چنانچہ انجمن ترقی پسند معضیں کی سنی تلاش سے اگست ۱۹۵۱ء میں بھٹری کانفرنس کے مشور کو مسترد کر کے انجمن کا وہی مشور اپنایا جو ۱۹۴۹ء میں

سرکیف اس بھرن پر بحث و تمحیص کا یہ موقع سیں تاہم اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ ہندی
 رائے میں اس بھرن اور اس کے ساتھ خود شریف کی وضع کردہ اس نئے ہندی کی پالیسی سے موجودہ
 صدی کے اس سب سے بڑے عالمی بھرن کی تاریخ میل اول دی جولاء ۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۱ء میں سوویت
 یونین کے خاتمے کی صورت میں عکس و پرہیز ہوا پر اس نئے ہندی کی پالیسی اور حقیقت انقلاب پروری کی
 روش چھوڑ کر اصلاح پسندوں کے رستے پر لوٹ جاسے کی پالیسی تھی ۔ یہ وہ مسئلہ قانون میں منع
 کرانے کی پالیسی تھی جن کے درمیان بیکار اور تھلوم زندگی کو آنے کے برصانے کے یہ ضروری تھا ۔

ظاہر ہے پالیسی دنیا میں امن کے قیام اور اسے دائمی بنانے کے یہ وضع کی گئی تھی مگر یہ محض خود مری
 تھی ۔ پالیسی نہ تو دنیا کی حکومت و مظلوم اقوام کو پر اس طریقوں سے آزادی دلائی ۔ نہ دنیا کے مختلف
 حصوں میں جوئے والی جنگوں کو ختم کرانے اور نہ اس کے باعث سوویت یونین کے خلاف باہرانی
 طاقتوں کی سوجھ بوجھ میں کوئی کمی آئی اس پالیسی نے سوویت یونین کے انقلابی عوام کو کچھ کیا اور
 باہرانیوں کے جارحانہ استحصال عوام کو قنوت بخشی ۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ روس ۱۹۷۱ء شراکی
 انقلاب دنیا کے حکومت و مظلوم محنت کش عوام اور انسانیت دوست دانشوروں کے لیے سارا دور ہیبت ہوا
 تھا اور وہ ہر نوع کے استحصال کے خلاف جدوجہد میں سوویت یونین کی قیادت اور رجحان پر بہت بھروسہ
 کرتے تھے ۔ بے شمار کمیونسٹ اور بائیں بازو کے انسان دوست دانشور ایسے بھی تھے جو آنکھیں جھک کر
 کے سوویت یونین کی پالیسیوں کی حمایت کرتے تھے ۔ چنانچہ پر امن بنانے ہندی کی پالیسی کے تحت
 ایسے لوگ انقلاب کے نام پر اصلاح پسندی کی طرف مائل ہو گئے اور سراج دارانہ جمہوریت اور اس نام
 نہ جمہوریت کے تحت پارسیائی نظام حکومت کی ، میں اس طرح ہونے لگیں گو یا کسی بھانے مقصود
 ہے ۔ ہندوستان اور پاکستان کے ترقی پسند ادیبوں ، دانشوروں اور دانشوروں میں بھی وہ گروہ ہو گئے ایک
 وہ جو عملی زندگی میں بھی حسب معمول اپنی انقلاب پرور روش پر قائم ہوا اور سارا دہیں نے پر امن
 بنانے ہندی کی پالیسی کی حمایت کر کے دور مری کی زندگی میں اپنے انقلابی طور طریقے ترک کر دیے
 ہندوستان میں اس دوسرے گروہ کے ترقی پسندوں کی قوم پرستی میں بھی اصلاح ہوا اور اسیں سہاکی
 شخصیت میں ایک عظیم ترقی پسند سیاسی رہنما کے اوصاف نظر آنے لگے جب کہ نومبر ۱۹۵۷ء میں
 بمبئی کے ایک عوامی مشاعرے میں بھارت نے جو گیت سنایا تھا اس کا ایک قول یہ بھی تھا

”کامن ویلتھ کا واس ہے سوا اور جلتی لائے نہ پائے“

اور بھارت کا یہ گیت اس زمانے میں ہندوستان کے تمام ترقی پسندوں کے دل کی آواز تھا

اگر ترقی پسند مصطفیٰ (ج) کے خاتمے کا اعلان کرے کے ساتھ دیگر عبداللطیف کے ادبوں کی ایک نئی ہندو مت کے کی جو جو پیش کی تھی اور کہا تھا کہ اس میں شامل ہو کر ترقی پسند اپنے نظریات کو فروغ دیتے ہیں، معلوم ہیں اس پر عمل ہوا یا نہیں، لیکن اس کی ہم سب کو خبر ہے کہ اس وقت سے آج تک ہندوستان کے ترقی پسندوں کے حکومت ہند سے ہر استیفاء و واسطہ مراعات حاصل کی ہیں۔ روزی روزگار کے سلسلے میں اپنی قوی حکومتوں سے "بے صبر" شعبوں میں محدود تنہوں کو تو اختیار پسندی کے واسطے میں بھی جاری قرار دیا گیا تھا۔ کھینچی کاٹھن میں جوش کے "آج کل" کی ادارت قیوں کرنے پر اس وجہ سے اعتراض تھا کہ ترقی پسند ادب کی تحریک میں ان کا مقام اور موجودہ مت حد تھا، مگر اس میں اور حکومت کے تعلیمی اور تکنیکی اداروں میں طاقت کرنے والے ہیں ترقی پسند ادبوں کو اگر ترقی پسندوں کے خاتمے میں کیا گیا مگر یہی معاملہ روزی روزگار کی مجبوری کا نہیں بلکہ حکومت سے مراعات حاصل کرنے کا تھا۔ ترقی پسندوں کے طالب نے تو یہ الزام بھی لگایا کہ حکومت کی مراعات حاصل کرنے کے لیے ترقی پسند آپس میں ایک دوسرے پر سخت لے جانے کی عرصے سے بعض اوقات گھنیا حرکتیں پر بھی اتر آتے تھے۔ ہمیں یہ الزام اس کہ اور صبر پر ہی نظر آتا ہے جو ترقی پسندوں سے عوامان کے طالب کو ہمیشہ رہا ہے، مگر جب چل کر انٹرول روڈ سے ہو کر گئے ہیں

وطن سے عشق، غری سے ہیر، امن سے ہیر
میں نے اوزار رکھے ہیں، قلب جیسے ہیں

۱۰

جامے، شیشے، حکمرانوں کے
آپ کہیں آگے ہم طاقتوں کے

تو ہمیں انقلاب پروری کی روش "کے" کرنے والے ترقی پسندوں کے منسوب کا اندازہ ہوتا ہے جس میں وہ اپنے "تجربوں" کے واسطے دل دینے کے باعث ملتا ہے۔ جس میں محمد ایوب علی کے آمرانہ دور حکومت میں پاکستان کے بھی حصہ ترقی پسند دور پر وہ حکومت کی قائم کردہ اداروں کی جماعت پاکستان، انٹرنیٹ میں شامل ہو گئے تھے اور ان میں سے بعض کو ایوب علی کی شخصیت میں ایک "ملکی پسند اور دودھ حوالی آمر" کے اوصاف نظر آئے تھے۔ ہم ہندوستان اور پاکستان دونوں ملک کے ایسے تمام ترقی پسندوں کو، جنہوں نے ہر امن کے واسطے ہانسی کی پالیسی کے تحت

اچے اچے ملک کی قومی حکومتوں کے تعلق سے ہمیں بازو کے اعتدال پسندوں کی روش کو اپنانا، بدینیت و بد عنوانیوں کا مرتکب نہیں سمجھتے، ان میں قومی سربراہ جتنی بھی میں جموں سے سروکار عظیم ترقی پسند قومی رہن کے طور پر سراہا اور فیض مدد فیض بھی تھے جموں نے حکومت میں امن اور شکانت کا شعبہ سنبھالا اور ان دونوں کی بیٹوں پہ کوئی پانگل ہی شبہ کر سکتا ہے کسی دور میں بھی ان کا طریق کار کچھ بھی رہا ہو، محنت کش عوام اور مظلوم و محکوم اقوام کی جدوجہد میں ہمیشہ شامل رہے اور قربانیاں دیتے رہے۔ ایسے تمام ترقی پسندوں کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے جس زمانے میں جو روش اختیار کی اس زمانے کے حالات میں وہی کو عوامی مسائل کے حل کے لیے کارگر اور کارآمد سمجھتے تھے آپ کو ان سے اتفاق میں تو سے ان کی انتہائی غلطی پر محسوس کر سکتے ہیں، بدینیتی اور بے ایمانی پر کسی اب میں بعض بے سمیرہ و بے ہوش فرد بھی ہو گئے مگر ان کی مہارتی اکثریت انسانیات، انسانی اور عوام دوستی کے مسلک پر پورے محسوس کے ساتھ قائم رہی سیاسی نقطہ نظر سے ان کے عمل میں لاکھ مصلح پسندوں والا اعتدال آیا ہو، اپنی دینی تحلیلات میں ان کا رویہ انقلاب پروری ہی کا تھا۔

آپس کے اختلافات اور شکوے شکایات سے قطع نظر بیشتر ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقی سرگرمیوں میں جدید کے عیسوی دور میں بھی یہی منہج پر جاری ہیں جو عیسویوں کے دور سے ہے اور یہی انہیں ترقی پسند مصنفین کے عروج کے زمانے میں اختیار کی تھی عالمی اور علاقائی سطحوں پر سیاسی اور سماجی حالات میں آنے والی تبدیلیوں کے باوجود محنت کش عوام اور مظلوم و محکوم اقوام کے مسائل وہی تھے جن کا گذشتہ دور میں سامنا تھا لہذا اب یہ کچھ اور سمجھیں ہو گئے تھے، انہیں ترقی پسند مصنفین کی عظیم کوششوں میں ابھی باقی رہا چاہیے تھا، مگر سماجی حقیقت نگاری پر عمل ادب برائے زندگی کا وہ نظریہ ادیبوں اور شاعروں کی بہت بڑی اکثریت میں مقبول ہو چکا تھا جس کا پرچار ترقی پسند ادب کی تحریک نے کیا تھا، انہیں ترقی پسند مصنفین کے حم کے چاے کے دو چار سال بعد ڈاکٹر محی الدین قلاوڑی اور اے اے ایک مضمون میں ترقی پسند ادب کی تحریک کا جائزہ بیچے ہوئے لکھا تھا "اس تحریک نے آزادی خیال اور آزادی بیان کے جو چشمے سامنے ہیں ان سے پوری اور دنیا سیراب ہو چکی ہے بڑے بڑے رجعت پسند اس سے متاثر ہوئے بغیر۔ وہ نئے اور غیر راہی طور پر وہ انداز نگار اور طرحیں اختیار کر چکے ہیں جس کی طرف ترقی پسند تحریک نہیں لے جاتی تھی" صورت حال یہ ہو تو عظیم کے ہونے کے باوجود تحریک سر میں نکلی چنانچہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں ان

وغیرہ دوسرے دور میں ابھرے تھے اور ان سب کی شاعری پر شہب میرے دور میں آنی جو لوگ
 میرے دور ہی میں خایلی ہو کر سامنے آئے اور صباؤں کے معجز شاعر میں شمار ہوئے لیکن میں
 حسن علی، سحر انصاری، محسن بھوپالی، حبیب صاحب، احمد بدای، محسن مسکن، مسلم شمیم، مس
 عابدی، محسن علی صاحب، نصیر دہلوی، امجد اسلام امجد، سی احتر شوق، شاہد نقوی، انور، محسن مدنی،
 و حد بشیر، عبدالغنی عیاد، دہر، لکھو، نسیم سید، عرفان، حسن، محمد صبا، عشرت آفریں، حسین مشیر
 علوی وغیرہ شامل ہیں۔ گذشتہ دور کے متعدد استاد گارن دور میں بھی علی درجے کے استاد لکھ
 رہے تھے۔ ان استاد نگاروں میں جنسین امتیازی حیثیت میرے دور ہی میں ملی جیلانی، ابو جہد، محسن،
 قیصر عظیم، ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر مصطفیٰ کریم، حر جلال، ارمیہ، صبح احمد، نسیم آرمی، نصیر وار، دور
 کی دوسرے شامل ہیں۔ حیات اللہ انصاری، شوکت مدنی اور عبد بچہ مسعود کا شمار دوسرے دور کے
 معجز استاد نگاروں میں ہوتا ہے۔ میرے دور میں ان تینوں سے استادوں کے علاوہ علی درجے کے
 جلال بھی لکھے۔ انشائی ادب میں قراوا العین حیدر نے دوسرے دور ہی میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا
 تھا۔ مگر ترقی پسندی سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ میرے دور میں ان کے استادوں اور شاگردوں میں
 ترقی پسند اثرات بہت واضح اور خایلی ہیں۔ اس دور میں ان کا ادبی تعداد قلمت بہت بلند ہو گیا ہے
 ان ادیبوں میں جو استاد نگار بھی ہیں اور ناول نگار بھی اور جن کا فن میرے دور ہی میں پھیلا ہوا
 ہے، ڈاکٹر آغا سہیل اور رضیہ صبح احمد بہت نمایاں ہیں۔ مزاح نگار کی حیثیت سے ابراہیم طہس
 دوسرے دور ہی میں مشہور ہو چکے تھے۔ میرے دور میں ان کے فن پر اور نکھار آیا۔ اس دور کے
 دوسرے معجز مزاح نگاروں میں احمد حلال پٹنا، یوسف ناظم، و ابراہیم طہس کے چھوٹے بھائی بھی
 حسین شامل ہیں۔ مزاح نگار کی حیثیت سے ابن الشاک صلا حیلوں کا استاد بھی اسی دور میں ہوا۔ اس
 میرے دور کے سب سے بڑے مزاح نگار مشفق احمد یوسفی ہیں جن کا شمار اردو کے عظیم ترین مزاح
 نگاروں میں ہوتا ہے۔ نقد و نظر کے شعبے میں گذشتہ دور کے جس نگاروں کو ہم سے جویر گروپ میں رکھا
 تھا ان کا اصل کام میرے دور میں سامنے آیا۔ ان کے اور سبیر گروپ کے نگاروں میں سے محسن
 گورکھپوری، سہا حسن، آل احمد مسعود اور دتہ عظیم کے علاوہ جو میرے دور میں بھی فعال رہے، اس
 دور کے معجز تنقید نگاروں میں ڈاکٹر قمر بیس، ڈاکٹر شارب، دلووی، ڈاکٹر محمد عقیل، ڈاکٹر صبح الدین،
 پروفسر سحر انصاری، ڈاکٹر علی احمد فاطمی، پروفسر محمد رضا کاظمی، ڈاکٹر محمد علی مدنی، پروفسر عتیق
 احمد، ڈاکٹر احرار نقوی، ڈاکٹر عنوان جمیل، ڈاکٹر آغا سہیل، ارباب مدنی، پروفسر نظیر مدنی، عزیز

عابد بن احمد بن عبد بنی، مفسر میں، مفسر کاظمی و غیرہ شامل ہیں اس دور میں سطح حسن کو جو خصوصی
 تیار حاصل ہے کہ سوں سے بنی صر کے آخری دس چار دہائی صرف علمی اور فکری کاموں کے لیے
 وقف کر دیا تاکہ بڑے بڑے حالات میں ترقی پسندوں کی تحریک کی علمی و فکری ماحول مستحکم ہو۔
 سے ترقی پسندوں کے سماجی شعور میں گہری تبدیلی ہو ۱۹۰۰ء میں پہلی بار میں سوچنے کے
 بجائے سکھانے اور اس میں سوچیں

جدید دور کے پھر سے دور میں ترقی پسندوں کے آپس کے اختلافات کا ذکر کر کے کے
 بعد عرض کیا تھا کہ آپس کے اختلافات اور فکری شکایت سے قطع نظر "میشر" ترقی پسندوں کی
 فکری سرگرمیوں کی سطح جاری رہی جو اسوں سے دوسرے دور میں اعتبار کی جاتی تھی "میشر" کا
 اس سے متعلق کیا تھا کہ آپس کی اس کشمکش کے نتیجے میں چند ترقی پسند ادیب اور شاعر ترقی
 پسند تحریک سے الگ ہو کر جدید محنت پسندوں سے جاملے تھے۔ پچھلے دور کی طرح اس دور میں بھی
 ترقی پسندی اور رجعت پسندی کی آپس میں دیکھ بھلے معمول کے مطابق جاری تھی۔ قدامت پرستوں کی
 مخالفت تو پچھلے دور ہی میں بہت گہری پڑی تھی اس دور میں بھی پچھلے دور سے تعلق رکھنے والے بہت
 سے جدیدیت کے رجعت شعار علمبرداروں کے ساتھ ہی دور میں مابین ہونے والے جدید رجعت
 پسند ترقی پسندوں سے کشمکش میں آئے آئے تھے۔ ان کی تباہی اور تباہی پچھلے دور میں بھی
 جدید رجعت پسندوں کا کارہا مستند تھا، پھر سے دور میں یہ مسئلہ اور کمزور ہو گیا تھا۔ رجعت شعار
 جدیدیت پسندوں کا کہا تھا کہ دینا کے مختلف حصوں میں آئے ہیں کی جنگوں اور ان کی تباہ کاریوں،
 ہو کہ، فلاں ایسے روگاری ایسے رجعت پسند، فوجی اور غیر فوجی، فوجی اور فوجی، فوجی اور فوجی،
 افراد، عدالت اور خواہشات کی آسویگی کے باعث نہ ہی کی تمام اقدامات سے انسان کا ایمان اٹھ چکا
 ہے اور اس خوف سے کہ حاکم کو سکھائے کہ وہی طاقت پسند تھیجے میں جاری دینا کو جھک سے ڈرا سکتی
 ہے اسے دہشت روا دیا ہے اس آئینہ دور میں وہ اپنے وجہ یاد دہک اور اکیلا پاتا ہے اور اس
 کے لیے اپنی ذات میں پناہ کے سوا اور کوئی چارہ نہیں دیکھا جاتا۔ یہ ہے ظلم و انصاف کسی اور پر محدود
 ہیں رہتا اس مسئلے میں ترقی پسندوں کے موقف کا اظہار علی سہ رجعتی کے اپنے سے باہر
 جدیدیت "حکومت" میں کے پنے شملے کی پیش کش میں اس طرح کیا تھا "ادب اور ادیب اس
 وقت آئینہ بھرائی دور سے گذر رہے ہیں عقیدے رچی ہیں اور جیسے دھوکا کی سس اسٹریکٹری
 کی سہ رجعتی نظروں کے سامنے آ رہی ہیں کے پھر سے سکھائے ہیں خواہوں کو قتل گاہوں سے

سے سماجی اور سیاسی افکار اس حد سے پیدا ہوتے ہیں غلامی کا احساس اور آزادی کی طرف پلانڈم اور وحدت کا احساس اس کے پورا کرے کی پہلی منزل ہے جب لوگ اپنے معاشرے میں جمیل دیکھتے ہیں تو اسے تبدیل کرے کی خواہش پیدا ہوتی ہے یہ فطری عمل ہے اس سے اگر ترقی کے خاطر اور بس اپنے معاشرے کو اس بات سے جس تو اس کا غم، بھیس ضرور کرنا چاہیے لیکن محض غم کا کافی ہے کچھ خاطر یا بس محض غم کے کافی ہوئے کو نظر انداز کر کے بڑے گھونڈے طریقے پر چل جائے رہے ہیں کہ ان سے کیا مطلب ادبیات میں جانے یا جسم میں دفن کر دیں گیں اپنے جذبات و احساسات سے کام ہے۔ بیس اس موصوعہ کا میلانی، بلوہل سے سامنے آتا ہے وہ اسی پر محو کرے سے کر رہ کرے کے لیے شعلی، انفرولت اور ذات کے کشاکش کی ٹی ٹی ٹی میں کی جاتی ہیں۔ میری کچھ میں سہی آتا کہ کس زمانے میں بس اپنی ذات کے غم کے لیے آواز میں رہا اور کب اسے اپنے معاشرے کے بھس جیشوں سے ورنہ ہوئے کا احساس نہیں ہوا اور اس احساس کو اس نے اپنی تحقیق میں ظاہر نہیں کیا اور کب اس کو خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہی اگر اس باتوں کا جواب ہے کہ اس احساس اور آج کے احساس میں فرق ہے تو میں کہوں گا کہ یہاں سونا لڈی وہ لٹری ہے اس سے کسے افکار ہو سکتا ہے جدیدی توندگی کا جدیدی قانون ہے اس سے معر میں۔ یقیناً ہذا معاشرہ سلطنت فیر آسودگی جس ہے۔ اس کا احساس صرف مہرب اور خاطر کو ہے لگہ ہر اس شخص کو ہے جس کے پاس احساس کی دولت ہے مگر اس بدعتییت کا محض اعشار یا دہرایا جانا کافی نہیں ہے اس کا بس سونا اور اسے حاصل کرے کی جدہ حد کرنا ہی ضروری ہے چاہے وہ عمل صرف وہی ہی نہیں ہے جو خاطر اور بس اپنی تعلق کے طور پر قبول سے لیں تو بھیس معلوم ہوگا کہ یہ احساس سماجی ہے اور تاریخ کے بہت سے عناصر اس معاشرے وند سے ہیں لگے ہوئے میں اسلانی تاریخ کے ہاتھ ہیں اور ہند سے خاطر اور بس محسوس کی میں تالی میں ان کے طریق فکر صہر لفظ میں۔

ایک اور جگہ پر دھیر حشام حسین لکھتے ہیں

”اس کی تعلق کا احساس اس کا موصوعہ رہا ہے اور ہمیشہ رہا ہے۔“

لیکن شاعرانہ ایک عقیدے کی حیثیت سے کبھی ہمیت اختیار نہیں کر سکتا۔ فردوسے
 نادوں اور انسانے کا موضوع ہوتا ہے لیکن چند تخلیقات کے علاوہ فکر یا اثر جگہ وہ اپنی
 حالت کو بہتر بنانے کے لیے اپنے ذہنی یا فنی ماحول پر فتح حاصل کر کے لیے
 جدوجہد کرتا ہو، پڑا ہوا ہے، چاہے اس میں اس کو شکست ہی کیوں نہ ہو۔ جو نوج
 ایک شاعر کی حیثیت سے حقیقت ہے، عمل و سعی، ہزار انسان پر روز دینے سے
 باور آتا ہے۔ انسانیت ان عناصر کو تخلیقیت سے پہلے ہی جو غیر مطمئن افراد کو جدوجہد سے باز
 رکھا کرتے ہیں اسے غصے پر دوڑ گنڈا کر دینے سے کام میں چل سکتا جو لوگ انسانیت
 ایسا کر رہے ہیں انھیں چاہیے کہ شعراء ادب کے سہم پر دے میں چھپ کر اپنے خیالات
 کی دھند بھیلانے کے بجائے دلائل کے ساتھ مطالعین لکھیں، جدید انسان کے ذہن
 میں جو گتھیاں پڑ گئی ہیں، انھیں سمجھیں اور سمجھائیں۔ اس سے ادب اور انسانیت دونوں
 کا بھلا ہوگا۔

حکمر ادب اور انسانیت کا بھلا چاہنے کا مقصد تو (رحمت شاعر) جدیدیت کے علمبرداروں
 کے پیش نظر کبھی رہا ہی نہیں رہا تو با معنی اور با مقصد ادب کی جگہ بے معنی اور بے مقصد ادب کو اور
 انسانیت پر اپنی ذات کو ہمیشہ فوقیت اور ترجیح دیتے آئے ہیں تو قی پسند جب انسان پر انسان کے
 استحصال کو حتم کرے کے لیے جدوجہد کی بات کرتے ہیں تو جدید رجعت پسند ان پر سیاست میں
 غوث ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔ حکم واقعہ یہ ہے کہ خود بہت سے جدیدیت پسندوں نے ان سیاسی
 طاقتوں کا آلہ کار بنادیاں وہاں سے قوتیں نکالیں جو سیاست کی بھلکی میں چاہتیں، صرف چند مخصوص
 طبقوں کے مفادات کا تحفظ اس طرح چاہتی ہیں کہ دنیا کی ساری دولت پر ان کی اجار داری قائم اور قرار
 رہے۔ جیسے وہ میں ابھرے اسے ممتاز ترقی پسند قادیان کا کٹر محمد علی صدیقی اس ضمن میں لکھتے ہیں:
 جدیدیت کے (دعوے) ادب اور زندگی کے خلاف ایک سوچی سمجھی بغاوت ہیں، اور ایک وسیع ترین بین
 الاقوامی کم کا حصہ ہیں جس کا صرف ایک ہی مقصد ہے کہ ترقی پزیر ممالک سے زندگی کا سارہ دھانس
 لٹا دیا جائے۔ تخلیقیت پسندی کے سارے راستے حتم کر دیے جائیں۔ مولا، نثر، سماج کو پیلوں کو ہار
 صحرے سے بھلا سنا جائے اور فرد کو ایک ایسی ذہنی حالت میں چھوڑ دیا جائے جو زندگی کی صورت سے
 دور لڑائیت کے لیے کراں دشت تنہائی میں لٹا اور معنی کے رشتے درہم برہم کر رہی ہو۔
 لڑائیت کے لیے کراں دشت تنہائی میں لٹا اور معنی کے رشتے درہم برہم کر رہی ہو۔

یوں تو عامیہ فرقے سے ملادی تھا جس کو شہ ۱۱۱۱ کے جدیدیت پسندوں کی حقیقت معافی و مفاہیم سے بالکل ملادی ہیں۔ جس میں اصل میں کاروں کے ہیں ۱۱۱۱، از کارہ حلاوتوں کی صبر اور امام کی شہت تھی، عند بحیرے ۱۱۱۱ میں جدیدیت کے بعض اہل پسند علمبرداروں نے معافی و مفاہیم سے قطعاً ملادی علم و اثر کے سولے پیش کر کے جس میں اپنی ہی حقیقت قرار دیا، اگر یہ اصل ملادی سوچ سمجھ رہی تھی ہے تو اس میں اتنا فانی علم کا حصہ ہے جس کا ذکر واکٹر عبد علی مدنی نے کیا ہے ۱۱۱۱۔ اس اصل کارہات کو اصل تو اس کے شدید تاریخی مفاہیم کا جاسکتا ہے جو شخصیں مرحل میں حسیاتی معالوں کے توحید کاہن، نکس، کیود، باغی سولہ و اس میں اصل ملادی حیدر شوار کاہن ہے امام قادری کے لیے نظموں کے گزرا تھا جس سے یہود ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ صورت حال اس وقت پیدا ہوئی جب رجعت پروری اور اہل پسندوں پر حق ان اپنی اپنی تحریکوں کے علاوہ حق کا ذکر گذشتہ دور کے حارے میں کیا جاپکا سے (ص ۴۴۴) مکتوم (تجدوت و حیرہ) تحقیق اور حیدر کے حوالوں سے مغرب کی ان اپنی تحریکوں سے بھی اردو کے جدیدیت رجعت پسند آشنا ہونے لگے جو مختلف سابقین صاحب فکر سے قطعاً مافک کے تحت و خود میں آئی تھیں یعنی ماضیت، مابعد ماضیت، مظهریت، مقصودیت، و تحقیق، مقرریت، ماضیت، تجویز مظهریت وغیرہ۔ ان سب اپنی نظریات کے برگزیدہ رجسٹروں میں سے، انھیں بعد اسے رجعت شدہ جدیدیت پسند اپنا پروردگار تصور کر کے لگے ہیں، دوچار کے حالات آپ کی، انہیں کے لیے یہاں پیش کیے جاتے ہیں ماضیاتی سلیات کے اولین منکر ماسر کے روئے ہاں حقیقت کی ترجمان میں رہتی ہند، ان کی ماضیت حقیقت کو بیدار کرتی ہے اس کا مطلب یہ ہو کہ اصل کارہ منکر مصطفیٰ کا تحریر نہیں شدہ اصول و مواہج میں جس کے تحت رہاں اصل پر رہتی ہے، انہوں مظهریت کے علمبردار بیڈنگر کا کہنا ہے کہ رہاں حقیقت کا دار اک میں کرتی، خدا رہاں خود حقیقت ہے جو پدا اور اک آپ کر رہی ہے سلیات کا ایک سر اور اور منکر دونوں ہارت، ان نصیحت والوں کو جو مقصد وہ تحقیق کرتے ہیں منکر کا نام دیتا ہے اور ان کو کون کو مصطفیٰ اور تحقیق کا کہنا ہے جو اب و مقصود ہدایت کہتے ہیں اس کے بدل میں اب کو اس لیے پسند کیا جاتا ہے کہ اب خود رہاں کے اصل پر روشنی دیتا ہے، اس لیے پسند نہیں کیا جاتا کہ اب ہمیں معاشرے کے بارے میں کچھ بتاتا ہے، انہوں ہارت کا جو قول بہت مشہور ہو رہا ہے کہ تحریر لکھتی ہے کہ مصطفیٰ یعنی مصطفیٰ خود میں لکھتا تصنیف اپنے آپ کو اس سے لکھواتی ہے، مشہور امر کی عامرو ان آکٹوپولہ بے ۱۹۹۱ میں اب کا اصل ہار ملا تھا، کہتا ہے کہ علم کا پامصطفیٰ

شاعر ہوتا ہے اور نہ فکری بلکہ غور رہا ہوتی ہے شاعر اور فکری دونوں رہبان کے وجودی لمحے ہیں۔ زبان اس کے ذریعے کام کرتی ہے خیال کی بازی گرتی اور فطرتی شعبدہ بازی کے ان چند نمونوں کے بعد خاص وجودی منکر کے دو اقوال بھی سننے چاہیے۔ سارتر کا کہنا ہے کہ سوائے انسانی ذاتیت کی شکلات کے اور کوئی شکلات موجود نہیں ہے اور کیر کے گارڈ نے کہا تھا کہ چاکا کا سر انعام انسانیت (انسانیت) ہے آپ اندر دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس افکار کے برائے جواب تھیں کیا جاہ گاہ کیسی کیسی مضحکہ خیزوں اور براہمنوں کا مظہر ہوگا۔ جدیدیت کے اختراستہ علم بردار تو میر نے لی ٹالکاردن میں سنی وسطی کا شخصیت پاتے ہی نہیں ان جدیدیت پسندوں کی تھنیتات میں بھی۔ صمیمی اگلی ترسیل و اطلاع کا حقہ ماپاں باقی رہ گیا ہے خیالات کے، لہجہ، تصور (Conceptions) کی تولید کی اور افکار کے کورنگ و حد سے کے علاوہ کچھ نہیں ملتا عربستان، اعلیت، خود پرستانہ افراہیت اور سماجی طائف سے انسانی جدیدیت پسند ادب کی خصوصیت حاضر ہیں۔ شہد اسلام اور فصل فکری اس پر مستزاد ہیں ایسا ادب ظاہر ہے، قیوں عالم کی سند حاصل میں کر سکتا ہے فکری کے ذہن کو نصرت عطا کرنے اور حالیاتی آسویں کھٹنے کے بجائے ذہنی تھنیتا کرنا ہے۔ لہذا احمد جدید کے ہمسرے دور میں جو دوسرے دور کے ساتھ ہمارا اپنا زمانہ ہے، ترقی پسند تحریک کی اگرچہ کوئی عظیم باقی نہیں رہی اور عالمی ادب علاقائی سطحوں پر تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے خاطر میں تحریک کو بہت سے اندر یعنی اور یعنی بیٹلجیوں کا رہنا کرنا پڑا، لیکن وہ تمام آراء انکوں پر پوری اترتی رہی، بلکہ جدیدیت پسندی کا دائرہ محدود رہا اور اس کے تاریک مستقبل کی نشاندہی ہوتی رہی

ترقی پسند ادب کی تحریک دوسرے دور ہی میں اٹھی و مست اور انتظام حاصل کر چکی تھی کہ ہمسرے دور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے عاتق سے تحریک ختم میں ہوئی اس کے مصداق انسانی اور اہمیت ان تمام ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور عام قاریوں کے دلوں میں جاگزیں ہو گئی جو کمر سماجی شعور رکھتے ہیں اور سماجی مسائل کو عظمت پسندی کی روشنی میں دیکھتے، پرکھتے اور انھیں حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پہلے دور کی طرح اس دور میں بھی بعض جدیدیت پسندوں نے لاشعوری طور پر ترقی پسند ادب کی تحریک کے، اثرات قبول کیے ہیں تحریک کے تصور سے کاسب سے بڑے قوت و دشمن ہائے دور میں ہیں جو ۸۹ء ۱۹۸۵ء میں تحریک کے، پچاس سال پورے ہو جانے پر لندن، کراچی، لکھنؤ، دہلی اور لاہور میں ملے گئے۔ ان کو لندن جوبلی تقریبات نے ترقی پسندوں کے لیے ایک طرح سے ریفریشر کورس کا کام کیا۔ بعض ترقی پسند سطحوں میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے

[illegible][illegible]

ہے جو اپنے انحصاری سلطنت کے تحفظ کی خاطر خصوصیت کے ساتھ عیسوی دنیا اور سابق سوویت یونین کے گزشتہ گزشتہ جو جانے کے بعد وہاں کی نام ملاو آواز دیا جوں میں سسلی، قوی، مسلانی اور مذہبی معصوموں کو جو دے کر نئی سلطنت کے شرع کے لیے راہرو کر رہے ہیں یہ تشویش ناک صورت ملے جیسا کہ اس مضمون کے شرع میں عرض کیا گیا تھا عیسوی دنیا سے جس میں اب سابق سوویت یونین کی نام ملاو آواز دیا سسلی بھی شامل ہیں اور سرمایہ دار ممالک کے محنت کشوں اور برہمنوں کی عظیم اکثریت سے ایک طویل اور عظیم مدد کا مطالبہ کر رہی ہے اور اس مدد میں ہمیں ہر حصہ لینے اور سے کامیاب کرے گئے لیے ترقی پسند دانشوروں، دانشوروں، دانشوروں اور من گھڑی کو بھی لاکھ مل مرتب کرنا ہے۔ انہیں دوست اور انقلابی دور ترقی پسند افکار کی زیادہ سے زیادہ ترویج و اشاعت وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ عاشور کاظمی نے اس سلسلے میں جو اہمیل کی ہے اس پر ہم سب کو فوری توجہ دینی چاہیے۔

وہ مرے پاس سے گزرتے تیرے معلوم ہوا
زندگی یوں بھی بے پاؤں گزر جاتی ہے

شارب لکھنوی
ہمد عاقل کی ایک خوبصورت آواز
ہم ہی حقیقت کے آسترنے پر شعلہ زن ہے
مجموعہ ۱۷۷ کلام

مِیْخَانَةُ شَارِبْ

فردوسِ نظر

بندیدہ: ارتقاء مطبوعات

SUZUKI BOLAN



BOLAN's Hi-Roof Advantage

The new SUZUKI Bolan gives you everything you've wanted in a van. The open side curtains let sunlight, the tough engine let cargo and loads in — the new 51 HP 3. Bolan was designed for space, space a plenty of room for passengers to enjoy a comfortable ride long mile or for a large cargo and A Bol, you load and the body frame design let you back to the ceiling easily without straining your back to the side doors, plenty of space for passengers to sleep. The new side door can be folded for extra space for extra cargo.



For more information, contact your Suzuki dealer.

PIAT SUZUKI MOTORS CO. LTD.

Head Office
10, PIAO STREET, PIAO, Kanto
P.O. Box 100, PIAO, Kanto
P.O. Box 100, PIAO, Kanto
P.O. Box 100, PIAO, Kanto
P.O. Box 100, PIAO, Kanto

London Office
10, PIAO STREET, PIAO, Kanto
P.O. Box 100, PIAO, Kanto

بیاد آوری احتشام حسین

حسین المہم

جوش کا مدح ، مدح اذیلتوں جہاں
 حرمِ آمیز و نکس سخن کا پہاں
 حرم ہوا ربطِ معنی و قضا و بیاں
 راقم اثر مدلل، ظاہر شیریں رہاں
 نکس و آمیز ہے جس خفا من کی یادگار
 ہے اسی کے نوکِ عامر سے نظر کا حجاب
 خد کی دنیا میں جس نے طرز نو ایجاد کی
 کی ہی تعبیر فکرِ دہشِ اجداد کی
 قصرِ من کی اور محکم اس طرح بنیاد کی
 حتیٰ جو رہاں وہ ادب کی سر ریں آباد کی
 سنگِ نظروں کو یا لہجہ عطا جس نے کیا
 مہِ زمانہ مسجدِ فن کو عدا جس نے کیا
 شامِ فن کو ملکِ برک و شر جس نے کیا
 بحر کی کوئیل کو ہر آوازِ شجر جس نے کیا
 زلف کو ہم رجبہِ لعل و گہر جس نے کیا
 لہجہِ فن کو لائقِ شمس و لہر جس نے کیا
 دے کے دستِ کود کے دوس کو دامن کر دیا
 شطہ ، سجدہِ خودِ فن پہ روشن کر دیا
 فکر کے دہان میں ہے جن سے مدالی آج بھی

جس کی حرروں میں ہے ملک جمالی آج بھی
 جسکی ملک تھ ہے عکس کی آج بھی
 دوسوں سے جس کی جتنے ہیں کمال آج بھی
 سحر ہے ہم دہ رونا ہے اس کی یاد میں
 ایک مدت سے ہے جو ملک عدم آباد میں
 ارتقاء والوں کے صوم نے مہلا کو مقام
 کینتہ کی ملک ملی ہے اتنا احترام
 دیکھے ہے قدوسی من کا کھانا انتظام
 اس ملک میں کا ہے متحد صورت یا اعتظام
 = خطا اس کی ہیں رسم سخن کی یاد ہے
 مو واحد کی نہیں اک انجمن کی یاد ہے
 نظام اے علم و حکمت کے مدارے نظام
 نظام اے عرش و صفت کے مدارے نظام
 نظام اے قوس و جوت کے مدارے نظام
 نظام اے ابر و قند من کے مدارے نظام
 نظام اے گھر و در و کے مدارے نظام
 نظام اے حد و پیش کی مدارے نظام

ہر صفت کے گھر را مری میں را شبہ
 کائنات کے گھر را مری میں را خود
 اشیا کے گھر را مری میں را خود
 قند را پروردگار تر را دیکھے

ما تم یک شهر آرزو

قمریاشی

ظہر مئی میں لکیریں

قلم کے رکے سے

بکھر گئی ہے سیاہی

دردِ اٹنے سے

فطری کہ ماتمِ شہرِ علوم ہر جا ہے

تمام جہد و فکر کی ہیں غلطیوں

وہ مدرسے کی عمارت

وہ اس کا سلیہ بھی

خود ایک مدرسہ فکرِ احتشامِ حسین

وہ مدرسے کی فراست

وہ مدرسے کا حلال

وہ اس کا ذوقِ نمونے

وہ اس کا مس وصال

طولِ حیات و عہدِ حق میں نہیں ہیں آج

وہ کیلئے وہ مدرسہ اس

وہ درگا میں بھی

جس انہوں نے پرستھا تھا

جہاں پرستایا تھا

جہاں جہاں بھی دیانتِ فانی کی ساجہ تھا

سچ میں اللہ تعالیٰ کے

جن میں وہ یاد

وہ سارے، فکرِ جہاں کا حق میں شعلہ بند

سیاہ پوش ہیں حلقہٴ تجوشِ مسیحا

احتشام صاحب کی یاد میں

شاہد علی نقوی

مجھ سے فرمائش کسی نے کی ہے ، تم بھی کچھ لکھو
 تم سے بھی تھا کچھ تعلق اپنی ہی جیسی کو
 مشترک فلم کے جلو میں ، چند ساعت ہی رہو
 تم بھی اس سیل ام میں چند لمحے ہی سو
 یہ قاعدائے محنت بھی ہے اور لغزت بھی ہے
 انتھائے شرف السہل کی یہ نصبت بھی ہے

اہل دانش لکھ رہے ہیں اس کے احوال و مسائل
 ارٹھائے فکر کی زد میں تھے جس کے بار و سال
 جس کا تھقی ہفتہ ، فن کا اعجاز و اسرار
 جس کا تنقیدی سمتر آپ تھا اپنی مثال
 ارٹھاء کی لوتوں پر فکر جس کی چھائی
 صبح و کی ہر علامت جس کے دل کو سما گئی

جس کا اسلوب مذاقت رفعت فن کا امین
 جس کی ہر محرم میں خود متادی کا یقین
 کائنات شعر میں جو عاشق گوشت نشین
 جس کی ہر خام و سر تھی روشنیوں کی دین
 دم کردہ میں ، جو خوش قزاق ہر جا
 جو صلت قلم کا ہم سفر ، ہم روز تھا

سفر نامہ نگار سید احتشام حسین

نائب رزی

جب ہم سید احتشام حسین کا نام بیٹے میں تو ایک سمجھ بوجھ شخصیت کا تصور نکلوں گے
 سامنے اٹھتا ہے جس میں ادبی اور علمی طبقات کے علاوہ ہمیں علوم، انسان و حق، جمہوری رجحان اور
 دوا دہی کی لہریاں جھلک بھی ملتی ہے۔ احتشام حسین صاحب برصغیر کے عظیم "قی پسنہ نگار"، دانشور
 تھے جن کی تنقیدی ڈرافٹ نگاری سے ترقی پسند ادبی تحریک کی سرچرور رہنمائی کی لیکن وہ صرف نقاد ہی نہ
 تھے بلکہ ان کی شخصیت کلی، ہم جنوں کی حامل ہے۔ سماں ہم بحیثیت سفر نامہ نگار جناب احتشام حسین
 کے سفر نامہ "ماصل اور سمندر" کا منظر حارہ پیش کریں گے کیونکہ صاحب فکر و تحلیل سیاست ہی
 وسیع حلقوں پر پھیلی ہوئی زندگی کے حقائق کے بیان سے قاریوں کے ذہن میں نئی سرچوں کو نمودار
 کرتا ہے۔

جناب احتشام حسین نے ۱۹۵۳ء کے آخر میں امریکہ اور انگلستان کا سفر اختیار کیا۔ ان
 دنوں ادب ادب میں ابھی سفر نامہ لکھنے کا زمانہ پایہ میں ہو تھا۔ کیونکہ انگریزی ادب کی یہ صنف ابھی

اردو ادب میں ترویج۔ ہانکی تھی اپنے سفرنامہ ”ماصل اور مصدر“ کے آغاز میں ”گزارش“ کے عنوان کے تحت اسوں سے جس میلات کا اظہار کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سیاحت کے مشاہدات کو قلمبند کر کے مضمرات سے پوری طرف وقف تھے چنانچہ وہ لکھتے ہیں

”ماصل اور مصدر میر مرید اور انگلستان کے سفر سے متعلق چند بے ربط تاثرات اور میلات کا مجموعہ ہے اور اس کو اسی نظر سے پرصحا پائے تو اب مجھے اس کی ماحسوس کا احساس ہے تاہم اسے پیش کرنے ہوئے اس بات کی خوشی محسوس ہے کہ اس کا تعلق ادب کی اس صنف سے ہے جس کی مدد میں میں کہی ہے اس کا یہ مطلب یہیں ہے کہ اس کی شاعت سے وہ کی پوری ہو جائے گی مگر یہاں یہ شاید اسے دیکھ کر دوسرے ادیب اس معیار، لطیف اور دلچسپ صنف ادب کی جانب متوجہ ہوں اور اس سے بہتر کارنامے وجود میں آئیں۔“

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سید احتشام حسین اردو ادب میں سفرنامہ نگاری کے آغاز کار ہیں کتاب کے پہلے باب ”کنکشن اور کھجوتہ“ میں اسوں سے اس کنکشن کو بیان کیا ہے جو امریکہ کا سفر اختیار کر کے متعلق اس کے ذہن میں جاری تھی میں کچھ دشواری اور غلط فہمیاں نظر آتے تھے کیونکہ وہ کبھی جدا سہل سے باہر کے تھے

مست روزگار کے بعد احتشام صاحب دوسرے دن ٹرانس ہوئی میں مسٹرنگی بیکٹرک سے ملے وہ اپنی اس ملاقات کا حال یوں لکھتے ہیں

کوئی دو گھنٹے کی گفتگو کے بعد اسوں نے کہا ”آپ چودہ اور امریکہ آجوں میں ہو آئے“ میں نے کہا ”شور میں“ ”انہی کھڑے ہوئے اور کمرے کے بعد سے ایک کام را کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا اس کے ساتھ یہ دھن رگھو کی فکر تھی کہ اسے مطالعہ کی انیم محسوس کر چکا ہے مجھے گا میں نوکل چلا جاؤں گا چارپانچ دن دہلی میں رہوں گا اور پھر امریکہ“

”میں نے دہلی کا پتہ پوچھا اور چلا آیا میرے قدم بھاری اٹھ رہے تھے۔“

صند پر ریوا حور کیے میر میں ضرورت سے ریوا حور ہو گیا۔ میر میں نے مسٹرنگی بیکٹرک کو اس کے پتے پر حاکم کیا۔ میں اتنا ہم بعد اسے سے پہلے وہاں میں جاتا چاہتا ہوں۔ پہلی جہ کہ اس لیوسٹ کے ساتھ کچھ شرط تو وابستہ میں ہیں؟ دوسرے یہ کہ میرے کام کی واقعی اہمیت کیا ہوگی؟

اور اصل اشتہام حسین صاحب کے اس مادے شدید کے پس منظر میں اس کا یہ اندیشہ
 بظاہر تھا کہ کہیں اس مادی ترقی کی جا رہی ہے ترقی پسند نقطہ نظر سے ہٹ کر بات نہ کرنا
 پڑے کیونکہ وہ اپنے آدرش کو بہت عزیز سمجھتے تھے اور اسے کسی حالت میں زندگی کی بڑی سے بڑی
 ترقی پر بھی قربان نہیں کرنا چاہتے تھے کئی روایت اور عظمت تھی سید اشتہام حسین کی شخصیت
 میں ۱

بمحرورہ لکھتے ہیں

"کچھ دنوں کے بعد راک فیئر فاؤنڈیشن کے منگورہ آفس سے ایک خط اور
 طبی معائنے کا ایک فارم آیا کہ لکھنؤ میڈیکل کالج سے اس کی جانچ پڑی کر کے معائنہ
 کے ایکس رے وغیرہ کے منگورہ منگوارہ جے میں نے یہ فارم اور رپورٹ کی درخواست
 کا فارم ایک طرف ڈال دیا اور سے بھلائے کی کوشش کی کیونکہ میرے ضمیر میں ایک
 جنگ جاری تھی لیکن وہ یہی تھی کہ اس طرح آج سے بھلائی جاتی ہے جنگ کیا تھی؟"
 "جو ایک اور نازک سوئیاں میرے ضمیر میں چھو رہی تھیں شاید میں
 ان کا واضح تذکرہ نہ کر سکوں۔ لیکن بعض سوئی موٹی یا میں ضرور بیان کر سکتا ہوں۔ اس کا
 تجربہ کرنا بھی میرے لیے آسان نہیں ہے کہ میری انجمن کس قدر نفسیاتی تھی اور کس
 تعداد اتھارٹی یا حقیقی تھی بہر حال وہ کچھ ایسی تھی کہ اب بھی جب میں سڑ میں ہوں
 میرے لیے یہ ایک فوج کی طرح رکھی ہوئی ہے اور نگرانی کی طرح مت سے جان ملی جلی
 جاری ہے۔"

"اور کئی سال سے میں جس قسم کی ادنیٰ قدری زندگی سے وابستہ رہا ہوں وہ
 میرے معائین اور کتابوں کا مطالعہ کرنے والوں سے چھپی ہوئی ہیں ہے اپنے طور پر
 میں نے قصہ اور سوچ کچھ کر اس رہ کو قبول کیا ہے اپنے خیال میں اس منزل سے
 بھی گزر چکا ہوں جب محض جذباتی انداز یا تقریباً کسی کتہ نگاہ کو قبول کر رہا جاتا ہے میں
 نے اس کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کا واقف و آقا قرار دیا ہے شاید ہی وجہ سے میں
 نقطہ نظر میں اس انتخاب پسندی کا شکار میں ہو، ہوں جو کسی اصول یا راستے کو جدائی یا
 میا کی طور پر تسلیم کر لینے سے وجود میں آتی ہے اس نقطہ نظر سے مجھے سکنا ہے کہ
 اس وقت انسانیت کی سب سے بڑی دشمن دو طاقتیں ہیں جو سامراج اور سرمایہ داری کے

گلیں " میں مسلسل افس سے باہر سفر کرنے کے حادثات میں گھرا ہوا ہوتا ہے میں مختلف اندیشے میں پریشان کے دوسرے ہیں کبھی سیں بھری کچیل ستا ہے اور کبھی وہ سوچتے ہیں " میں امریکہ اور یورپ جاتو رہا ہوں مگر کس حیثیت سے؟ کیا میں بیرونی ممالک میں ہندوؤں کی کسی جماعت کی ایک گروہ کی سادگی کا حق رکھتا ہوں؟ سیں کیا میں رد ادب کا سفیر ہوں؟ سیں کیا ہندوستان کی خدمت کا ترجمان ہوں؟ سیں " " پھر میری حیثیت کیا ہے؟ ایک طالب علم کی؟ اپنے علم اور تجربہ کو وسعت دینے، ایک خاموش قاضی کی طرح دوسری صدیوں کا مطالعہ کرنے اور اسے سمجھنے کی کوشش کرنے اور اس حد تک ممکن ہو انصاف پسند۔ طور پر دوسری قوموں اور لوگوں کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لیے جارہا ہے اسے یہ یقین سیں ہے کہ دوست کچھ سیکھے گا سے یہ دعویٰ سیں ہے کہ دوست چچی جی اے قائم کرے گا سے یہ غلط فہمی سیں ہے کہ وہ امریکہ یا انگلستان میں ہندوستان کا پیہ مند کرے گا وہ جدت پر قابو رکھ کر انصاف پسند۔ حقائق کا مطالعہ کرے گا اور اگر وہاں کچھ سیکھے گا تو سچے پاس چھپا کر سیں رکھے گا بلکہ اس میں اپنے ملک کو بھی شریک کرے گا مگر ابھی تو دیکھنا ہے کہ وہ اپنی دس میں جا کر کیا کھوتا اور کیا حاصل کرتا ہے اور اس کی تلامذہ اس سے کیا مطالبہ کرتے ہیں "۔

بالآخر وہ سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ حود پر ناکام رہا ہے اور وہ اپنے سفر میں موصولہ پر ملازمتی دورے لاکھوں لاکھوں کا اظہار کرتے ہیں

اب کتاب کا حیرت انگیز باب " سفر کے اظہار وں " شروع ہوتا ہے اور ہم احتشام حسین صاحب کو لکھنؤ سے ممبئی تک اور ممبئی سے حیدرآباد تک سفر کرنے ہوتے دیکھتے ہیں وہ لکھنؤ سے ممبئی میں چلنے سے لے کر حیدرآباد اور انگلستان کے سفر کے دوران میں اپنی ذاتی لکھنے رہتے ہیں اور سفر کے اختتام تک اسے باقاعدگی کے ساتھ جاری رکھتے ہیں چنانچہ پہلے وہ سفر کے اظہار وں کا حال لکھتے ہیں اور پھر شمالی امریکہ اور انگلستان میں اپنی مصروفیات کو اپنی زندگی کی شکل میں قلمبند کرتے ہیں

احتشام حسین صاحب کے مشہدات سفر کے آغاز سے لے کر اختتام تک دلچسپ بھی ہیں اور شعور انگیز بھی سفر کے اظہار وں کی ذاتی کے چند اقتضات ملاحظہ ہوں

”یوں تو محمد مراد علی حس کے بنے کی جہہ مدد جلدی ہے عیدر آپ میں
 د مل ہوتے ہی شہر سوچا ہے لیکن سوچہ مد اس میں بجواز ایک اہم تنگدو شر ہے
 سمجھ سورے ایک جھوٹے سے اسٹیشن سے ”اسٹا میں اسٹا میں“ کی ڈاریں ملتی
 دیں آکھ لی کر دیکھ تو لاندی پڑی تھیں اور ایک دس کیر دسل کا لڑکا اسٹا میں کی
 سوانح صریح پڑھا تھا تو یہ وہ آئے دوسوں کو دہا تھا کہ چلتا ہے۔

سلی سے جہدات تک دوسوں سے انگشتیں تک اور دھر لکھنوا میں آئے تک احتیام
 صاحب سے اپنی داری، قادی کی کے ساتھ لکھی ہے جس اظہار پر دسترس کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے
 تفصیل میں اقتدار کو طوطا رکھا ہے اور احتیام میں سوانح تفصیل کو سوزا ہے اور اپنی اس مختصر ڈاری
 میں پے سطر کے تمام اہم پسوں کو بیان کیا ہے جس میں حسن طہرت کی عکاسی، مختلف مقامات کا
 مسکن اور اس مقامات سے وابستہ کئی شخصیات کا ذکر اور کئی اہم مسائل پر اظہار حیل
 موجود ہے

میں نے سلی کے حسن کو بیان کیا ہے لیکن وہ لاکھوں اسالوں کی مدد حالی کو نہیں

بھولے

”سلی جہدات کا دست مل کا سا پائش شر ہے یہاں ہر جگہ کے ہوگ
 ہیں یہاں کسی کو نہ جانتے ہوئے بھی کوئی اجنبی سیں جہدات منزلہ عمل میں لاکھوں
 کی تعداد میں موثریں، سیں، کروڑوں قابل رکھے والی دلائیں، خوبصورت تصویرات،
 بوٹس، اسٹار ان، جیک، آؤسوں کی ریل میل کوئی شخص نہ تو غافل رہ سکتا ہے اور
 کھوپڑیا، یہاں زندگی عمل کا نام ہے، اور مدت ہے کہ مدت کی اس فراوانی کے باوجود
 یہاں لاکھوں انسان بھوکے، تنگے اور بے گھر میں پڑھے لکھے بیکار ہیں اور کام کے شائق
 یہاں ہے جیسے ہیں اس شہر میں قصبہ کی وہ مددی رہتیں نہ جنھیں انکھ میں جو دنیا
 کے کسی بڑے شہر میں پائی جاسکتی ہیں“

”داخل جانب پہلا اور دائیں بائیں جانب بکیرہ دوم اسی جگہ
 بائیں جانب کپیری کا حریر ہے حال شدہ حقوق مابین والی مصراہ بھی دد پیش دے
 رہے ہیں۔“

”دوم میں جہدات رہا تھا تو سر پکرا رہا تھا میں نے اوپر اوپر دیکھے

کی حد کر دی ہے۔ چٹکاو ہوں۔ پھر بھی باہر دیکھتے جا رہا ہوں لی الحال لکھنے میں جی نہیں لگ رہا ہے۔ جہادی میزبان کافی لاد رہی ہے۔ چٹکتی نہیں کیا محض نواز کے لیے روڑ رہی ہے یا اس میں قدم ت کا چدہ بھی کسی گمراہ رہے؟ مجھے دوسری بات کا تاہم بھی لکھ کر رہا ہے۔"

احشام صاحب کا طرز اسلوب باہموم منکرانہ ہوتا ہے کسی جگہ کی منظر کشی کا موقع ہوتا ہے فلسفیانہ نکات بیان کرتے چلے جاتے ہیں

"سورج کی تیز روشنی میں کوہ، پس کا حلال و حلال خیرہ کن اور بوش رہا ہے اگر اس کی یہ عظمت ہے تو ہماری کیا ہوگی! ہمیں پر رت سلید رنگ کے چمکدار پاؤں کی طرح بھیجی ہوئی ہے۔ اس کی چوٹیوں کے نقیب و نواز دیکھ کر صاحب کے جوہر تلخ کسہ کی یاد آتی ہے اور یہ طہ و بالالوٹ بالک پورپ کا سب سے اونچا ساڑ بادل اس کی گود میں سوئے ہوئے ہیں اور حضرت انسان نے اس کی دایوں میں بھی گھر بنائے ہیں جہاز تو اُس سے گر جاتا ہے۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں چین کی فوجوں نے اسے کس طرح پار کیا ہوگا؟ مگر انسان کے لیے کچھ مشکل نہیں"

اب سید احشام حسین امریکہ پہنچ چکے ہیں۔ اس لیے انہوں نے کتاب کے جو حصے اب کو "نیا دنیا" کا عنوان دیا ہے۔ اصل میں وہ وسط ستمبر ۱۹۹۱ء سے لے کر مارچ ۱۹۹۲ء تک امریکہ میں رہے۔ یہ زمانہ امریکہ کی تاریخ میں بڑا اہم زمانہ تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ ایک ہیرو دوم سامراجی طاقت کی حیثیت سے دنیا کے افریقہ پر امریکا تھا اور صدر روز ویٹ کی وفات کے بعد صدر ٹرومین نے کیمروم کے خلاف کئی حملہ کھول رکھے تھے اور مارشل پائل کے تحت امریکی سامراج پھیری دنیا کے تمام آزاد ملکوں کی معیشت اور سیاست پر تسلط جاری تھا ان کیمروم دشمن ممالکوں میں بھری کھلا اہم ترین تھا۔ امریکی سامراج پھیری دنیا کے طاقتور، ادیبوں، سماجیوں اور دانشوروں کو ترقی پسند نقطہ نظر سے الگ دیکھنے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔ اس لیے احشام حسین صاحب کا سفر امریکہ ایک امتحان سے کم نہ تھا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی بھری دیانت نے کسی موقع پر بھی ان کی نظریاتی شخصیت کا ساتھ نہ چھوڑا۔ انہوں نے ہر حالت میں ترقی پسند نقطہ نظر کا دامن تھامے رکھا اور نئی دنیا پر اپنی بے لاک تہجد سے خود کو ایک بے باک ترقی پسند لٹرا کی حیثیت سے منوایا

احشام حسین صاحب نے امریکہ میں جو کچھ دیکھا ہے اسے ایک ترقی پسند منکر کی

حقیقت سے پر تھا ہے اور اس کے احکام ہمیں ملوں کو پڑی رہی میں جلد دی ہے ان کی دراصلت کا یہ عالم ہے کہ امریکہ کی جدید سماجی زندگی میں دشواریاں دیکھ کر وہ کسی موقع پر بھی اپنے نقطہ نظر کی اہمیت میں سمجھتے ہیں۔ حال ہی صورت محسوس ہوتی ہے۔ سوں سے کسی جھگڑا اور مصیبت کے بغیر جھگڑائی جارہے ہے کام کیا ہے۔ اسی طرح انہوں نے اپنی فکر شخصیت کو اپنے مشاہدے کے دائرے سے باہر نہیں رکھا ہے۔ وہ اپنی ذہنی قیاس کے طریق کار کے متعلق خود لکھتے ہیں

"میرے ذہن کا جو تصور ہے ان طرح میں فکر رہا ہوں کیونکہ طریقہ ہمیں اسے اپنی پیروی کا محور بنانا چاہتا ہوں میرے ذہن میں جو کچھ ہے اس کے ساتھ ساتھ میں جانا چاہتا ہوں۔ یہ بھی میں چاہتا ہوں۔ میں خود اس میں سے غائب ہو جاؤں۔ یہ طریقہ اس کی سمجھنے کے ماتحت لکھی جارہی ہیں۔"

حشتم سب سے اپنی تہذیب کے اس باب میں امریکہ کی جدید سماجی زندگی کی وسعت اور عظمت کو بڑے بڑے انداز کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ مختصر کیا ہے جس میں وہ بڑے ترقی پسند متحدہ کی نکتہ نظر کا اظہار بھی کر رہے جاری رکھتے ہیں۔ ہم اس کی کتاب کے اس باب سے اہم، فکر انگیز اور دلچسپ اقتباسات دے رہے ہیں جن کے ساتھ ان کا تنقیدی جائزہ لایفک طور پر سامنے رہا ہے۔

"اب کیرولین کے قریب ہوئے تو میں گل بیٹرک سے ملے گیا اور تک حدود متلی ادب اور ہندوستانی ادبوں کی تعلیم کے متعلق باہم باتیں ہوئیں۔ آج کچھ مسائل واضح ہوئے ہیں کہ مجھے اس نقطہ نظر سے مسائل کو دیکھنا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ محسوس علیحدت کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ وہاں سے وہاں تک فاکٹریزیشن والے انگلیش کے بے ہودہ ادبوں اور شاعروں کو یہ منظم پروجیکٹ کے درمیان ہمیں ہزاروں اردے پکے ہیں۔ ان میں کوئی مشورہ ایک میں ہے۔ میرے خیال میں یہ وہی قسم کے اس میں جو دوسرے اور طبعی صورت میں لیکن اپنی ہی اطراف میں دیا کے ترانوں میں۔ مجھے یہ دیکھنا ہے کہ امریکی ادب اور دانشور جو ہندوستان کی زندگی اور ادب میں اتنی دلچسپی لے رہے ہیں۔ اس کی حقیقت کیا ہے۔ مصر و ترکی کے اس دور و زمانہ سے بھی ایسے ہی کام کرے والے ہوئے ہیں۔"

"یہ بات خاص طور پر حور کرے کی ہے کہ ہندوستانی فلسفہ کا اتنا گہرا اثر جو انگریز اور امریکی مصنفوں پر ہے اس کا اصل سبب کیا ہے۔ عام طور پر جو لوگ دھرم

کی طرف لوگ مڑے ہوئے ہیں کیا؟ سرمایہ داری صوبہ کے روال کی نشانی ہے؟
اس دور کا انسان ہادی آسودگی سے کھبرا کر روحانی آسودگی کی تلاش میں ہے؟

”پہلے بھی دیکھ چکا ہوں آج بھی احادیث میں نہ کھانک مرید کا ایف بی۔
اگلی کئی نسلیں کے شمار میں مصروف ہے آج میں کچھ لوگ پکڑے گئے کئی دہائیوں
سے کوئی اصلاح نہیں ہوتا آج کئی کاسوں میں بے خبر ہے کہ پیارک کے مختلف کاموں
اور پونہر شیوں میں ان کی تلاش جاری رہی بہت سے بینے میں پکڑے گئے سوال جواب
ہوئے کچھ چھوٹے کچھ کرتار ہوئے بعضوں پر جہ الزام ہے کہ وہ علماء سے ایسی سبکیں
پڑھنے کو کہتے ہیں جو اظہار تعلیم دیتی ہیں“

”اس دفعہ تو زیادہ تر سوالات سرژین ہی نے پوچھے ہیں نے ان کے
پمفلٹ کے کچھ حصے دیکھ ڈالے وہ چھے خاصے روزادارانہ انداز میں امریکہ کے متعلق
دوسرے ملکوں کے رد عمل پر نگاہ ڈالتی ہیں لیکن موجودہ حاکم طبقہ کے اس جرم کو نظر
انداز کرتی ہیں کہ وہ امریکہ کی سرمایہ داری کے تحفظ کے لیے ایسوں ڈالر خرچ کر کے دنیا کو
جنگ کی بجلی میں جھونکا چاہتا ہے“

”چند دن ہوئے کہ قمر کو میسر کی ٹی کتاب Arrow in the Blue
لگی ہے۔ اس کی خود نوشت سوانح عمری کا پہلا حصہ ہے اور یہاں ہر دہائی میں اس پر
معمودہ شائع ہوا ہے مارے بھیروں سے صرف ایک بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ
اسے فن سوانح نگاری کے نقطہ نظر سے نہیں دیکھ رہے ہیں بلکہ کونسٹر کی ساری
ہمیت یہ ہے کہ اس سے ہمیشہ اپنی تصانیف میں بری تفصیل سے کیمپسٹ پارٹیوں کی
اندوختی کمزوریوں، بددیانتیوں اور غلطیوں کا تذکرہ کیا ہے اور مدت تک کیمپسٹ رہنے
کے بعد پارٹی سے کنارہ کشی اختیار کر کے اس پروپیگنڈے سے اپنی شہرت میں اضافہ کیا
ہے اس سلسلہ میں اس کتاب کا بھی خیال کیا God that Faild جو مدراس میں
پڑھی تھی اس میں بھی کونسٹر کی غلطیوں سب سے اہم ہے اس کا موضوع
دیکھ رہے ہیں اہم لکھے والوں کو کونسٹر اسوئے، رچرڈ ڈرائٹ، ڈیڈ، ایونی، فشر اور
اسپیڈرے کیمبرس سے اپنی عظیمی کی داستانیں بیان کی ہیں اور ایک ساتویں نے اس میں
مرحب کر کے شائع کیا ہے۔“

"ہاں ٹیلر مشین سے نکل کر میں نے جرمن انکول آف سویٹل مائیکس کی
 راہ لی، انڈیا، چین سے ملے میں میں کہ سنا کہ کس طرح دولت اور بے تکلفی کے
 ذرائع کھینچ کر آئے۔ امریکہ میں نئی پستی، مصروفیت کے مستقبل، دیگر سوال اور
 بہت سے دوسرے مسائل پر بائیں یو میں اپنی کتاب Revolution in
 Philosophy میں لکھ رہے تھے میں نے سیکھے اور کچھ کے لیے امریکی ادب
 اور تحریر کی فعالیت کے حلقے اپنے مباحثات میں کچھ ایسے پسند کیا
 مگر اور بحث سے بچا ہوا اور مطالعہ کی کثرت سے فکروں سے صراحتاً اجتراء، لیکن ملکہ اور
 بہت بڑا "۔

"رات کو چھ گھنٹہ کی طور پر شہد "سورس دی آرگنٹ" والوں
 کے ساتھ ایک سویڈش بوشل میں کھانا کھیا۔ یہ وہی چیر ہے جس کے نام پر اعظم
 اعلیٰ قیام کر رہے اور ہر ملک میں ابھرتے رہے ہیں اور انسانوں کو اصل مسائل سے دور
 رکھتے ہیں کہ تم سے کم اس وقت یہ لوگ قوامی کام میں مصروف ہیں "۔

جب احتشام حسین امرتہ سے انگلستان گئے ہیں تو اسوں نے اپنی دائری میں کتاب کے
 اس باب کو "ہر نی دنیا کی طرف" کا عنوان دیا ہے۔ یہاں بھی جو کچھ دیکھتے ہیں اس کے اہم
 پہلوئیں کو بیان کرتے ہیں لیکن تنقیدی جائزہ ان کی تحریروں سے وابستہ رہا ہے اس باب میں سے
 چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"اور چونکہ ان ہے اس کتاب میں کئی اصلاحیں، رنگیں اور خوبیاں کتابوں،
 تسمیہی مرتبے، تاریخی، تعلیمات، شعوبہ کے قراءے پوشیدہ ہیں اس خط سے کئی
 بائیں، کئی بائیں حلقے میں اسے نوجوان نظر سے دیکھا ہے اللہ کو دنیا کے
 سب سے بڑے شر کو، جس کی رونق اور گرمی داری میں ہمارا اللہ بھی صرف ہوا ہے "۔
 "اسلامک کلچر اسٹیٹ منٹ سے نکل کر نیشنل گیلری چلا گیا تصاویر کا یہ
 بہت بڑا ذریعہ دنیا کی صرف چند گیلریوں سے بچے رکھا جاسکتا ہے میں نے یہاں پانچ
 گھنٹے صرف کئے جرمن مہدی سے اس گیلری کے بھی بعض حصوں کو حجاب کر دیا ہے
 یہاں پہلی، دفعہ، انٹرنیشنل، اعلیٰ، انگریزی، ہسپانوی مصوروں کی بہت سی اصل
 تصویریں ملاحظہ ہیں۔۔۔ لیکن اتنا تو کہ کتابوں کے متن اور حسن تصور، رنگ اور

آہنگ کی اس دہائی میں پہنچ کر من مسموری اور مجسمہ سازی کی عظمت کا احساس ہوتا ہے اور انسان کی تخلیقی قوتوں کا احتراف کرنا پڑتا ہے پر دار خیال کے بلوچہ جو جن کار حقیقت سے زیادہ قریب ہے وہی زیادہ متاثر کرتا ہے۔ ریسرچ میں نہ تو ڈیڑھ لکھی ہوئی ہو اسے ”رجنسن کی بعض تصویروں نے عالم خیال میں نہایت کہیں کہیں پہنچا دیا“

”آج پرولیسر ہائی من لوی نے پورٹ کلب میں چلے پر لایا تھا۔۔۔“
 اہمیت کا لکھنؤ یونیورسٹی میں ریاضیات کے پروفیسر ہیں ابھی لندن پہنچ کر ان کی نئی کتاب دیکھی ”Literature In An Age Of Science“ پروفیسر لوی کی ہر کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مشکل ترین مسائل کو آسانی ترین الفاظ میں لکھتے ہیں سوائے مدد کسی ہیں لیکن ملے کسی کا کام ہے بغیر سب کچھ کہتے ہیں اتنے بڑے عالم سے ملنے ہوئے کچھ خوشی ہوئی اور کچھ الجھن کا احساس تھا۔“

”یہ انسانی حسن“ یہ جلد رب جسم“ یہ گوشت اور پوست کے اندر
 حرکت کرتی ہوئی جوانی“ یہ اختلاط اور پید کے نظارے“ یہ جراثیم بے اہنگی“ یہ ہونٹوں
 کے دھڑلے خطوط اور“ کشاکش کی طرح گرتی ہوئی زمیں“ یہ جسم کے اندر نہ سائے والا
 شباب (چند شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا) کون کہہ سکتا ہے کہ زندگی مسین نہیں ہے ا
 یہ علم و فضل کا دریا جانے والے دانشور“ یہ قربانیاں اپنے والے سیاسی فکر کن“ یہ زندگی
 اور سماج کے دلوں کی دھڑکن سننے والے انسان دوست“ یہ آگے بڑھنے کے لیے جد
 و جد کرنی ہوئی انسانیت الیہا ان میں حسن نہیں ہے؟ لیکن ظہیر امیر کے اندر کوئی اور
 پونے لگا“ یہ مٹلکی کا شباب اور پکتے ہوئے جسم“ یہ جوانوں کے روز و رات اور بچکے
 جسم“ یہ بھیک بھانگی نگاہیں“ یہ بیاد بچے“ یہ سر بلبلہ داری کے دھنکے کی گھن اور مزاح کے
 جسم کا پسینہ“ یہ ہونٹوں پر سوسے سوال“ اور یہ اظہار حقیقت پر پابندی“ یہ راتوں کے
 مدفن بن جانے والے جسے اور یہ دھڑکتے دلوں کی دوری“ یہ طاقت کا لٹ اور کمزور کی بے
 بسی“ یہ رنگ اور نسل کی پیچ اور قتل و غارت کی گرم بازاری“ کیا میں یہ سب کچھ اس
 لیے سمجھتا ہوں کہ السرد ہو جاؤں“ غیب موڈ ہے“ اب میں لکھوں گا ۱۵۰

”اشیو لین سواریم میں ایک فائنش دیکھی اور شیکسپیر کا کھر دیکھنے کے
 لیے اسٹریوڈ پائن ایون کے لیے روانہ ہو گیا۔۔۔ قصبہ کا ایک حصہ پار کرنے کے بعد

ہزاروں سوالات کا جواب دے چکا ہوں میں سے قہوڑے سے زیادہ گھمے کی سہی کی ہے۔ اس سے میں تاریکی طاق کام نہ رہا لفظ ہوگا تاہم اگر میرے حساسات میری آنکھیں اور میرا دماغ مجھ سے مجھوت میں لگتے رہے میں تو میں سے کچھ نہ کچھ تو ضرور ہی گمما ہے۔

”میر تو اس طویل اور تنہا سفر میں میں سے، مگر کچھ اور ہیں سبکھ تو اسکا ہی سہی کہ میں نے احتشام حسین کو گھمے کی کوشش کی اور جی ہاں میں سنا سنا کر سے کبھی کبھی سنا بھی دیا لیکن اس کی دای، اس کے لاسپہانہ فلم اور تنہائی کو دور نہ کر سکا جب میں نے اسے ایک دن مت مجبور کیا تو میں سے مسکرتے ہوئے سیکسیٹر کے ڈرامے ”ایر یولفکٹ“ کا چوتھا پلٹ میرے ماتے رکھ دیا جس کا مضموم یوں ہے۔

”ورلڈ جنکسن سے کہتی ہے۔ سنی ہوں تم ایک اور اس طبعیت کے انسان ہو وہ احترام کرتا ہے لیکن کہتا ہے کہ میری اد کی ایک عالم کی، ماہر موسیقی، وریڈی، سپاہی، قانون دان، حاتون، وراثت کی اداسیوں سے مختلف ہے یہ بہت سی معنوں کیفیتوں کا مجموعہ ہے۔ یہ سفر میں سوچتی ہوئی باتوں کا نتیجہ ہے اور بار بار غور کرنے سے اس سے مجھے ایک عجیب قسم کی متفکر حیر دای میں پایٹ پایا ہے۔ یہ سب سن کر ورلڈ کہتی ہے تم مسافر ہو تو یقیناً تمہارے اور اس سے کے لیے کالی سیاب موجود ہیں۔“

اسی طرح جناب سید احتشام حسین نے اپنے سفرنامہ ”ساحل اور سمندر“ میں قاریوں کے لیے عجیبائی روحی اور سماجی مسائل پر فکر و نظر کا، فرماں مہیا کر دیا حالانکہ اس کا یہ سفرنامہ اس وقت اردو ادب میں ویس کوشش کی حیثیت رکھتا تھا۔

شاہد نقوی

قرآن سے پسند شدہ ہر صفت کے ایک صفحے آؤں

مجموعہ کلام سوغات

ارتقاء مطبوعات



— ۱۶۴ — کوتهی جیوه ده دانی علی (مقبره اردو گلشن دانی) کے آسپاس کی جگہ پر موجود ایک سنگی کھنڈ

سید طاہر افسوس اسی بلا کو جس پر چشم انداز لایم جیوہ سنگیوں کو اور ایسی جگہ پر چشم جیوہ سنگی دانی

نگارشات سے انتخاب

خودنوشت سوانح

سید احتشام حسین

۱۹۱۲ء میں پیدا ہو۔ وطن بابل صبحِ علم گزیدہ (بابل) ہے، اسلامی تعلیم پر نے شرفا ور
روما کی رسم کے مطابق کتب میں ہوئی جس میں مذہبی تعلیم بھی شامل تھی۔ اگرچہ اس کی حیادہ بھی۔
تھی میری پیدائش کے زمانے سے پہلے ہی گھر کی حالت میں دو تھوڑا پیدہ ہو چکا تھا جس میں حقیقت
ور مہال کے درمیان جنگ و جلی ہے۔ خاندان اور طے والوں کا مانوں اس قدمت پسندی اور
میلادی مطلق پرستی کا تھا جس میں گزراوی خیال اور آزادی فکر کے بے سواد میں مل سکتا لیکن
جہانوں کے بے مل نکتا ہے۔

اگرچہ تعلیم کی ابتدا علم گزیدہ سے ہوئی جہاں ذہنی پرستی اور عام مسائل سے تعلیم کی اس
وقت بہت مہیاں تھی اس بے تعلیم کے ساتھ ساتھ ذہنی نشوونما کا موقع کافی تھا۔ بہرورے میں
انعام ملتا تھا مگر اب سوچتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ سیری عام معلومات کتنی کم تھیں اور میں
کس طرح صرف درسی طور پر علم حاصل کرے کو صحیح تعلیم سمجھ رہا تھا

اسٹریٹنٹ کے سپر انڈر جیلابو۔ جولائی ۱۹۲۰ء ہندوستان کی تاریخ میں میرے لیے
یادگار ہے۔ الہ آباد میں زندگی سب سے بدنام ہو رہی تھی سوں چھراہی شباب پر تھی۔ اور مجھے اس سے
پہلی وچسپ ہو گئی میرے مطالعے کا انداز بدل گیا تو میرے طریقہ فکر و نظر بھی بدل گیا۔ آٹھ سال کے

مسلسل قیام میں رہی مگر کمرے پر آٹھ سالوں اور داغ دلوں کے لیے بے پناہ حرکت اور
بھڑکی کے حامل تھے مختلف قسم کی پتھریوں کی وجہ سے تھوڑی دیر کے اندر خود غالی کی موت کی رہی اور
شعبت و باری مرعہ سبیل ہونے کا سرخ۔ مل کا ریلو پارٹے اور خود کرے کی وجہ سے یہ کی صرف
ایک مدت تک رہی جس آئی بھی جاتی ہے

محمود نگاری کا ٹیوٹل سال ۱۹۳۴ء میں ہو اس وقت کچھ افسانے لکھے جس میں رہاں کے
گانا سے بار پتھری کا جمع تھا اور پتھری میں محبوبیت تھی۔ پھر اسی سے میں پہنچ کر برطانیہ کے
مدرسے میں لکھا تاریخ عقیدہ اور حرامیہ افسانے، بیانیہ اور معاشی مسائل پر بحث،
ذہن سے وہ بھی چیز۔ تھی میں پر صبح آبل۔ کی ہو کسی کسی عظیم اور عزیز بھی کتاب

کچھ حرف سے کہ پہلی قدامت پسند عداوت میں خوش۔ تھا کچھ کچھ اندھیر ماحول
آتا تھا در ہندوستان کی مختلف ترقی پسند تحریکوں کے دلائل میرا دور کر کے مجھ میں کسی قدر خود
عقد کی حالت پیدا کی در میرے وقت سے یکمید، میلالت کوڑھے اندھ، کچھلے کا مو قعد دیا اس
وقت بھی میری وصیت ایک مشکل کی وصیت معلوم ہوتی ہے میری وصیت کیا ہو میں ہے میلالت
کا صحیح تحریک بھی میں کر سکتا کہیں رہے میں ہوں

۱۹۳۴ء میں ہی اسے اندھ ۱۹۳۶ء میں ایم سے دووں الہ آباد یو ج رٹی سے فرسٹ ڈیوٹن
میں پاس سے فوٹوں پڑھ رہا تھا کہ خدمت مل گئی اس وقت لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبہ نظری و ادب
میں لکچرار ہوں ادبیات کے علاوہ بیانیات فلسفہ تعلیم بھی ضروریات اور جزیات سے دلچسپی رکھتا
ہوں اور لکھتا ہوں کہ میری تمام مضمون سے دلچسپی ہے جو سے صحیح اپنی وقت بھی پیدا میں ہو سکتا
اب تب میں تو جیکڑوں لکھے جس کو قاعدہ نصیب۔ پیش کر کا کام کر رہا ہوں جس سے
خدمت کو اپنی خدمت کر سکیں۔

جون ۱۹۳۰ء میں ٹیوٹل ملی تیر اندھ میرے میں پڑایا تھا جس بھی تک تو ایسا معلوم
نہیں۔ کہ۔ پر مشغول تھا ہے معلوم میں اس معاملے میں میری سبب پسندی سے تسکین دے دی
بندہ وہی ارمات ہے

ماہو میرا پسندیدہ افسانہ

میرا شیر جلدی

بیماری کی خبر

پروفیسر احتشام حسین

جب خدا میں تم لکھ دیتی ہو ، کچھ حال اپنی بیماری کا
میں شے کے تھانی میں ۔ جانے کیا کیا سوچا کرتا ہوں

کچھ بندھے ، کوزھی ، دیوانے ، ٹنگوں میں سہنے لگتے ہیں
کچھ قند زہر کھو کے پیستے ، جاں خاموشی سے دے دے کر
دنیا میں مطلق رہنے کی تعزیریں پانے لگتے ہیں
کھیتے ہیں جن کے ظام و سحر اک قابلِ نفرت حواری سے
جو مرتے ہیں کمال سے اور جیتے ہیں دشواری سے
خوں چوس لیا ہے فیروں نے ، نادان بھی ہیں ، بیمار بھی ہیں
میسے کی خدا دل میں ہے ، اور جیسے سے بیزار بھی ہیں

اس درد کی مددی دیامیں بے اسلہ کہوں سنے ہیں
جو ساری عمر ضرورت کی چیزوں کے لیے بھی ترستے ہیں
گو ایسے لوگ بھی ہیں جن کو گمشدگی آسائش ہے
" سب ہے میرا ان کے لیے جس پہر کی ان کو خواہش ہے
جس کے لیے سوتا مٹی ہے ، جن کے لیے موتی سستے ہیں

لیکن مجھ انسانوں کو کہیں حق نہیں حاصل جینے کا
 طوفان ہی کے قبضے میں کہیں چور ہے من کے سنبھلے کا
 کب تک ہے بس اللہ بوسنی تھکر کا دغا دینے کا
 کب تک ہے کچھ پائے ہوئے ، اپنا ہی سب کچھ کھوئے کا
 کب تک اندھی بھیڑوں کی طرح ، اپنی راہ نہ پائے کا
 کب تک موت کے آگے سے پیچھے ہی ہٹا جائے گا

بحر خود ہی دل میں اٹھتا ہے ، اب وقت مرنے والا ہے
 دوسرے سورج بن جائیگی گے ، وہ دور بھی آنے والا ہے
 امید کی ایک نفی ہی کرنا ، یسوی پر چھا جاتی ہے
 اور اس کی صوم میں ایک غی دیا ہوا ، پھیلنا ہے
 سہلی کی رگوں میں چبھتی ہے ، آنکھوں میں آلو آتے ہیں
 دل بے تھو ہو جاتا ہے ، جینے کی ہوس بڑھ جاتی ہے
 جاں وقف پیش ہو جاتی ہے اور عزم بقاوت کرتی ہے

اس وقت اک سیل ، ارادوں کی ، جینے سے ہو کے گزرتی ہے
 دنیا کو طغی بٹانے کا جو دھیان مادل میں آتا ہے
 ایسی خبروں کے سننے سے وہ اور قوی ہو جاتا ہے

جب خط میں تم لکھ رہی ہو ، کچھ حال اپنی بیداری کا
 میں شہد کے شعل میں نہ جانے کیا کیا سوچا کرتا ہوں

ہم جنگ کریں گے فطرت سے ، فطرت پر تھو پائیگی گے
 اور فطرت پر تھو پا کر اب روز امر بن جائیگی گے

کھنڈر

سید احتشام حسین

شہر سے کوئی میل سحر کے قافلے پر ایک بہت بڑی عمارت کا ٹوٹا بھونٹا کھنڈر تھا۔ عریب کے بھوپترے کی طرح وہ ان اور مزدور کی جیب کی طرح حلی گھر جیسے عریب کے بھوپترے میں کبھی کبھی زندگی کے آشہد کھلی دیتے ہیں اور مزدور کی جیب میں چند پیسے آجاتے ہیں، اسی طرح اس کھنڈر میں بھی ایک بڑھا فحیرات کاٹے کے سہ آجاتا تھا۔ وہی اس کا سنا ملک تھا شاید کبھی اس عمارت کی ملکیت کے لیے جھگڑے ہونے ہوں، لیکن اب فحیر اس پر پوری طرح قابض تھا یا کبھی کبھی وہ سیاہ کاٹھن جو بھکاری کی جمع کی ہوئی چیزوں میں شریک ہوتا تھا۔

تھے تو بہت سے مشہور تھے لیکن ٹھیک پتہ نہ تھا کہ جس کس عمارت کا کھنڈر ہے۔ بڑے اور جوان اس کے متعلق کم باتیں کرتے تھے۔ لیکن بچے ہر راتے میں یہ جانتے تھے کہ اس میں بھوت رہتے ہیں، اس پر بھوں کا قبضہ ہے، یہی بچے کوئی اس کے قریب نہ جاتا تھا جس راتے سے گزر کر کھنڈر ملتا تھا وہ بھی منسل تھا، چرواہوں کے لڑکے اپنے جانوروں کو ادھر نہ جانے دیتے تھے۔ اور بچے دھرم لگتے تھے جس وہ بڑھا بھکاری دن سحر کی محنت کے بعد اسے رات میں صبر، اُلو کر تا کم لوگوں سے اسے اس محل سرا سے لگتے یا اس کے اندر جاتے دیکھتا تھا اور اگر کبھی صبح کے اندھیرے بارات کی تاریکی میں دیکھا بھی تو حزن یا محنت سمجھا۔

کھنڈر کی دیواروں پر تمکاس لگی ہوئی تھی زیادہ حصہ گر چکا تھا اونچی نیچی زمین ہر رات میں

اپنی شکل بدلا کر کئی تھی لیکن اس عظیم الشان حادثہ کا وہ گوشہ جس میں بھکاری کی راہیں سر پہنچیں
تھیں ایک حالت پر قائم تھا۔ تقریباً اس درخت کے نیچے چھ سو سیدھے گہریوں پر دی ہوئی تھی
بہن میوں میں سورج کی روشنی اور چاند کی کرنیں اس کے اندر تک پہنچ چکی تھیں۔ ویسے بھکاری
کو کسی طرح اعلیٰ کی ضرورت نہیں۔ کئی برسوں وہ کب سے اس گھنڈہ میں رہا تھا شاید اپنی
زندگی کا زیادہ حصہ اس سے۔ یہیں بسر کیا ہو سکتا ہے کبھی اس میں تھکے ہیں اس کی جوانی کی راہیں
دیکھیں بی ہوں کون ملے۔ مگر اب وہ بالکل بوڑھا تھا سرے کے قریب

اور قریب ہی ایک برگد کا سوا درخت بھی اس گھنڈہ کی طرف ان اور خشک تھا اس
کی ایک اونچی شاخ پر ایک برگد ہر وقت بیٹھا اور کھاتا تھا دوسرے دوسرے ان وہ کہیں جاتا
اوپر اس درخت پر آجاتا وہ بھی اس بھکاری کی طرح اکیلا تھا گھنڈہ بھکاری درخت اور گھد
جیسے۔ سب کسی ایک ہی طبع کی کڑی معلوم ہوتے تھے۔ سب ضروری تھے اور وہ گھنڈہ۔ ہوتا تو
بھکاری کھاتا اگر بھکاری۔ ہوتا تو، مگر اس مکان کی ضرورت ہی کیا تھی اگر وہ درخت۔ ہوتا تو
اس گھنڈہ کی دورانی پوری طرح محسوس۔ ہوتی اور جو گھد ہے کہیں اور ہوتا اور اگر گھد۔ ہوتا تو یہ
درخت پر کھاتا جیسا کہ سب میں فرسودگی کی بھٹک کے باوجود کوئی کٹائی تھی تو جو کچھ جانے کی چلتی
تھی۔

کیا اس گھنڈہ میں جو ان مواد حسین و جمیل موجود تھے۔۔۔ مہر تھی وہی ہوگی؟ کیا اس
سویں درخت میں کبھی بچپن اور۔۔۔ کھل رہے ہونگے کہ اس مواد خود گھد کے علاوہ دوسری چیزیں
بھی پائی جاسکتی ہیں؟ کیا معلوم شاید ہو۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے آج تو اس
گھنڈہ میں ایک بھکاری رہا تھا یوں مگر ایک ٹکڑے مٹی کے لیے مارا مارا مہر تھی اور رات کو اس میں
آکر آرام کرتا اور اس درخت پر ایک گھد تھا جو مواد جانوروں کے نظام میں بیٹھا اور کھاتا تھا

جاڑوں کی خشک سے بچنے کے لیے اور بارش سے محفوظ رہنے کے لیے بھکاری اس فلی
ہوئی پھٹ کے لیے پلا جاتا اور کڑی کی دھندلی چاندنی میں وہ پھٹ کے باہر نکل کر سو جاتا مگر گھد کو
ہمیشہ ایک ہی جگہ بیٹھا ہوا دکھایا۔ دونوں ایک دوسرے سے ملنے لگے تھے اور مختلف

بھکاری بوڑھا وہ کھڑا ہوتا تھا اب کوئی دن ایسا بھی گزرا تھا کہ وہ دھیر۔۔۔ نکلتا مگر پچھلے
دن کی بجائے ہوتی راہیں جو میں تو کھاتا تھا۔۔۔ کاتے سے پر رہتا اور پچھلے دن بھوک سے مجبور ہو کر کھ
نکلتا۔ اس سے چلا۔ جاتا تھا مگر پچھلے دن اس سے بڑا۔ جاتا تھا مگر پچھلے دن اس میں شریک جانے کی

سنت۔ حتی مگر جلا صردی تھا واپس آئے کی سنت۔ حتی مگر واپس آنا لازمی تھا شرکی فہم صردی
 اپنی عقل اور ہیئت سے ڈر کر اسے اپنے پس جگہ دینے سے انکار کرتی تھیں مگر کھنڈر کی عقلیت اور
 ہیئت کے بل پر جو اس سے مانوس تھا۔

جائے حق سے اس کی پیدائی کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا مگر وہ شر آتا ہوا تھا وہ میں
 دروازے تھے میں سے کچھ۔ کچھ صراطِ طاعت تھا پہلے اس دروازوں سے ٹھیک ہوا جگہ کے بعد
 مگر سارے دن شر میں مبتلا ہوا تھا مگر اب اس کی طاقت جو سب سے بڑی تھی وہ کم سے کم پر آتا
 تھا اور اطمینان کھنڈر میں واپس آتا تھا مگر اس کی ساری قوت جسم ہو گئی اور حینِ دن
 تک وہ کہیں نہ جاتا چوتھے دن پھر اس سے بہت کی اور دن پھر شر میں چکر لگاتا تھا رات کو واپس
 آتا اب تک اسے کھنڈر میں روشنی کی ضرورت کبھی محسوس نہ ہوئی تھی مگر آج اس کی نگاہ کام
 کرتی تھی۔ اسے ہر جانب روشنی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی اس کی آنکھوں میں چنگاریاں سی ناچ
 رہی تھیں اور طبیعت میں بیکار تھا رات کو گون گونے چلنے۔ مصلیٰ، بھکاری، بھاری گری سے لوثا ہوا
 پخت کے پیچے سے بلبر گیا یہ اس کی آخری رات تھی

صبح ہوئی تو گدھ نے پر پہنچ کر سہڑے اس سے کبھی کسی انسان کو کھنڈر میں اس طرح
 پڑے ہوئے نہ دیکھا تھا اس کی غصہ کی جسم ہو گئی اور وہ اڑ کر پڑے ہوئے بھکاری کے قریب آیا۔
 بھکاری نے اسے پیلی سے ہاتھ دبیر ملائے گدھ نے اپنی چونچ اس کے جسم پر ہادی بھکاری نے درد
 سے حد حد کر دینے سے نہیں گدھ اڑ کر اپنی جگہ پر چلا گیا لیکن اب وہ اونچے ہیں رہا تھا اس کی نگاہیں
 بھکاری پر جمی ہوئی تھیں وہ دن پھر تڑپا گیا رات کو کھنڈر بے ہنگم کے رہ گیا

صبح کو گدھ پھر پیچے آیا اور تھوڑی دیر میں بہت سے گدھ جمع ہو گئے اب وہ دروازوں پر
 بیٹھ کر اونچے دے کنہار جانور تھے ان میں زندگی تھی ان میں آواز تھی ان میں لوستے والوں کی
 خود مرسی تھی وہ ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔

اونچی بچی دواؤں کے سامنے اسی طرح میر سلسل چاڑی طرح لیے ہوئے رہے ،
 دواؤں کی کھاس ہوا سے اسی طرح ہتی رہی مگر بھکاری۔ رہا

دوسرے دن ہڈیوں کا ایک انسانی ڈھانچہ زمین پر پڑا ہوا تھا بالکل کھنڈر کی طرح ویران۔
 درست پر کئی گدھ رستے تھے لیکن اب کوئی بھکاری اس کی مدد سے کے لیے اس کھنڈر میں نہ آتا تھا۔
 ماخوذ (میر پسندیدہ انسان) مریم شیر ہندی

ادب اور تہذیب

کبھی کبھی یہ سوال پرچا بھی جاتا ہے اور خود میرے ذہن کو بھی الجھاتا رہا ہے کہ کسی قوم کی تہذیبی زندگی سے اس کے ادب کا کیا تعلق ہوتا ہے؟ ادبی انظر میں یہ سوال ایک جانی ہو چکی چیز سے تعلق ہے اور ہر شخص کسی نہ کسی شکل میں یہ جانتا ہے کہ تہذیب ایک ملک کے فنون لطیفہ، ادب، فلسفانہ خیالات، طرز معاشرت، ادبی ترقی اور زندگی کے تضاد اور متضاد عناصر کو حوالہ بنا کر اجتماعی زندگی میں ہم آہنگی کا ایک خوشگوار احساس پیدا کرنے سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ طبقاتی سماج میں مختلف طبقوں کے لیے اس کی توصیف مختلف ہو سکتی ہے جہاں کسی نہ کسی قسم کی تہذیبی زندگی کا وجود، طریق پیداوار پر قدرت رکھنے کی مناسبت سے لازمی ہے۔ تہذیب کیا ہے؟ اس کے تعلق میں نے ایک جگہ لکھا تھا کہ جب ہم لفظ (تہذیب) استعمال کرتے ہیں تو اس سے کسی قوم یا ملک کی داخلی یا خارجی زندگی کے تمام اہم پہلوؤں سے مجموعی طور پر پیدا ہونے والی وہ امتیازی خصوصیات مراد ہوتی ہیں جنہیں اس ملک کے لوگ عزیز رکھتے ہیں اور جن کے حوالے سے وہ دنیا میں پہچانا جاتا ہے۔ انسان قدروں کے جانے اور محفوظ رکھنے کی جدوجہد میں اپنی قومی تہذیب پیدا کرتا ہے۔ وہ تہذیب اس کے ماضی سے ہم آہنگ ہوتی ہے اور دنیا کی عام رفتار ترقی سے نسبت رکھتی ہے۔ تہذیب قومی زندگی کی ساری بنیادی روحانی اور مادی انگوں اور خواہشوں کا احاطہ کر

یعنی ہے۔ اس کو باطنی اور سنواری ہے اسے ایک ایسا نصب العین بخش ہے جو زمانے کی ضروریات کا ساتھ دے سکے۔ وہ ان ساری طاقتوں کو سمیٹے ہوئے آگے بڑھتی ہے جو ماضی نے اسے عطا کی ہیں۔ میرے خیال میں تہذیب سے عام طور پر یہی فہم حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح تہذیب ایک قوم کے شعور کی مظہر بن جاتی ہے لیکن اس کی سطح بھی یکساں نہیں ہوتی کیوں کہ تہذیبی اقدار یکساں طور پر ہر طبقے کی طبیعت میں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ادب تہذیبی ارتقا کا ایک جز اور اس کا ترجمان بن کر زندگی کی اس تکفل کو پیش کرتا ہے جو کبھی فرد اور جماعت کی تکفل کی شکل میں رد لیا ہوتا ہے کبھی جماعت اور جماعت کی تکفل کی شکل میں۔ اور ادب اس اکتھار میں جس قدر زیادہ عمومی انداز اختیار کرتا یا زیادہ سے زیادہ لوگوں کی زندگی کا ترجمان بنتا ہے اس قدر وہ تہذیب کے عمومی پہلوؤں سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔

ہر ملک و قوم کا کوئی نہ کوئی تہذیبی سرمایہ ہوتا ہے۔ چاہے وہ قوم بہت زیادہ متقدم نہ کہی جاسکے مگر بھی وہ اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے کچھ بنیادیں رکھتی ہے جس سے وہ آگے بڑھنے میں خود کو سہاوتی ہے۔ اس کے گیت، رقص، موسیقی، قصے، کہانیاں، حربہ الامثال سب اس کے وجود کا جز بھی ہیں اور مظہر بھی۔ اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام چیزیں قومی خصوصیات رکھتی ہیں لیکن ان کا نصب العین انسانی ارتقا کی کوششوں سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو صدیوں کے انقلابات نے انہیں پھینکا چور کر دیا ہوتا۔ نتیجہ ہر بڑے تغیر کے بعد تہذیب اور ادب کا کچھ حصہ بیکار ہو کر فح ہو جاتا ہے لیکن ہر کچھ انقلابات کے ہنگامے پر اپنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے وہ حقیقتاً ایک ملک اور قوم کی روح کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس میں ہلاکی جو قوت ہے وہ اس قوم کی قوت کا آئینہ ہے جو آفاقی اور انقلاب کی بجلی میں تپائی گئی ہے۔

قومی ادب انسانی ادب بھی ہوتا ہے اس کی مثال ہر قوم کے ادب و شعر میں مل سکتی ہے کیوں کہ جہاں تک انسانوں کے خوابوں اور ان کی تمنائوں کا سوال ہے خوش اور مطمئن، آسودہ حال اور ترقی پذیر زندگی بسر کرنے کی حد تک ان میں گہری یکسانیت پائی جاتی ہے۔ وہ اصول کو غلام بنانے، تفرقے پیدا کرنے، لوٹ کھسوٹ کر کے خوش حال بننے کے جذبات، زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے جذبات کی طرح بنیادی اور خوبصورت نہیں ہیں انہوں نے

مخصوص سماجی اور سیاسی حالات میں جنم لیا اور ترقی کی ہے اس لیے ادب اپنی اصل شکل میں ان جذبات کی ترجمانی نہیں کرتا بلکہ اکثر انہیں باطنی انداز اور تعبیر زیر اور قابلِ فطرت اور گہما گہما بنا کر پیش کرتا ہے لیکن ساری دنیا کے ادب میں محبت کی پائیداری اور زخم زدن کی خرابی 'سماج' میں تو فلک پیدا کرنے اور فطرت کو قابو میں لانے کی اسٹیم کسی نہ کسی شکل میں ضرور ملے گی اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہر دور میں قومی تہذیب اور قومی زندگی ادب کو متاثر کرتی ہے لیکن اس کے انہیں حصوں کو پائیدار بنانے میں کامیاب ہوتی ہے جو اس وسیع تر فتنہ فطری میں رہتی کرتے ہیں۔ ہائی جسے زمانہ سے بدلتا تاریخی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اعلیٰ اور برسی کا وہ ادب جو موسیقی اور ہنر کی خوں آشام خواہشات کا آئینہ ہے اپنے ملک میں بھی مست چکا ہے 'میں اہ قومی ادب کا جز بننا تو پنی بات ہے۔ یہاں تک کہ موسیقی اور ہنر کی آپ بیتیاں دیکھنے کا شوق صرف تاریخ کا طالب علم رکھتے ہیں۔ اس ادب میں اعلیٰ اور برسی کی قومی زندگی (بلکہ کل پر چھا جانے) تو حاکم طبقہ اور اس کے مسائلوں کی زندگی کا ان ماضی دور اپنی محکمہ رکھتا ہے جو انسانی فتنہ فطرت سے پسند نہیں کیا جاسکتا۔ فاشزم کے تاریک مسائل میں پیدا ہونے والے ادب کی تہذیب دشمنی کا تجزیہ یہاں مقصود نہیں صرف اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ادب تہذیبی زندگی سے اسی وقت تعلق رکھتا ہے جب وہ اپنے اندر قوم کی منعقدہ اور انسان دوست قندوس کا اتحاد کرے 'اس کے کسی ایک طبقہ کی جارحانہ اور ظالمانہ خواہشات بھی تہذیب اور ادب کا جز نہیں بن سکتیں۔

ادب کو تہذیبی زندگی سے تعلق کرنے کے سلسلہ میں جو اصل دشواری پیش آتی ہے اور جس کا اہم درست سے نوک کل کر لیں کر سکتے ہیں ہے کہ عام طور پر ادب کو محض فرد کی خیال آرائیوں اور محض تصورات کا اظہار سمجھا جاتا ہے۔ اس ضمن میں آرٹ میں انفرادیت کی بحث کے علاوہ فرد اور جماعت کے تعلق کی بحث بھی اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ ادب کی طرز ہی خواہشات اور حیادت کو کسی قوم یا ملک کے مجموعی تہذیبی تصورات کا جز کسی طرح بنایا جاسکتا ہے! یہ حقیقت ہے کہ ادبیات کا بڑا حصہ افراد کی کاوش فکر کا نتیجہ ہے اور اعلیٰ درجہ کا تخلیق میں ادب اور فن کاری شخصیت نمایاں ہوتی ہے لیکن عجائبات کو نظر انداز کر دیتے ہیں یہ مسئلہ ابھی پیدا کرنا ہے وہ یہ ہے کہ بہت سے فاداد اور مفکر فرد اور جماعت میں کشش کو لازمی جز تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ

فصلِ قسی کی عمارت کا بڑا حصہ اسی مفروضہ پر قائم ہے کہ انسان سماج کے ساتھ مجبوراً
تعلق رکھتا ہے ورنہ اس کی انفرادیت تو سماج سے بالکل الگ ہی رہنا چاہتی ہے۔ یہی خیال
دوسری انجمنوں تک لے جاتا ہے کہیں کہ اس میں ایک طرف تو انسانی فطرت کو بعض جہوں
کا مجموعہ قرار دے دیا جاتا ہے جو بدل نہیں سکتیں اور دوسری طرف یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ
کسی سماجی نظام میں افراد کو بہ حیثیت فرد مسرت حاصل کرنے اور اپنی جائز خواہشات پوری
کرنے کا موقع مل ہی نہیں سکتا۔ یہ دونوں باتیں صحیح نہیں ہیں نہ تو انسانی فطرت غیر تعمیر پذیر
ہے اور نہ سماج فرد کا دشمن ہے۔ اس لیے وہ ادب جو اپنی انفرادیت کو سماج کے عام مفاد
سے لگ لے ہا کر اپنی خواہشات اور اپنے افکار کو لوگوں پر لا دینا چاہتا ہے وہ گویا تہذیب کی
ان اقدار کی مخالفت کرتا ہے جسے انسانوں کی عام جدوجہد نے صدیوں کی مبراں گزریوں کے
بہرہ نفع دیا ہے اور اسے انسان کے مستقبل پر مجبور نہیں ہے بلکہ وہ اس اندھی جبلت کا
دیکھ ہے جو کبھی نہیں بدلتی۔ ان عقائد کے ساتھ کوئی ادب انسانوں کے تہذیبی ارتقا کا
قائل ہی نہیں ہو سکتا۔ اس کے یہاں ادب اور تہذیب کے تعلق کی جتنی فصلیں ہوگی کیونکہ
اس کی وہ انفرادیت جو سماجی زندگی سے صرف اپنی ذات اپنے پھر ہم خیالیوں کی بات سناتے کے
لیئے برسرِ پیکار ہے عام تہذیبی زندگی کا جز بھی نہ بن سکے گی۔ اچھا ادب اپنی انفرادیت کو
برقرار رکھتے ہوئے بھی اپنی اپنی جدوجہد کو سماج کے عام مفاد کے کام میں لاتا ہے اور اپنے
خیالات کے پورے میں اجتماعی خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ ادب ایک تہذیبی عمل ہے اور
تہذیب کا کوئی ادارہ محض فرد کی کاوش کا مہون منت نہیں ہے۔ اس میں قوم کی زندگی کا دل
دھڑکنا چاہئے۔

ابھی درمیان میں قدموں کا ذکر کیا تھا ان کے ضمن کے سلسلے میں بھی چھوٹی ہوتی
ہے۔ قدریں تہذیب کے انہیں عناصر پر مشتمل ہوتی ہیں ہر صدیوں کی حقیقی اور قیسی
جدوجہد سے پیدا ہوتی ہیں اور جن سے ایک تہذیب اور اس کے عزیز دیکھنے والے پچانے
جاتے ہیں۔ قدریں بدلتی رہتی ہیں ان کی حدیں بدلتی رہتی ہیں لیکن تہذیب کے ہر دور میں ان
کا وجود پایا جاتا ہے۔ قدیم ادبیات میں اخلاق، انسان دوستی، محبت اور فن کے مخصوص
صورت تھے، انہیں تہذیب کی قیمت سمجھنے کرنے میں مدد دیتے تھے، وہ صورتیں اس
نشانے کی معاشی، اقتصادی اور معاشرتی زندگی سے ہم تنگ تھیں اور انہیں اسی نظام نے

پیدا کیا تھا۔ جس کی بنیادی ذرا سی پیدوار اس کے پیداکرنے کے طریقوں اور اس پر پلندہ رکھنے کی صورتوں پر تھی لیکن تلف اسباب ارتقائی اور انتظامی اثرات کی وجہ سے انسان کا علم، ذہن، انداز نظر اور تدریجی صورتوں کے حلقے اس کا نقطہ نظر بدلنا، فطرت پر کار پانے کی حدود میں اس نے اپنے آپ کو بدلنا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان قدروں میں بھی تبدیلی ہوئی جنہیں وہ عزیز رکھتا تھا اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے جسم کی ساخت بدل گئی لیکن شیوں نے اس کے احوال کی طاقت میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔ دورین اور خوردبین نے اس کی دیکھائی پیدھائی، انجمن وغیرہ کی پیدائش نے اس کی رفتار میں کمی اور ہر جگہ وہ اپنے کو زیادہ قادر اور توانا محسوس کرنے لگا۔ ایسے میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ اس کے بہت سے قوتیں باطل ہوتے ہیں گے اور بہت سے شکوک یا تو رفع ہوئے ہوں گے یا حقیقت میں بدلے ہوں گے، اس کو انسان کی قوت اور امکانات عقل پر مبنی، مجموعاً پیدہ ہوا ہوگا، اس کے خیالات نے پہلی حد پتھریوں کو توڑ کر نئے امکانات کی روشنی میں سمجھنا شروع کیا ہوگا، تبدیلی کا بھی مفہوم ہے کہ مادی حالات کے بدل جانے سے انسان کا شعور بھی بدلتا ہے، آپ جو قدر میں پیدا ہوئے ہیں ان میں یا پہن ہوگا، دوست ہوگی، انسان کی طاقت پر مجبور ہوگا اور فطرت کے حلقے خیالات بدلے ہوئے ہوں گے۔ لیکن اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ محبت کی جگہ نفرت، اخلاق کی جگہ بد اخلاق، انسان دوستی کی جگہ انسان دشمنی پیدا ہوگی۔ شروع میں کما چکا ہے کہ عارضی طبقاتی استحصال کے ماتحت ایسا ہو سکتا ہے لیکن وہ کسی قوم کی ارتقائی تدریجی زندگی سے ہم آہنگ نہ ہوگا اس لیے قدیم تہذیب کے وہ اجزاء جو انسان کی عقل، زندگی کی بقاء اور چودھ کے سطر میں کسی نہ کسی شکل میں نئی تدریجی قدروں میں بھی جگہ پائیں گے ان کے حاصل کرنے اور ان پر نذر دینے کے طریقے تلف ہو سکتے ہیں لیکن ان کا وجود ختم نہیں ہو سکتا۔ یہ حلال زندگی کے حلال کا پتہ دے گا اور ایک قوم کو اس کے انسانی سے حلقے رکھنے میں بھی مدد ہوگا اور بہانہ، ادب اور فنون لطیفہ اس حلال کو برقرار رکھنے میں بڑا حصہ لیں گے، یہی وجہ ہے کہ کوئی قوم اپنی زبان کے بدلے جانے اور اپنے ادب سے غفلت برتنے پر تیار نہیں ہوتی۔

اب اگر ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ادب تدریجی قدروں کے اعلان و اظہار کا ذریعہ ہوتا ہے، اس سے کسی قوم اور ملک کی مدد بچاؤ جاتی ہے تو ظاہر ہے کہ ان کے تحفظ

کی ضرورت بھی ہے اور ادب ایک حیثیت سے ان کے فتنہ کا درجہ بھی بنا ہے۔ یہاں ان تاریخ کی کلیات میں جانے کا موقع نہیں ہے لیکن اصل حقیقت کی طرف اشارہ مفید ہوگا۔ کیا ادب خاموشی زندگی کے بدلے میں مدد سے بغیر عقلی و اخلاقی کیفیات کی تبدیلی سے تمدنی خدمت انجام دے سکتا ہے؟ اس سوال کے جواب پر اس بات کا انحصار ہے کہ ادب کس طرح قومی زندگی کے بدلے اور اسے بالا مال کرنے میں مدد دے سکتا ہے؟ اور جدید کا اہم ترین فلسفیانہ بحث ہے کہ انسانی شعور مادی حالات کا عکس ہے یا مادی حالات انسان کے انہی کی پادار ہیں اور شعور پرست فلسفہ جیسے بدل بدل کر انسان کو بھٹا رہا ہے کہ انسانی انہی تھیر کا سب سے بڑا کال ہے لیکن جس نے بھی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اور فلسفہ افکار کی تاریخ پڑھی ہے اسے یقین ہو جائے گا کہ گو انسان ہی اپنی ضروریات یا ضرورت کے احساس کے ماتحت مادی تھیر پیدا کرتا ہے لیکن اسی مادی تھیر کے درجہ اس کا شعور بدل ہے۔ یہ بھی نہیں ہوا کہ خمیر میں انقلاب آجائے اور دنیا کا نقش بدل جائے۔ درجہ پیداوار میں تھیر انسان کے عقل کی راہیں بدل اور اس کے غور فکر کے طریقے خمیر کرتا ہے اس پر فلسفیانہ انداز میں بھی بحث کی جاسکتی ہے۔ تاریخ کا مطالعہ اس حقیقت کو زیادہ آسانی سے ذہن نشین کرائے گا۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہاں فکر اور شعور کی اہمیت کا انکار قصود نہیں ہے بلکہ اس کی پیدائش اور طریق عقل کا سوال ہے اور جس حیثیت سے بھی دیکھا جائے یہ مطوم ہوگا کہ انسانی شعور عام معاشی، معاشرتی تھیورات کی مد میں بدل اور ہی رہا ہے کامزن ہوتا ہے اگر یہ بات صحیح ہے تو ادب کا کام بھی یہی رہا جاتا ہے کہ وہ انسانی شعور کو وسیع تر کرے لیکن یہ نہ بھول جائے کہ انسانی شعور خاموشی حالات کے بدلے سے بدل ہے۔ عقل کسی معصب کے کہ دیتے یا کسی فکار کے ظاہر کر دیتے سے نہیں بدلے۔ انہی ادب تہذیب کی بناء اور ارتقاء میں شریک ہو جاتا ہے۔

پیش سے زیادہ اس وقت ادب اور ادب آزمائش میں جلا ہیں کہ کد جنگ کے خطرات کی وجہ سے تہذیب کی بناء خطرے میں ہے۔ غیر معمولی مادی ارتقاء کی وجہ سے یہ ناہ کیر معمولی امکانات کا حامل ہے۔ کہیں یہ مادی ارتقاء انسان دوستی امن اور انسانی بہبودی کے کام میں لاوا جا رہا ہے اور کہیں اس کے برعکس طبقاتی مفاد کو برقرار رکھنے اور مضبوط جانے کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔ ادیبوں کو اپنی راہ منتخب کرنا اور قومی زندگی کے ان تہذیبی

حاضر کو ابھارتا ہے جو تنہا کو بچانے میں معاون ہوں گے۔ یہ فعل ان خالق کی روشنی میں کرنا ہو گا جو تاریخ فراہم کرتی ہے اور جس سے منہ موڑ کر ادب کھل کو کھل الخراہی طواہشات کا ترجمان بن کر رہ جائے گا اور اس کے الفاظ ان کو نوا سینوں میں دھڑکن پیدا نہ کر سکیں گے جو امن اور ارتقاء دہائے انسانی اور دہائے تنہا کے لیے بدوعدہ کر رہے ہیں صرف یہی ایک صورت ہے جس سے ادب قوی رہے جسے بھی انسانی تنہا کا جز بن جاتا ہے اور ہر اعلیٰ کارنامہ تنہا عالم کے خزانے میں جگہ پاتا ہے۔

فہم فیض الاسلام کی فکر انگیز کتابیں

فلسفہ کے بنیادی مسائل

تاریخ فلسفہ مغرب

ناشر: میسنڈ بک فونڈیشن، کراچی

وجودیت

ناشر: شعبہ تصنیف و تالیف، کراچی یونیورسٹی

ٹاں پاں سار کی غور زشت کا ترجمہ

”نامہ الفاظ“ میں قسط دار شاخ ہر دا ہے

ادب کا مادی تصور

ادب اور فنون لطیفہ کی دوسری شکلوں کا خواب کثرتِ تعبیر سے پیش پریشان رہا ہے۔ کسی قسم کی مادی بنیاد کو تسلیم نہ کرنے کی وجہ سے ادب کی دنیا اکثر و بیشتر خواب و خیال کی دنیا سمجھی گئی جس کی نہ تو راہیں تھمیں ہیں اور نہ سے مقرر ہے یعنی ادب اپنے جدات اور خیالات کے اظہار کے لیے آزاد ہے اور کوئی ضرورت نہیں کہ ہم اس کے جذبات اور خیالات کی بنیادوں کی جستجو کر کے اسے کسی قسم کا مشورہ دیں کیوں کہ خیالات کی غیر مادی نوعیت اور جذبات کے بے مددک بناء سے الگ کوئی معنی نہیں رکھتا، لیکن خیالات کی یہ رفتار بہت دلوں تک قائم نہ رہ سکی، تاریخ اور سماج کے مطالعہ نے بتایا کہ خیالات اور ان کے لمبی مظاہر بھی انسان کی مادی زندگی کے مزاج و نوال سے تعلق رکھتے ہیں اور انسان جس طرح کا سماجی اور معاشرتی نظام رکھتا ہے اسی کے مطابق اس کے خیالات اور شعور کا ارتقاء ہوتا ہے۔ اس تاریخی حقیقت نے اس فلسفہٴ اصول کی طرف رہنمائی کی کہ انسان کا مادی وجود اس کے شعور کا تعین کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ذہن حقیقتوں کا حلقہ نہیں ہے بلکہ مادی حقائق خود ذہن کی تخلیق کرتے ہیں اور انسانی ذہن سے باہر ان کا ایک مادی وجود ہوتا ہے۔ اس اصول کو پیش نظر رکھ کر دیکھیں تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ ادب کے تخلیقی کارنامے ان حقیقتوں کا عکس ہوتے ہیں جو سماج میں پائی جاتی

ہیں ہوسکتے ہیں کہ کوئی ادب اس قلعے سے واقف نہ ہو لیکن پھر بھی اس کی حقیقت میں وہ
 تحقیق کسی نہ کسی شکل میں نمایاں ہوں گی جو اس کے گرد و پیش ہیں جو اس کے ذہن کی
 تحصیل کرتی ہیں۔ یوں رکھا جائے تو خیال اور شعور کی حیثیت بھی مادی ہو جاتی ہے اور ادب
 ادب کے مادی تصور پر غور کیا جائے گا تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ ادب میں جن جذبات
 حیات اور تجربات کا تصور کیا گیا ہے ان کے مادی اور سماجی پس منظر کو پیش نظر رکھا
 جائے۔ تاریخ کی حقیقت کی اصل بنیاد کا علم ہو سکے۔ بعض لوگوں کے خیال میں یہ ایک مطلوبہ
 جذبہ ہے۔ ایک مفہوم بھی مان لیں تو نقصان نہیں ہوتا کیونکہ سماجی تاریخ نظریات کی
 بنیادوں میں اس طرح کوئی چیز ہے کہ مطلوبہ حقیقت بن جاتا ہے۔ انسانی افکار و خیالات کی
 تاریخ اس کام سے بے غایت ہے۔

ادب کے گرد و پیش کی دنیا اس کا حسن اور اس کی بد صورتی اس کی تکلف اور اس کا
 الجھو اس میں بننے والوں کی امیدیں اور باہوسیاں، خواب اور انگلیں، رنگ اور روپ،
 بار اور خزاں اس کے موضوع بنتے ہیں اور مختلف تاریخی ادوار میں انسانی جذبات سے ان
 کا تعلق بدلتا رہتا ہے۔ انسان کی معاشی زندگی اور اس کی پیچیدگیوں کے ساتھ بدلتا رہتا
 ہے یہی وجہ ہے کہ ہر دور کا ادب اپنا مخصوص رنگ رکھتا ہے جس طرح ہر دور کا شعور اپنی
 نفس میں صحت رکھتا ہے یہی نہیں بلکہ ہر ادب کے شعور کے مطابق ایک ہی دور کے ادبی
 دارناہوں میں فرق پایا جاتا ہے اس طرح ایک بات اور واضح ہو جاتی ہے معاشی زندگی اور
 طریقہ زندگی اور ارتقاء اور ادبی شعور میں تعلق تو لازمی طور پر ہوتا ہے لیکن یہ تعلق
 ایک سیدھی لکیر کی طرح واضح اور حسین نہیں ہوتا۔ اس تعلق کو تلاش کرنے کے لیے کسی
 غفرت دور کے معاشی احاطے اور اس احاطے پر بننے والی زندگی اور اس کی تاریخ کو
 جان کر ہی عمر سے دیکھنا چاہئے۔ اسی کے ساتھ ایک ایک ہر ادب کے شعور کا مطالعہ بھی
 اس عمر سے کیا جائے کہ اس کا تعلق سماجی ارتقاء کے ساتھ کس قسم کا ہے۔ فلسفیانہ کے
 بعض مبانی نے اس مسئلے کو خالص مینا کی نظر سے دیکھا ہے اور اس حقیقت کو نظر انداز
 کر دیا ہے کہ مادی حالات انسان پر اثر انداز ہوتے ہیں لیکن صرف انسانی طور پر نہیں بلکہ
 انسان طرزِ سماج اور فطرت کے خلاف جو جدوجہد کر کے مادی حالات میں تعمیر پیدا کرتا ہے اور
 حالات بدلنے کے دوران میں خود بھی بدل جاتا ہے یہ عمل مینا کی طور پر اثر نہیں کرنے سے

بالکل مختلف ہے۔ ایک صورت میں انسان بالکل بے اختیار نظر آتا ہے۔ دوسری صورت میں
 باشعور اور صاحب اقتدار دکھائی دیتا ہے۔ ادب کی ساری اہمیت اس وقت تک سمجھ میں نہیں
 آسکتی جب تک ہم ادب کو باشعور نہ مانیں اس لیے ادب کا ادبی تصور سب سے پہلے اس
 حقیقت پر لاوردیتا ہے کہ ادب انسانی شعور کی وہ تخلیق ہے کہ جس میں ادب اپنے ذہن سے
 باہر کے ادبی اور خاموشی خالق کا عکس مختلف شکلوں میں مختلف لہجے اور محالوئی تقاضوں
 کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ عکس ڈیوگراف کی طرح ساکن نہ جاتا بلکہ
 نہیں ہوتا بلکہ متحرک اور زخمی جھجکوں کا متحرک عکس ہوتا ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی مخصوص دور کے ذرائع پیداوار اور اس دور کے
 ادب یا فنون لطیفہ کا رشتہ کس طرح ظاہر ہوتا ہے اس کو واضح ہونا چاہیے۔ اگر ہم اس کو
 مثال سے سمجھنا چاہیں تو اس کی ایک اچھی مثال ابتدائی انسانی تاریخ میں مل سکتی ہے جہاں
 تاریخ پیچیدہ نہیں تھا۔ ذرائع پیداوار اور سیدھے سادے تھے۔ ایک ساتھ لے جل کر کام کرنے
 میں ابتدائی انسان کو اندازہ ہوا کہ ایک کھجک کے ساتھ کام کرنے، مخصوص جسم کی تواناییں
 نکالنے اور جسم کو ایک خاص طرح حرکت دینے میں کام جلد بھی ہوتا ہے، کھنک بھی کم ہوتی
 ہے اور اچھا بھی معلوم ہوتا ہے اس لیے ان حرکات و سکنات کو اردوں اور ہولوں کو انھوں
 نے اپنے کام کے طریقوں اور ذہنی تفریح کے ذریعوں سے وابستہ کر لیا، ایسا زبان رقص،
 موسیقی اور شاعری کی بھری نگر فطری ابتدا تھی جس کا تعلق براہ راست پیداوار کے ذرائع
 سے تھا۔ تاریخ اور ادب پیداوار میں جتنی پیچیدگی بدھتی تھی فنون لطیفہ اور ادب سے ان کا
 تعلق بھی پیچیدہ ہو گیا۔

اس سلسلہ میں ایک اور بات یاد رکھنا ضروری ہے۔ ذرائع پیداوار اور ادب کے رشتہ
 کو تسلیم کرتے ہوئے یہ ماننا غلط ہوگا کہ دونوں کے زوال یا ارتقاء کی سطح بھی یکساں اور
 تناسب ہوگی۔ کسی ملک کی تاریخ دیکھی جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ معمولی ساری ارتقاء کی
 سطح میں بھی ادب پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ غلامی کے عہد میں افلاطون، ارسطو، ایس
 کائی لیس اور ہمد پینڈیڑی کو نہیں بلکہ ہر ملک کو بھی ختم ہوا۔ یہ سمجھنا بھی درست نہ ہوگا کہ
 ایک عہد کا ادب اسی عہد کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے اور نئے عہد میں ماضی سے سارے
 رشتے توڑ کر نیا ادب سر اٹھاتا ہے۔ اس کی ایک کھلی ہوئی وجہ تو یہ ہے کہ عہد کے

پیداواری رشتے دوسرے عہد کی انقلابی حریف میں داخل ہوتے ہوتے بہت سی محدود اور
 ارتقائی حریفوں سے گزرتے ہیں اور انسانی ذہن جب تک پوری شعوری کوشش سے تعمیر کی
 تکلیف کو نہ سمجھے 'ایک دور کا دوسرے دور سے الگ کرنا اس کے لیے دشوار ہو جاتا ہے۔
 کسی عہد کے تمام ادیب شعور کی ایک ہی سطح پر نہیں ہو سکتے، انہوں پر خاندانی، طبقاتی اور
 سماجی ورثوں کا بوجھ ہوتا ہے جسے زندگی کی تکلیف کو سمجھنے، بلکہ انداز پیشکش تقریباً ناممکن ہے اسی
 لیے کہا گیا ہے کہ جب ایک وطن، ایک معاشرہ، ایک زبان میں تبدیلی آتی ہے تو آسانی سے فحش نہیں ہو جاتی
 اور معاشی، ادبی، سماجی کے بدل جانے کے بعد بھی باقی رہتی ہیں۔ جو لوگ ادب کی مادی ترسائی پر
 الزام لگاتے ہیں کہ اس طرح ادب کو ادب کے نقضہ نظر سے دیکھنے کے بجائے محض معاشی
 تعمیرات یا طریق پیداوار میں تبدیلی ہو جانے والے اثرات کے ماتحت دیکھا جاتا ہے وہ در
 حقیقت اس رشتے کے مفہوم کو نہیں سمجھتے۔ اصل بات یہ ہے کہ مادی حقائق زبان "اسلوب"
 انداز بیان اور محسوسات کے اچھے دائروں سے گزر کر ادبی فکر اختیار کرتے ہیں کہ انہیں
 پہلے مائنس کا سطح پر رکھ کر نتائج نہیں نکالے جاسکتے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ گرو ادب کی تخلیق
 میں ادیب کا وہی مادہ اور وہی شعور سرگرم عمل رہتا ہے جس کی تعمیر تکمیل ادبی معاشی
 حالات سے ہوتی ہو۔ لیکن دوسرے اثرات بھی اپنا نقش چھوڑتے رہتے ہیں جس مادی طبقے
 کے نقضہ نظر سے اس وقت تک کی تنقید کی گئی ہے اس نے اس پر بھی زور دیا ہے کہ ادب
 کے مطالعہ کے لیے جو بنیادی انداز نظر اختیار کیا جاتا ہے وہ خود اسی مادی نظام کا اثر ہے
 ہوتا ہے جو طریق پیداوار سے وجود میں آتا ہے اس سے بہت سے وہ عناصر جو بظاہر معاشی
 اسباب سے بے تعلق نظر نہیں آتے اور مذہبی، فلسفیانہ، تہذیبی یا ادبی روپ اختیار کر کے
 ادبی تخلیق میں کار فرما ہوں گے ان کو بھی انہیں ادبی حقائق کا جز قرار دینا ہو گا۔ جمالیاتی
 احساس خود اس مادی وجود کے دائرے کے باہر نہ جاسکے گا جو موجود ہے 'ہاں اس وقت اپنے
 اس میں تبدیلی ہوگی جب واقعی زندگی کے بنیادی عناصر میں تبدیلی کی ضرورت کا احساس
 ہو گا۔

یہاں پہنچ کر اس بات کو واضح طور پر سمجھ لینا چاہئے کہ علمی حیثیت سے مادی نقضہ نظر
 کا پتہ یونانی فلسفیوں ہی کے زمانے سے چلتا ہے کیوں کہ اگر ایک طرف اٹھارویں صدی کی
 جنوادی زندگی کے مادراء کسی ان دیکھیں دنیا میں کرنا تھا تو دنیا کی مادی طور پر سب اور

نتیجہ کے تعلق پر زور دیتا تھا، کسی نہ کسی شکل میں میسٹ اور ماسٹ میں ٹکرائی، اس وقت تک جلی آری ہے اور ہمیں بدل بدل کر غلط فہمیاں سامی اور ادبی تحریکوں میں ظاہر ہوتی رہتی ہے لیکن جس غلطی نے عمل طور پر دلوں کو الگ کر دیا اور فقیر کا ایسا مادی اور سائنٹیفک نظریہ پیش کیا جس سے ہر جگہ ان کی شکلیں پکائی جائیں وہ مارکسزم ہے۔ اس وقت تک جس مادی نقطہ نظر کا ذکر کیا گیا ہے وہ کم و بیش اس پر مبنی ہے اس فلسفے کے تابع اور مہملوں نے اس کو ساج کے بھی مظاہرہ صلیق کر کے دیکھا ہے اور خاص کر اوپ کی مادی بنیادوں کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے جب بھی ادب کے مادی تصور پر غور کرنے کی ضرورت ہوگی تو اسی فلسفے کے اصولوں کو سامنے رکھنا ہوگا کیونکہ دوسرے مادی اور مہملوں فلسفے فقیر کے تمام پسوہوں کو ایک ساتھ حرکت کرتے ہوئے نہیں دیکھتے۔ ہر حال ادب چونکہ ظاہر ایک فرد کے ذہن سے نکلا ہوا کارنامہ معلوم ہوتا ہے اس لیے عام طور پر لوگ اس کی مادی حیثیت پر غور کرتے ہوئے الجھن محسوس کرتے ہیں۔ ان کے دل میں اس طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ جب ادب فرد کے خیالات کا نتیجہ ہے تو اس میں اجتماعی مادی حقائق کی جستجو کرنا کہاں تک درست ہوگا؟ کیا فرد اور ساج میں تصادم نہیں ہوتا؟ کیا یہ ضروری ہے کہ فرد اجتماعی زندگی کا پابند ہو؟ تصور پرست اور نظریات پرست فلسفیوں اور مفکرین نے طرح طرح کے سوالات پیدا کئے ہیں اور مادی نقطہ نظر پر بھی اعتراض کیا ہے کہ اس میں فرد اور شخصیت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے یہ اعتراض بھی بے بنیاد ہے کیوں کہ فرد کو ساج کے ہر ایک وحدت سمجھ کر اس کے خیالات اور تجربات کو سمجھنے کی کوشش ہے سو ہوگی۔ خیالات انسانی ذہن میں خامی اور مادی حقیقتوں کے عکس کی حیثیت سے نمودار ہوتے ہیں جنہیں انسان کا شعور یا خواہشوں سے ہم آہنگ پاتا ہے مخالف کسی قدر ہم آہنگ پاتا ہے اور کسی قدر مخالف نہیں قبول کرتا ہے۔ اور یہ عمل کسی نہ کسی قسم کے جذباتی ذہنی یا مادی سکون کے لیے ہوتا ہے کم سے کم ایک مادی انسان ہی کرتا ہے اور اس طرح اس مادی واقعہ میں کہا جاتا ہے جس میں اسی کی طرح کے اور انسان ملتے جلتے سوچتے اور عمل کرتے ہیں اور اس کا رشتہ اپنے طبقے سے جہت یا خفی شکل میں قائم ہو جاتا ہے۔ مادی فلسفہ میں تو انسان ہی سب کچھ ہے۔ اسے کسی حالت میں نظر انداز کیا ہی نہیں جاسکتا۔ ہاں اس میں کسی ایسے انسان کا تصور البتہ نہیں کیا جاسکتا جو کسی خاص ان مگر وہ طبقہ یا ساج سے تعلق ہی

نہ رکھتا ہو۔ چونکہ یہ سارے رشتے معاشی اور سماجی ہیں اس لیے ہر ادیب کو بھی اسی مسئلہ پر
 پہنچنا پڑتا ہے اور اس کے تخلیقی کارناموں کو نیاں — نیاں خیالی مائے کے بعد بھی اسے
 سماجی رشتوں سے باہر دیکھنا نا ممکن ہو جاتا ہے۔

یہاں س بات کی وضاحت غیر ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مکمل اشتراکی سماج کے مطالعہ
 پر سماج اپنے ذرائع پیداوار کے لحاظ سے طبقات میں بنا ہوا ہوتا ہے اور عام طور پر ہر شخص کا
 ذہن اس کے طبقاتی مفاد سے وابستہ ہوتا ہے لہذا یہ کوئی لازمی بات نہیں ہے۔ انسان اپنی
 شعوری کوشش سے اپنے طبقاتی تصورات چھوڑ سکتا ہے۔ ایسی حالات میں اس کا طبقہ نہ قطع
 ہو جائے گا جس کے مفاد کے لیے وہ جدوجہد کرتا ہے اور چونکہ ذرائع پیداوار پر قطعہ رکھنے
 والوں اور محروموں میں اپنے حقوق اور مفاد کے لیے تکلیف جاری رہتی ہے اس لیے عام طور
 سے یہ بات تسلیم کرنی جاتی ہے کہ کسی — کسی نسل میں ادیب کے شعور نے بھی اس تکلیف کو
 اپنے ادیب پارے میں پیش کیا ہو گا۔ ادیب اگر طبقاتی شعور نہ رکھتا ہو گا تو اس کا اعتبار بھی
 بہت واضح شکل میں نہ ہو گا کیوں کہ مادی قطعہ لا شعور کی اہمیت کو تسلیم نہیں کرتا اس لیے
 محض معمولی حد تک ادیب کے لا شعوری عمل کو پیش نظر رکھتا ہے۔ تحلیل نفسی میں اسے جو
 اہمیت حاصل ہے وہ مادی قطعہ کی ضد ہے اور انسانی قدرت کو ایک ناقابل حل مسئلہ بناتی
 ہے جو محض جبر کے سارے عمل اور زندگی کی خوشیں ملے کرتی ہے۔

ادیب کی طبقاتی نوعیت ہی کے سلسلہ میں یہ بحث بھی افسی ہے کہ ماضی کے اعلا ادیبوں کے
 تخلیقی کارناموں پر کس طرح نگاہ ڈالنا چاہئے کیا ادیب کی طبقاتی نفسیات اسے بالکل مجبور
 کرتی ہے کہ وہ حقیقت کو اسی طرح دیکھے یا وہ غامضی یا حقائق کی تصویر کشی اپنے شعور کی
 نل کے مطابق کرتا ہے؟ اس سوال کے جواب پر کلی باتوں کا دارومدار ہے۔ اگر ادیب محض
 اپنے طبقے کی نفسیات پیش کرنے پر مجبور ہے تو ہر سماج میں اس کی اسے داری کا بھی کوئی سوال
 پیدا نہ ہو گا اور ادیب صرف طبقاتی نہیں ایک طرح کے روحانی جبر کا بھی مظاہر ہو گا۔ اگر ہم
 اسے صحیح تسلیم کر لیں تو ماحول اور ادیب کا یہ تعلق ہر ایک مپکا کی شکل پیش کرتا ہے جس
 میں ادیب ایک معمول حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ ادیب کا مادی تصور ادیب سے ہر دور کے
 حقائق کی روشنی میں واقعات کو اس طرح پیش کرنے کا مطالبہ کرتا ہے کہ اس دور کی (یا جس
 دور کی وہ ترجمانی کرتا ہے) ساری تمدنی تکلیف لکھوں کے سامنے آجائے اور یہ محسوس ہو

کہ ادب نے اپنے طبقاتی تنگ نظری سے بلند ہو کر نفاذِ مکمل حقیقت کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ماضی کا ادب اسی طرح حال کا ترقی ورڈ بننا ہے۔ معروضہ ادب، لہجہ اور تنصیب اسی وقت خفیہ اور اعلیٰ بن سکے ہیں جب اُممیں، ماضی کے سارے انسانی سرے سے فیض حاصل کرنے کا موقع ملے۔ اچھے حکاموں نے ہر دور میں طبقاتی جدوجہد کے ظلم کو ذکرِ عام انسانوں کے دلوں کی آرزوئیں حسین الفاظ اور رنگین عکسوں میں پیش کی ہیں اور اس طرح انسانی سرا۔ تنصیب میں اضافہ ہوتا رہا ہے اسی وجہ سے ادبیت پسند قلبی اور مفکر ادیبوں سے اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے ذہن کی گری اور نظم کی طاقت کو محنت کش عوام کی ترجمانی اور خدمت کے لیے وقف کر دیں۔

ہر لوگ اپنے طبقاتی مفاد پر اپنی بکری کی وجہ سے اس نکتہ نظر کے خلاف ہیں وہ ادیبوں سے "خالص ادب" کا مطالبہ کرتے ہیں، اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ ایک ناممکن بات کا مطالبہ ہے کیونکہ ادب کا موضوع جیسے ہی انسان بنتا ہے وہ کسی نہ کسی نکتہ نظر کا ترجمان بھی بن جاتا ہے۔ ادب لاکھ غیر جانبدار رہنے کی کوشش کرے اس کے کردار اس کا موضوع اس کے خیالات کسی نہ کسی قسم کی جانبداری کا پتہ ضرور دیتے ہیں اور ہدیہ نگار سے بچنے کے دھوکے میں وہ بعض دوسری باتوں کا پتہ بھی لگا کر دیتا ہے۔ ادبیت سے متاثر ادب شعوری طور پر جانبدار ہوتا ہے یہ جانبداری سیاسی، سماجی، ترقیاتی، قلمی یا کسی فعل میں بھی نمودار ہو سکتی ہے۔ وہ اس جانبداری سے ڈرنا یا شرمندہ بھی نہیں ہوتا کیونکہ وہ کسی قسم کی نا اصدائی، "علم" انسان دشمنی، "ماجی" بد صورتی یا تنگ نظری کا ترجمان یا نمائندہ نہیں ہے بلکہ ان قدروں کی اشاعت کر رہا ہے جو عام انسانی سرسوں میں اضافہ کرتی ہیں۔

ادب کی سطحوں میں لہجہ، ادبیت کے جمالیاتی نکتہ نظر کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے، فطرت میں حسن، انسان میں حسن اور زندگی میں حسن کا اعلان انسان نے اپنی عملی زندگی میں سیرت کے اضافہ کے لحاظ سے کیا ہے۔ اس کے دل میں جو احساس حسن پیدا ہوتا ہے وہ خارجی عقائد کے شعور اور ادراک کا نتیجہ ہے جسے انفرادیت سے مکرر کر اجتماعی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ موضوع اور مواد کا حلقہ، اسلوب، فہم اور فنی خصوصیات سے کیا ہے؟ اس کو بھی اسی فکر سے دیکھنا چاہیے۔ فنی خصوصیات کا ارتقاء بھی موضوع کا صحیح اور نفاذ

سے لڑا اور پر اثر شعور حاصل کرنے کے لیے میں ہوا ہے اور دونوں کا مطالعہ ایک ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح ادب کا مادی تصور ہر ادبی مسئلے کا جائزہ لیتا ہے اور ادب کو انسانی سماج اور تہذیب میں وہ جگہ دلاتا ہے جس کا تعلق اس انسانی شعور سے ہے جو سماجی، معاشرتی اور طبقاتی ارتقاء سے وجود میں آیا ہے اور سماجی رشتوں کے بدلنے سے بدل سکتا ہے۔ اس نکتہ نظر کے تسلیم کر لینے سے اہم نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ ادب سماجی اور تہذیبی ارتقاء کی نگاہ اور غیر متکلیف حیات کی جدوجہد میں ایک ذرا دار، باشعور اور حساس فرد کی حیثیت سے شریک ہوتا ہوا مسطور ہوتا ہے جس کی کاوشیں سیاسی، سماجی اور ماحولنگ کام کرنے والوں کی طرح اہم ہوتی ہیں۔

اس مادی بحث سے جو ادبی اور تنقیدی نکتہ نظر وجود میں آتا ہے اور جو ادبی حقیقت اور متحدہ دونوں کے لیے ایک اصول کی حیثیت سے کام میں لایا جاتا ہے اسے اشتراکی حقیقت پسندی یا سماجی حقیقت نگاری کہہ سکتے ہیں۔ فنی اعداد کا یہ اصول ہر فنکاری و رہنمائی کر سکتا ہے۔ حقیقت نگاری کی مختلف تعبیریں پیش کی گئی ہیں جس سے مختلف اور بعض اوقات متضاد نتائج برآمد ہوتے ہیں اس لیے اس حقیقت پسندی کو جو مادی تصور تاریخ سے پیدا ہوتی ہے اور دوسری طرح کی حقیقت نگاریوں سے الگ اور ممتاز کرنے کے لیے اشتراکی یا سماجی کی تعبیر ضروری قرار پائی۔ اس انداز نگار یا اصول کا مقابلہ یہ ہے کہ فنکار کو حقیقت کا ادراک اس طرح کرنا چاہئے کہ حقیقت اپنی ارتقائی اور انتہائی شکل میں تمام تاریخی اور مادی پہلوؤں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اس کے فن میں مشغول ہو۔ اس کی یہ کاوش انتہائی نہیں ہو بلکہ لا محالہ اس کا مقصد یہ ہو گا کہ عوام کے شعور میں اس فن کے مطالعہ سے ایسا فہم پیدا ہو جو اشتراکیت کی پالی، فنی اور برتری کے تصورات کو راجح کرے۔ یہ ظاہر ہے یہی مادی یا ہات مسطور ہوتی ہے لیکن جب کوئی ادیب یا نگار اسے تسلیم کرے گا تو اسے ہر حقیقت کی نوعیت، نوعیت اور سماجی اہمیت کا اندازہ کرنا ہو گا، سماج کے نفسیاتی عناصر کو دیکھنا ہو گا اور واقعات کی بنیادوں کو سمجھنا ہو گا اسی وقت وہ یہ جان سکے گا کہ کون سے حقائق زندگی کو کس جانب لے جا رہے ہیں اور لے جاسکتے ہیں۔ ہر کوئی بولتی ہوئی اور متحرک دنیا میں حقائق کی اصل نوعیت کا گرفت میں لانا آسان نہیں، دی فنکار یا ادیب اس سے اچھی طرح مدد برآ ہو سکتا ہے جو جدید تاریخی نکتہ نظر رکھتا ہے اور حقائق کے سمجھنے میں اس سے کام لیتا ہے۔ ظاہر

ہے کہ یہ چھ حقیقت نگاری کے معمولی تصور سے بالکل مختلف ہے۔ اس میں تاریخی حقیقت، احساسِ فن اور تصورِ زندگی سب مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ یہی ادیب کا ادبی تصور ہے جو فن کے تخریج کا مخالف نہیں ہے، جدت پر اسے جدت اور حقیقت پرستی کا مخالف ہے، جو ادیب کے کہہ کئے پن ہے، اثراتی، میکائی اور بے رنگ حقیقت نگاری اور بے مقصدی کا مخالف ہے۔ یہی ادیب کو جاندار، ظہورِ انسان دوست بنانے کا تصور ہے۔

ممتاز فاضل تنگوار، ادیب و صحافی
قیصر تمکین کے اسم کتابیں

۱۔ سواستیکا (افانوں کا مجموعہ)

پتہ، اردو پبلیشرز، اردو بازار، لاہور

۲۔ خبر گیر

قومی آواز، روزنامہ، لاہور
پتہ، لاہور
مشاورت و خدمات، لاہور

پتہ، مکتبہ میری لائبریری، اردو بازار، لاہور۔ ۲

موجودہ ادبی صورت حال

تاریخ سیاست کی ہو یا فلسفے کی، سماجی اراکوں کی ہو یا ثقافت کی، فن کی ہو یا ادب کی، بلوں، ایام سے پیدا ہونے والی مل جل کا بیان ہی ہوتی ہے۔ ادب کے میدان میں یہ مل جل فرد کے جذبے اور شعور کے وسیلے سے تاریخ کا جز بنتی ہے اور ادب انفرادی طور پر اپنے نچ کو جتنا آزاد بنانے کی خیالی کوشش کرتا ہے، اتنا ہی باہر سے اندر کی طرف منتقل جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بھی بھی اس کا رشتہ زندگی کے اصل دھاریوں سے ٹوٹ جاتا ہے اور اس کا ادبی سرمایہ محدود ہوا لگتا ہے۔ جب تک آزادی کی جدوجہد چلتی رہی، تمام دہائی اور جذباتی قوتیں اس مسئلے پر مرکب رہیں، آزادی ملی، تو اس زندگی کی تلاش شروع ہو گئی جو پر امن ہو سکے۔ اس میں بہت سے حجاب ٹوٹے اور بہت سے مصنفین کی بصورت سے ہی عقیدت ختم ہو گئی۔ فرقہ وارانہ بلوے، ترقی پسندانہ خیالات کی مخالفت، غیر ملکی سرمایے پر بدھت، ہوا انحصار اور اسی طرح کے بہت سے رجعت پسندانہ رجحانات بڑے جوش و خروش سے ابھر کر سامنے آئے، ہندوستان کی تقسیم، آزادی کے بے لڑائی لڑنے والی جماعتوں کی کٹھناری اور سیاسی طاقت پانے کے بے آہن کی کلکشن، خود غرضیتوں کا اخلاقی روال دیا، اس طرح جمع ہو گئے کہ نئی جہمی نے اپنی روایات پر احاطہ کھو دیا۔ دوسری لڑائی کے بعد یورپ اور امریکہ ہم دامنہ کی جس لہروں میں ڈوبتے ابھرتے رہے، انہوں نے سوچ بچار کے پرانے

روحانیت کو نیا روپ دیا۔ ایک طرف سائنس نے حقیقت پسندی کی طرف کھینچا تو دوسری طرف نفسیات کے مختلف خیالات نے ان جانی و ناخوشی پسندی کشمکشوں اور سائنسی حاصلات سے نکلنے والے نکتہ سے دور کر دیا۔ یہ خیالیں اُنھیں ہو گیا کہ کوئی کی اپنی ذاتی طاقت نہیں ہوتی سے سائنس 'سیاست' 'روایت' 'اشتہار' 'مصلحتی زندگی' نے ایک تار میں ہانڈہ رکھا ہے اور زندگی کے ایک ایک لمحے میں وہ اپنی طاقت اور شخصیت کے پھانے کی کوشش میں لڑتا ہے اسے کسی مذہب سیاسی نظریے کسی سبب طائفے زندگی کے نصب العین پر مجبور نہیں رہ گیا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ نئی نسل کے مصنف اور شاعر اسی میں کھو گئے ہیں۔ زندگی کو اجتماعی حیثیت میں دیکھنے ایک متقبل انسانی زندگی کے سیاسی تسلسل کو دھوڑ ڈالنے کی فکر کم ہو گئی۔ پھر بھی جہاں تک ہندوستان کے تاریخی حالات کا تعلق ہے ابھی ہر زبان میں اہل قلم بڑی تہاد میں مہم ہیں جو زندگی کے بنیادی وجود پر مجبور سا دیکھتے ہیں اور اپنی قوتوں کو نوع انسان کی خدمت میں نذر کر دینا چاہتے ہیں۔ آج اس کشمکش نے فن اور ادب میں پھر ایک حرج فن برائے فن یا فن برائے زندگی کی کثیرا بکثرت نزاع کی شکل اختیار کر لی ہے جسے نئی فلسفہ عبادت میں ٹھیک کیا جا رہا ہے۔

اور ادب میں ترقی پسندی اور انسان دوستی کی روایتیں سختی محکم رہ چکی ہے۔ اس کا اعتراف اس جمل تاریخ سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ جا ہے وہ شریو دھرم 'اس وقت بھی وہی نام پہلے لے جاتے ہیں۔ جن کا ذکر گزشتہ باب میں کیا گیا اور جو آج بھی جانے مانے جاتے ہیں۔ جیسے کرشن چندر، بیوی، خواجہ احمد عباس، صحت، سہاد ظہیر، احمد ندیم قاسمی، انیس، مرزا انصاف، احمد سہرا، حیات اللہ، سردار جعفری، فیض، ہدلی، آزاد، کفلی، جمیل، مکتبی، وہد، تاہاں، اختر انصاری، رفیع، یہاں ان کے بارے میں بس اتنا ہی کہتا ہے کہ یہ اردو ادب کی ہوا جوں کو شعوری طور پر پیش نظر رکھتے ہوئے موجود مسائل اور آج کے بدلتے ہوئے سماج کی کدوئوں کو بھی نظائر ان قوت کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ وہ نئی زندگی کے درمیان اور نظائر ہیں اور فن میں نئے تجربہ اس طرح کرتے رہتے ہیں کہ نہ ان کے خیالات ایمان پرستی میں کھو جائیں نہ ان کے کارناموں کو عصری شعور کے خلاف کہہ سکیں اس طرح ادب کے عمارتوں رواں دواں ہیں جو زندگی کے گہرے سماجی شعور سے نکلے ہیں۔

معاصر اردو ادب میں شاعری تجرہ پرستی، ایمان پرستی، علامت پرستی اور لامتناہی

سے بہت زیادہ متاثر ہوئی ہے، یہاں تک کہ نئی شاعری لکھنے والے اپنے آپ کو سب سے
 اہم کرنے کے لیے شاعری کی ایسی روایات سے ہٹا دیتے ہیں، یہ اور بات ہے کہ
 ان کا تشدد شعر و رباعی اور امریکہ کے کچھ غلیظوں، مصنفوں اور شاعروں سے مل جاتا ہے اور
 جو کچھ وہاں ہو چکا ہے اسی کو دہرائے کی کوشش کی جاتی ہے، بدلتی ہوئی صورت حال میں جدید
 شاعری کا جنم قدرتی ہے۔ مگر محض مدنی شاعری کوئی کسے کا اصرار سمجھ میں آنے والی بات
 نہیں ہے، جو زندگی کی قدروں کا مطالعہ کرتی ہو اور مادی شعور کو شاعری کی راہ میں روڑا
 سمجھتی ہو۔ اس شعراء میں جو جدید شاعری کی تحریک میں شامل ہیں، کچھ وہ ہیں جو پہلے دنیا ترقی
 پسند کے جانتے تھے یا صراحتاً امریکہ کے مادی تخیلات سے متاثر تھے۔ کچھ ایسے ہیں جو مادی شعور
 کی کالٹ نہیں کرتے ہیں مگر شاعری کے لیے نئے تجزیوں اور نئے وسائل اٹھارہ زور دیتے
 ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو 'دیان' خیال' فن' کے سب سے مبالغوں کو توڑنا اپنے مقصد کے
 ثبوت کے لیے ضروری سمجھتے ہیں وہ اس بات کو نہیں مانتے کہ کوئی شاعر اپنے احساسات کو
 'نیاں' میں کسی طبع ظاہر کر سکتا ہے، اس لیے ابلاغ ہمیشہ نامکمل ہی رہے گا۔

زبان اور علامات کے یہ سب سے تجربے نئی شاعری پر ہو رہے ہیں، اس لیے اب یہ کہنا
 دشوار ہے کہ ادب کی تاریخ میں اس نئی شاعری کو کون سا مقام دیا جائے گا اور مستقبل میں
 اسے کون سی شکل ملے گی۔ اس کے بعد بھی اسے ابھی صرف تجربے ہی سمجھتے ہیں، جو حدِ حاضر
 کی بے چینی اور سرسبز، مادی تخیلات کے باعث تیار ہے۔ مگر یہ ان جدید شعراء کی
 نقد و کافی بنی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی ہر صفت حقیقت حاصل ہو سکتی ہے۔ مختصراً
 انہیں کا تذکرہ کیا جائے گا۔

جی۔ ایچ۔ ڈی۔ - نئی زبان شاعری کی کالٹ میں ایک نہ تو بڑا ہی کے متوازی بل
 ریاضیاتی ہے، اس کی صورت، اس کے انداز کے عشق، ہمنوں کے علاوہ یہ بھی تھی
 کہ اس میں مادی ہے۔ جس کی دلی، اس کی روحانی کی تشریح و توضیح ہوتی ہے، اس
 کے علاوہ کے لیے حقیقی اور مادیوں کا سارا اہمیت ہے۔ یہ مادی کبھی دماغی مادیوں میں اور
 کبھی لاشعور کا سارا لے کر اپنی غیر الفاظ میں تلاش کی جاتی تھی۔ اس بدعت کے قائم
 میراجی 'راشد اور عمار' صریح تھے۔ جہاں یہ راہِ نگر کے استعاروں کا تعلق ہے بہت سے
 ترقی پسند شاعر بھی اسے اپنے طریقے سے کام میں لانے لگے تھے۔ علامتوں کا استعمال کسی نہ

کسی شکل میں سب کرتے تھے مگر دونوں میں جو وسیع فرق تھا وہ ان کے مادی شعور سے ظاہر ہوتا تھا۔ نئی شاعری نے سیراجی کی ہی روایت کی دوسری شکل میں بہت افزائی کی وہ صرف ہم دہری ہارلبر، رابو اور فراز سے لیجان لیتے تھے۔ نئی شاعری نے جو انس، لارنس، برک سار، کالا، آروہی، ڈالین ٹامس کے علاوہ انس، بیریشن، ایگری، بک، مین، انٹی پرکزی، صیغہ آل، ایبرا، اینڈلٹنی کرائس، اعلیٰ نیشن کے خیالات سے بھی فیض اٹھایا۔ ان سے پیدا ہونے والے سب ہی نظریات اور انسان دوستی اور سانج واد کے خلاف جاتے ہیں اس لیے خود نئے شاعر شعوری طور پر اور لاشعوری طور پر مادی ترقی کے مخالف خیالات ہی کی حامل افزائی کرتے ہیں اور اسے آزادی خیال کا نام دیتے ہیں۔

نئے شعراء میں ظلیل الرحمن، ہارمدی، وحید اختر، بلراج کوٹل، راہی معصوم رضا، عقیق حنفی، غیب الرحمن، شاد حتمکت، مظہر امام، شہوار کمار پاشی، شہاب جعفری، بدوستان میں اور وزیر کٹا، احمد فراز، منظور نظر، حش صدیقی، ساقی قادری، ناصر شہزاد، سیریاوی، ناصر کاظمی، مصطفیٰ زیدی وغیرہ پاکستان میں اپنی بہت سی خصوصیتوں کے باعث جانے پہچانے جاتے ہیں۔

ظلیل الرحمن (پیدائش ۱۹۳۷ء) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں استاد ہیں۔ ۱۹۵۵ء کے نکل ہی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ تین مجموعہ کلام ”آئینہ خانے میں“ ”کافدی جہنم“ ”ور“ ”یا حداد“ ”شائع ہو چکے ہیں۔ تیسرا مجموعہ کسی حد تک نئی شاعری سے متاثر ہے۔ ان کا ”دارِ عمر“ نئے شاعروں جیسا ہے مگر ان کا فن پرانے شعراء کا رچاؤ رکھتا ہے۔ ظلیل الرحمن ایک سلیجے ہوئے نقاد بھی ”عمر و فن“ ”راویہ نقاد“ ”مقدمہ کلام“ ”آئش“ اور ”نوازے ظفر“ ان کی تنقیدی تصانیف ہیں۔ ہارمدی (پیدائش ۱۹۳۸ء) بھی اسی نس کے شاعر اور نقاد ہیں۔ مصنف کے ذاتی متقد نظر بہت زور دیتے ہیں۔ اس وقت سب ہی دسوں نظریات سے غیر مطمئن ہیں۔ ان کی زبان کڑی الکڑی اور ملا تئیں ہمہ ہوتی ہیں۔ نظموں کے دو مجموعے ”شہر آرد“ اور ”کالے فائد“ کی نظمیں اور تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ ”تکلیف دہ باکی“ شائع ہوئے ہیں۔ وحید اختر بھی علی گڑھ یونیورسٹی میں قلمی کے استاد ہیں۔ وہ زندگی کے اسرار کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں اور زبان میں بہت سے تجربے کے لطیفی اپنی بات طویل صورتی سے کہہ جاتے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ ”چترلوں کا مٹی“ ۱۹۷۷ء میں شائع

ہوا ہے۔ ہر راج کو ل بھی مہم سے ملی ہی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ مگر گزشتہ دس برسوں سے انہوں نے نئی شاعری کی کو اپنا نصب العین بن لیا ہے۔ ان کے دو مجموعے "مہلی" "تھیں" اور "نئی کارش" شائع ہو چکے ہیں۔ کچھ ہی دنوں پہلے ایک مجموعہ "ناگری رسم الخط" میں بھی شہرہ کی گنج "شائع ہوا ہے۔ ہر راج کو ل کسانوں بھی لکھتے ہیں جن میں ملاقات کے واسطے سے بدلت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دای مصوم رضائے دیلائے شامی میں قدم رکھتے ہی شہرت حاصل کر لی اور اپنی نسل کے نئی پسند شعراء میں شمار کیے جانے لگے۔ ان کے تین مجموعہ "رقص ہے" "مہم" اور "جنی شہرہ جنی راستے" شائع ہو چکے ہیں۔ "مہم" ایک طویل نظم ہے جو کی دواعت میں لکھی گئی ہے مینق خلی پرانے سے نئے کی طرف آتے ہیں اور اپنے آپ کو بیوی خلی کے ساتھ ہی نسل سے جوڑتے ہیں۔ پہلے ایک مجموعہ "تنگ وراہن" چھپا تھا۔ اب ایک طویل نظم "سند باد" شائع ہوئی ہے جو کھوئے ہوئے نئے انسان کو علاقہ شہر میں توار حلا کرتی ہیں۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے قاری کے استاد فیض الرحمن اپنے نقطہ نظر کی بنیاد پر ترقی پسند ہیں۔ کم لکھتے ہیں، لیکن جو کچھ ہے وہ فنکارانہ ہے۔ کلام کا صرف ایک مجموعہ "بازید" شائع ہوا ہے۔ حیدر آباد کے شاد حاکمت نے کچھ ہی دنوں میں اپنے لیے ایک جگہ ہال ہے۔ ایک مجموعہ "زاشید" چھپا ہے۔ مقرر امام ہمارے مستقبل کے شاعر ہیں ان کے فن کا بایں مانی شعور کا باکالت ضمیمہ کرتا۔ ایک مجموعہ کلام "زخم تفتا" شائع ہو چکا ہے۔ شہاب جعفری ملی میں املا کے استاد ہیں، مشہور اردو شعراء میں محسوب ہوتے ہیں۔ مگر انہیں لکھیں لکھتے ہیں۔ ایک مجموعہ کلام "سورج کا شہر" ابھی کچھ دن قبل شائع ہوا۔ شعور علی گڑھ یونیورسٹی میں اردو پڑھاتے ہیں۔ شاعری کی مردہ سرے سے شعراء کو دیکھتے ہوئے کم سے۔ مگر خیالات کی بدلت اور اظہار کی خواہشوں نے انہیں ہر مل عزت بنا دیا ہے۔ ان کا مجموعہ "اسم اعظم" شائع ہو چکا ہے۔ انہیں سے شعراء میں کما ہوا نئی اپنے اسلوب کی بدلت ورمات کی بدلت سے بچا لے جاتے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ "موسمیں کی تواضع" دستیاب ہے۔

پاکستان میں بھی نئی شاعری کی تحریک جی تیز رفتاری سے چل رہی ہے۔ وہاں کے نامور شعراء میں وزیر تھاکا نام سب سے پہلے آتا ہے، لیکن کہ وہ نئی شاعری خصوصیات اور بیاد کی رجحانات کی تشریح کا فریضہ پورا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر تھاکا کا نقطہ نظر رنگ کے

تصانیف نادرہ سے حد درجہ متاثر ہے جس کا ثبوت ان کی شعری تخلیقات کے علاوہ نثری کارناموں میں بھی ملتا ہے۔ ان کے کلام کا صرف ایک مجموعہ "شام اور سائے" ہے مگر نثر میں بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں "مسرت کی تلاش" "خیاں پارے" "ور" "چوری سے باری بیک" ان کے اہل مضامین کے مجموعے ہیں اور اردو شاعری میں طرہ مزاج "نغم جدید کی کہوئیں" اردو شاعری کا مزاج اور "تنقید و احتساب" تنقیدی تعلیقات ہیں۔ احمد فراز اچھے نئے شاعر ہیں۔ ان کا مجموعہ "دردِ آشوب" شائع ہو چکا ہے۔ مصطفیٰ زیدی نے دنیائے شاعری میں ترقی الہ آبادی کے نام سے قدم رکھا۔ وہ پاکستان اس وقت تکے جب ان کو شاعری حیثیت سے شہرت ملنے لگی تھی مگر پچھلے برسوں میں انہوں نے بڑی ترقی کی ہے۔ ان کے مجموعہ کلام "دوہی" "مگر بیان" "تباہ ساز" شائع ہو چکے ہیں۔ ظہور نقر بھی پاکستان کے اچھے شاعر ہیں جو ترقی پسندی کے ساتھ ہی اسلوب کی جدت پر بھی زور دیتے ہیں۔ ان کی نظمیں "ریزہ ریزہ" کے نام سے پھیل چکی ہیں۔ مرثیہ صدیقی (ریزہ بیٹوب) ناصر شہزاد (چاند کی چٹان) سانی لارڈلی (پیار کا صحرا) ظفر اقبال (آبِ رواں) شہزاد احمد (سدا) نصیرہ راضی (چتر کی زبان) انجم اعظمی (آبِ درخشاں) امین انشاء (چاند گر) منیر زیدی (جنگل میں دھنک) بھی نئی شاعری کے نیا نیا شاعر کہے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ ہندوستان میں سطر سلیم، محمود اباد، عزیز قناتی، راج رائے، راج رائے، مہر علوی اور پاکستان میں ادا جعفری، محبوب خراس، جمیل ملک، ہانی صدیقی، عہد العزیز خالد، جمیل الدین عالی، مشتاق خواجہ، بھی نئے شاعروں میں جاتے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ شعور اور نظریہ کے معیار پر ان میں فرق پڑ جاتا ہے۔ ایک اور قابل غور بات یہ ہے کہ ہندوستان پاکستان دونوں میں کچھ برسوں کے درمیان غزل کو بڑی مقبولیت ملی ہے۔ کیونکہ غزل کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ اس میں نئے تبدیل ہونے والے خیالات بھی نئے سانچے بھی آسان طریقے سے داخل جاتے ہیں۔

شاعری کے برابر تو نہیں مگر کہانی اور ناول میں بھی مصرت نے اپنا اثر ڈالا ہے۔ اس طرح اختیار کیا گیا لاپن محض انداز فکر اور تخلیق کی حیثیت کا نہیں ہے، زندگی کو فنی پھول اور نکھری ہوئی بان لینے اور اسی کو پھاڑنے کے سبب ممکن ہوا ہے۔ ایسا ہونا قدرتی ہی ہے مگر سماں بھی جس فنکار نے زندگی کو دکھا اور سمجھا ہے جس نے کسی بنیادی نظریہ کا سرا ڈالا ہے اور جسے کہانی کو دلچسپ بنانے رکھنے کا جادو آتا ہے وہی دنیا کے ادب میں معزز ہوتا

ہے۔ یہ بات کئی جاہلی ہے کہ بہت سے افسانہ نگار و ناول نگار کا درجہ اب میں ہو، آج بھی جی ایمت رکھتے ہیں، ان کے نام گمانے کی صورت نہیں۔ نئے لکھنے والوں میں قرۃ العین حیدر، رام، س، انور عظیم، جوگیندر پال، میدانی ہالو، آمنت ابوالحسن، و، اہدو عظیم، غیث احمد گدی، قاسم مہد ستار، انیس تین، عطیہ پروین ہندوستان میں اور ہاجرہ مسعود، ضلع مسعود، اسے حید، بیل باغی، رضیہ نسج، نظام التحفیں، صادق حسین، قاسم محمود، حید کاشمیری، میدانی، منہا کتاں میں تسلیم کئے جانے کے مستحق سمجھے جاتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر، ۱۹۳۷ء تک دیں روایتی قصے لکھتی رہیں مگر آزادی کے بعد کی صورت حال سے متاثر ہو کر جب انہوں نے اپنا پہلا ناول "میرے بھی صدمہ خانے" لکھا تو ان کا نقطہ نظر اور سماجی دعوں بدلتے ہوئے نظر آئے اسی وقت سے انہوں نے ناول اور افسانے میں بے مثال ترقی کی ہے۔ انہوں نے ملٹی اوپ، ہندوستانی فن و ثقافت کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اور رہان کے استعار پر اس میں غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ ان کی تخیلیت کا راز بھی ہندوستان کے زندگی کے دھاروں کی تلاش ہی ہے۔ ان کی کہانیوں کے مجموعے "ستاروں سے آگے"، "میں"، "آگ کا دریا"، "چائے کا باغ"، "میتا ہون" اور "آخری شب کے ہم سفر" ہیں جس میں تعلیمی، سماجی، ایک خصوصیت۔ نظر آتی ہے۔ انہوں نے کئی نئے ترانے بھی کیے ہیں۔ رام نام نے بھی ۱۹۳۷ء کے پہلے ہی لکھا شروع کر دیا تھا، مگر ان کی شہرت ۱۹۵۵ء کے بعد ہوئی۔ اب وہ بہت بیدار مصنف ہیں اور زندگی کی مختلف سطحوں کا اپنے تجربوں کی بنیاد پر اظہار کرتے رہتے ہیں۔ ان کی متعدد کہانیوں کے مجموعوں میں "کلی کلی"، "کوہ پچا لوت"، "چند عورتیں"، "سفر" اور "خون و گھاس" قابل ذکر ہیں۔ اور عظیم مقبول افسانہ نویس ہیں۔ معمولی واقعات سے حسین تصویریں بناتے ہیں اس میں خاص تجربہ ہے جس میں ان کا اصل انداز نظر نمایاں ہوتا رہتا ہے۔ اس کا ایک ناول "میں و میں سویرا" شائع ہو چکا ہے۔ جوگیندر پال نے افریقہ میں رہا رہا لکھا شروع کیا اور اس وقت کی کہانیوں میں وہیں کے پس منظر، سماں، جادو، پھر پاکستان اور ہندوستان میں سماں کی دھرتی کی تلاش کی۔ نئے افسانہ نگاروں میں س، لی ایک خاص جگہ ہے۔ انہوں کا مجموعہ "دھرتی کا قال" اور ناول "ایک ہونہ لہو کی" اور "پتھر"، قابل ذکر ہیں۔ میدانی ہالو نے نئی ہندوستانیات سے مستفید ہو کر تھوڑی سی مدت میں ناموری حاصل کر لی ہے۔ افسانوں کا مجموعہ "روشنی کا پتار" اور مختصر

ادبوں کا مجموعہ "مکمل اور ستارے" چھپ چکے ہیں۔ آئمہ الامین بھی جیلانی ہانوی طرح حیدر آباد سے تعلق رکھتی ہیں اور وہیں کی زندگی سے اپنی کتابوں میں رنگ بھرتی ہیں۔ ایک مجموعہ "کمانی" شائع ہوا ہے۔ واحد جسم بھی حیدر آباد کی افادہ نگار ہیں ان کی دلچسپ شہاب کی مصوری میں ہے۔ ایک مجموعہ "مشرق منوع" چھپ چکا ہے۔ لیاٹ احمد گلی مبارک کے اچھے انسانہ نویس ہیں۔ عوامی زندگی سے اپنی کتابوں کا نانا پانا تیار کرتے ہیں۔ کتابوں کا مجموعہ "بابا لوگ" چھپ رہا ہے۔ قاضی عبدالستار علی گڑھ یونیورسٹی میں اردو کے استاد ہیں، دہلی زندگی کے عکس بنے دلچسپ اور جذباتی طریقے سے پیش کرتے ہیں اور ان کی لہاں میں ادبیت بھی ہوتی ہے اور بے ساختہ روانی بھی۔ شعور نامی مجسمہ "شب گزیرہ" "مگر صبا" "دارا شکوہ" دستیاب ہیں۔ ابھی کتابوں کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ انہیں تین حیدر آباد کے اچھے افسانہ نویس ہیں۔ کتابوں کا مجموعہ "مکمل پرچہ" چھپ چکا ہے۔ علیہ پروین اردو سے تعلق رکھتی ہیں اور ریڈیو تربیس کی زندگی کو مرکز بنا کے ناول "مزاہدہ" اور سنجیدہ افسانے لکھتی ہیں۔ ایک ناول "شکلا" کے نام سے پاکستان میں چھپ چکا ہے۔ کتابوں کا پہلا مجموعہ زیر اشاعت ہے۔

پاکستان میں نئے افسانہ نویسوں کی بڑی تعداد ہے۔ اب میں بہت سے ایسے ہیں جن کے مجموعے بھی ابھی شائع نہیں ہوئے ہیں مگر چونکہ وہاں اخبار اور رسائل بڑی تعداد میں موجود ہیں اس سے انہیں جلد ہی مقبولیت حاصل ہوگئی ہے۔ ہاجرہ مسعود اور صدیقہ مستور دونوں ہمیشہ اب کم لکھتی ہیں مگر ان کے ناول ناک اور کتابیاں اردو عربی ہوتی ہیں۔ ان کی جگہ رحیمہ فصیح احمد اور بیلہ ہاشمی حاصل کر رہی ہیں۔ رحیمہ کا ایک ناول "تبدیل" اور رحیمہ کے دو ناول "مکاش باران" اور "آتش رنہ" شائع ہو کر بڑا عرصہ پہنچے ہیں۔ اسے حید کے بہت سے ناول اور کتابوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ حید کا شہیری کا مجموعہ "راج راج"۔ قاسم محمود کا "قاسم کی سہیلی"۔ صاف حسین کا "مچھوٹا مکمل"۔ عہد اللہ حسین کا "اس میں نہیں" شرکت صدیقی کا ناول "سہیلی کی جہتی" پچھلے کچھ برسوں میں بامعنی حاصل کر چکے ہیں۔ اس مختصر تاریخ میں ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے دوسرے لکھنے والوں کا ذکر ممکن نہیں ہے۔ پھر بھی صالحہ عابد حسین کے ناول "نظر سے گھر ہونے تک" اور "راہ مکمل" "یادوں کے چراغ" اور "سہیلی کے ناول" "عشرت" "تغیر" "سہیلی راج رہبر

کے "رونگ" اور کوثر چاند پوری کے مشط سک "کا ذکر ناگزیر ہے۔ یہ لکھنے والے اپنی عمر کے اہوار سے بڑے نہیں کے جیتے عمر ان کے کارنامے عصری زندگی کے فکاوارہ عکس پیش کرتے ہیں۔

سوجن احمد تنہدی ادب ملک کی دوسری زبانوں کی طرح مطلب کے ادبی شکلات سے متاثر بھی ہے اور اپنی بچ کی مداحوں کی جنم بھی لگا ہے۔ علم الاقاراد سیمید کی کے ساتھ لڑا نہیں لکھا جا رہا ہے مگر تنہدی ادب کی طرف خاص دھیان دیا جائے گا ہے۔ اور حقیقی کاموں کی طرف بھی دلچسپی بڑھی ہے کیونکہ تنہدی پونچھ سنہیوں میں حقیقی کام کی حاصل اجڑائی کی جاری ہے۔ جس نقادوں کا ذکر گزشتہ بابوں میں ہو چکا ہے۔ سوجن احمد میں بھی ان کی مسرہ حیثیت ہے لیکن ان کے علاوہ کچھ نئے نام بھی ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی اور ہر قمر صدی کے تنہدی کاموں کا ذکر ان کی شکلات ہی کے ساتھ ہو چکا ہے۔ اب کچھ ایسے نقادوں کی قدر و قیمت کی نقین کی جاری ہے جسوں نے اس موضوع پر سیمید کی سے توجہ کی ہے۔ علی گڑھ ہی کے اسلوب احمد انصاری نے جو انگریزی شیعہ کے صدر ہیں۔ احمد میں کچھ فکر آمیز تنہدی مضامین لکھے ہیں۔ جن کا مجموعہ "تنہدی و تحقیق" چھپ چکا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسین جو بہت اچھے اور اہم کار بھی ہیں۔ تنہدی میں بلند مرتبہ حاصل کر چکے ہیں ان کا مطالعہ وسیع اور قوت استنتاج پر اثر ہے۔ ان کا انداز فکر کسی خاص نظریے تک محدود نہیں ہوتا مگر ترقی پسندی سے کسی وقت بھی محروم نہیں ہوتے۔ ان کی کتابوں میں "ادبی تنہدی" احمد میں "مدالی تحریک" "مطالعہ سہوا" "شعروے" "جہاں گفتگو" اور "دلی میں اردو شاعری کا فکری اور تنہدی پس منظر" قابل ذکر ہیں۔ ان کے دار امیں کے مجموعے "تہذیب اور پرچمائیں" اور میرے اسٹیج دارے" بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جوں کشمر پونچھ رشی میں احمد کے صدر شعبہ ہیں اپنی حقیقی مساعی سے شہرت حاصل کر لیا ہے اچھے خوش ذوق نقاد ہیں اور ان کے مضامین مضامین اور ادبی رسوز سے معمور ہوتے ہیں۔ ان کی کتابوں میں "اردو کی بڑی داستانیں" "قریبی" "ردہ شکوی ثانی ہند میں" ہیں دوسرے نقادوں میں ڈاکٹر گلین ارمس ہیں جو جوں کشمر پونچھ رشی میں احمد کے استاد ہیں۔ تنہدی کے نفسیاتی طرز سے خاص طور سے متاثر ہیں۔ کتابوں میں "زبان اور کلچر" "ادبی قدروں" اور "نقیات" قابل ذکر ہیں۔ انہی آباد پونچھ رشی کے ڈاکٹر مسیح الزمان کو ادبی وقار حاصل ہے ان کی مطبوعہ

کتابوں میں "اردو تنقید کی تاریخ" "عصرِ عرب" "سرائی میر اور اردو مرثیے کا ارتقا" "انجم ہیں۔ ڈاکٹر محمد عقیل کی نئی فہرستیں اور اردو شعری کا ارتقاء مثالی بعد میں قابل ذکر ہیں۔ دلی پختہ دہشتی کے ڈاکٹر قمر نہیں، ڈاکٹر ظلیق انجم، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے یکم و دوسرے میں اپنی تنقیدی تحقیق کے کارناموں سے ناموری حاصل کر لی ہے قمر سلس "ہم چند کا تنقیدی مطالعہ" اور تلاش و کوران خلق انجم کی "مرزا رفیع سودا" "غالب کی غارِ تحریریں" "معنی تنقید" اور ڈاکٹر نارنگ کی ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مشغول دستِ بآب ہیں۔ لکھنؤ پختہ دہشتی کے سید شہید الحسن نے کم لکھا ہے مگر ان کے دلیق سیم اور قوت فکر کا ثبوت ان کے مجموعہ مضامین "تنقید و تحلیل" سے مل جاتا ہے، دلی کے دلیق نیدر اوسر کی تنقیدیں ان کی وسعت مطالعہ کا پتہ دیتی ہیں۔ ان کی کتابوں میں "ادب اور نفسیات" "فکر اور ادب" "ادب اور جدید ذهن" خاص ہیں ڈاکٹر محمد عقیل رضوی دار کسی دواہیت کے قاعدوں میں شمار ہوتے ہیں۔ لکھنا اب ایک طرح سے چھوڑ دیا ہے، لیکن جو مضامین شائع ہوئے ہیں انہوں نے اپنی طرف حوجہ کیا ہے پاکستان کے قاعدوں میں ڈاکٹر دیر لکھا کا تذکرہ ان کی نظموں کے سیاق میں ہو چکا ہے۔ جمیل جانی، مظفر علی سید، فتح محمد ملک، ریاض احمد، سلیم احمد، سید پاکستانی قاعدوں میں مقبول ہیں۔

سے ڈرامہ نویسوں نے فن کی مختلف سطحوں پر بہت سے تجربے کیے ہیں ان میں محمد حسن، اصغر بیٹ، جاوید اقبال، انور عیانت، احمد، دیوٹی سران شرما کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ سب ڈراما نویسوں کے لیے لکھتے ہیں یا جب اسٹیج کے لیے لکھتے ہیں تو ڈراما تراکیب ایکٹ کے ہی ڈرامے ہوتے ہیں۔

ظہور مزاح کی دواہیتیں پیش سے ہی اردو میں سوڑ رہی ہے۔ موجودہ زمانے میں نظم و نثر میں بہت سے لکھنے والوں نے اسے اپنا میدانِ عمل بنا لیا ہے۔ نثری ادب میں فرقت کا کردار، حقائق، سلی، احمد، جمال پاشا، عارف، عجمی، حسین، بھارت چہرہ کنہ اور شعری ادب میں ظہیر جعفری، سید محمد جعفری، رضا نقوی، دلیق، دلاور نقار بہت پسند کیے جاتے ہیں۔

ادب کی ایک مہموزہ تاریخ میں محض ان معنوں اور شاموں کا ذکر کافی نہیں جسوں نے تجلی ادب کی تصنیف کی بلکہ ادب کے لیے نفا تیار کرنے میں اخبارات و رسائل، ادبی انجمنوں اور افراد کی جدوجہد کا افکار نہیں کیا جاسکتا، جو افکار کی تخلیق قوت کی حوصلہ

دفتری کرتے ہیں۔ قلم، سیاست اور سائنس کے موضوعوں پر لکھی گئی کتابیں بھی تحقیق و ادب کے لیے راست بناتی ہیں۔ اس کے علاوہ ہر بیدار ادیب کی طرح اردو میں بھی ترغیب ہوئے ہیں جن کے مضمر اثرات اور افادات کو بھلا یا نہیں جاسکتا۔ مگر اس مجل تاریخ میں ان سب کے لیے جگہ نکالنا محسوس نہیں ہو سکتا۔

یہ ہی اردو زبان اور ادب کی مختصر روداد جو محسوس بھی اس کتاب کو ہر دوری سے مورد فکر کے ساتھ چمکے گا اسے محسوس ہو گا کہ اردو کی ترقی ہندوستان کی سماجی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی ترقی سے وابستہ رہی اور سب سے اہم ترین اثرات سے متاثر ہوئی رہی ہے۔ ان میں کئی طرح کی جھڑپیں چلی ہیں۔ مختلف ذہنی پندار، درجہ پندار، انکار و خیال کا یہی تصادم بھی رہا ہے، مصعبی شاعروں کے دس افراعات سے ملے بھی رہے ہیں مگر بالعموم اس سے ہر تاریخی سوز پر کواطب زندگی کی مصوری اور انسان کی امیدوں خواہشوں، خواہشوں کا بیان کیا ہے۔ بہت سی باتوں اور مہموں کے تخلیق کاروں نے اس کے ادبی خزانے کو پھیلانے کے سعی کی ہے اور غیر غلوں کی ادبی سرگرمیوں سے بھی مستفید ہونے کی کوشش کی ہے اس نے پیش غلامی کے خلاف رواداری کا، تنگ نظری کے خلاف پھیلانے یا ہم کا تنگ دلی کے خلاف رواداری کا اور ان کے خلاف مساوات کا ساتھ دیا ہے اور اس کی اصل سرگرمی ہر دور میں ترقی پسند رہی ہے۔ جو گیارہ اعظما کے دور میں اس نے انسان دوستی کے، فرد کی آزادی کے گیت گائے، بیداری کے دور میں حب الوطنی، انسان دوستی، آزادی، جمہوریت اور سماجی انصاف پر ہر دور اس لیے تھیں کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں اردو کا وقار، کھڑا رہے گا۔ جب بھی ملک کی تہذیب کی ملی جلی تاریخ لکھی جائے گی تو اس میں اردو ادب سے جڑی مٹانے کی کوشش ہر دور میں قومی اعظما اور اشتراک کا نشان بن رہی ہے، بلکہ انسان دوستی کی طرف کھینچنے کا ہر دور وسیلہ ثابت ہوئی

اردو افسانہ

ایک تنگنو

حصہ اول

آپ مجھے معاف کریں گے۔ میں بالکل تنگنو کی ابتدا ہی میں یہ بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کو قصوں میں بھی اور عام پڑھنے والوں میں بھی وہ قسم کے لوگ ملیں گے اور ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ ہندوستان سے باہر وہ ملیں گے جن کے بے ادبی معیار کا سواں سوورتوں سے مل جاتا ہے۔ کیا جانتا ہوں (BESTSELLERS) کہلاتی ہیں جو زیادہ مہجے ہیں، زیادہ بکتی ہیں۔ وہ اعلیٰ ترین کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ کتابیں بھی ہیں جن کو چند تعداد چند پڑھنے والے لوگ پسند کرتے ہیں؟ یہ سوال ایسا عجیب و غریب ہے جس کا جواب میرے خیال میں کسی حالت میں بھی قطعی غلط شکل میں ابھی تک نہیں دیا جاسکا۔ اس سلسلے میں میں نے کہیں، ایک دلچسپ واقعہ کا حوالہ دیا ہے۔ اس وقت بھی اس کا ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ فرانس میں سولیر اور راسین جیسے عظیم الشان ڈرامہ نگاروں کے کچھ ہی دنوں کے بعد ایک سو سو اسکراپ نے نئے ڈرامے لکھنے شروع کیے اور بہت سے ڈرامے لکھے۔ ان کی ہر دوسری کا یہ عالم تھا کہ جب ان کے ڈرامے کھیلے جاتے تھے تو بڑی دھڑلے کی جگہ نہیں ہوتی

حقی۔ اور ایسا جھوم ہوتا تھا کہ لوگوں کو قبیلہ کے امور داخل ہونا ایک مشکل کام بن جاتا تھا۔ لیکن اس وقت کے سب سے بڑے خدو گائیے نے جب اس کے ڈرائے چڑھے اور ان ڈرائیوں کو قبیلہ میں جا کے دیکھا تو اس کو سخت دکھ لگا۔ اس نے یہ محسوس کیا کہ اسکرائب کی حالت وہ ہے جو طاعون کی ہوتی ہے جو محل اپنی داخلی اور وقتی باتوں سے محل کو گروہ کر لیتے ہیں درنہ حقیقتاً اس کے ڈرائیوں میں نہ کوئی طاقت ہے اور نہ جان ہی اور نہ وہ ایسے ہیں جو اعلیٰ ادب میں شمار کئے جائیں۔ گائیے کو خیال ہوا کہ اس کا پہل کھولا جائے چنانچہ اس نے اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنائے کے لیے پانچ ماں تک مسلسل موسیو اسکرائب کے خلاف مضامین لکھے۔ اس کے ڈرائیوں کے محبوب جان کئے ان کی خامیاں لوگوں پر روشن کیں۔ ان کو بتا دیا کہ اس کا نام موسیر اور راسین کے ساتھ لینا ایک اہل جرم ہے۔ لیس پانچ سال کی کوشش میں اس کو اتنی بھی کامیابی نہیں ہوئی کہ قہوڑے سے لوگوں کو بھی اس سلسلے میں اپنا ہم خیال بنا سکے۔ سوا اس کے کہ جو چھوڑا اس کے دوست تھے اور اس کی طرح کے سوچنے والے تھے ان کو تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ حقیقت یہ ایک صحیح بات کہ رہا ہے لیکن عام طور پر لوگوں کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ بھی ہم دیکھنے جاتے ہیں اور ہمیں ڈرائے، دیکھے مظلوم ہوتے ہیں 'الف آنا ہے' اب اس کے سوا اور کیا چاہئے؟

تھک کر گائیے نے خود لکھا کہ میں تھک گیا اور میں نے اسکرائب کی طاقت کا ارادہ ترک کر دیا اور یہ محسوس کیا کہ غالباً میں جو چیز ڈرائیوں میں دھوپ دہا ہوں وہ دوسرے لوگ نہیں دھوپ دہاتے۔ جو چیزیں میں دیکھتا چاہتا ہوں وہ دوسرے لوگ نہیں چاہتے۔ یہ نقطہ نظر کا وہ فرق ہے جو ہر ماں میں باقی رہتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آج فرانس کے ادب کی تاریخ میں موسیو اسکرائب کا نام کہیں بہت دیر تک سا لکھا ہوا ہے گا اور موسیر اور راسین کے نام بہت ہی اعلیٰ پائے کے ادیبوں میں اور اعلیٰ پائے کے ڈرائے نگاروں میں نہ صرف فرانس بلکہ دنیا کی اہل تاریخ میں بہت روشن حرفوں میں دکھائی دیں گے۔ لیکن اس وقت حالات بدلے ہوئے تھے۔ اس وقت گائیے کا جو تصور تھا اس لحاظ سے تھا کہ وہ ادب کی جن اعلیٰ قدروں کو پیش نظر چاہتا تھا۔ ان پر موسیو اسکرائب کا لہجہ پورا نہیں اترتا تھا نہ اس کے اصول ان ڈرائیوں پر منطبق ہوتے تھے۔ لیکن اس وقت جو مانگ تھی اس وقت کا جو مطالبہ تھا اس وقت کی جو فضا تھی اس میں موسیو اسکرائب کو اعلیٰ پائے کی جگہ حاصل ہو گئی۔

ہمیں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہم بھی جب افسانے کے حلقہ منتظر کریں گے تو اس میں
 ہمارے اس بات کو پیش نظر رکھنا ہوگا کہ یہ محفل کسی افسانہ نگار کی بردہ یعنی اس کا بیان
 پڑھا جانا اس کی کتابوں کا زیادہ شائع ہونا بازار میں اس کی مانگ کا ہونا اس کے اعلا افسانہ
 نگار ہونے کا معیار Critoria ہوگا یا افسانے کی کچھ اہم و منفی خصوصیات ہوں گی کچھ اس
 کے فنی لوازم ہوں گے یا اس کا کوئی معیاری پیمانہ ہوگا جس کی مدد سے اس کو جانچنے کی
 کوشش کریں گے۔ یہ سوال ہمارے سامنے رہے گا حالانکہ اس کا جواب بھی اس 'افانی
 عنصر' کا تابع رہے گا جس کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا۔

جو شخص افسانے کے فنی عناصر کا چرخی طرح تصور نہیں رکھتا جو شخص افسانے میں
 ان خصوصیات کو اور ان کو پیش نظر نہیں رکھتا جو عالمی ادب پر تسلیم کیے گئے ہیں اس کے
 لیے ایک افسانے اور دوسرے افسانے میں جو چیز بابہ الاتیاز ہوگی جو چیز فرق پیدا کرنے والی
 ہوگی وہ صرف اس لیے کی مدت ہوگی جس لیے میں پڑھنے والے نے وہ افسانہ پڑھا ہے۔ اس
 کے جسم میں جو جھرمجری پیدا ہوئی جو لطف پیدا ہوا جو تفریح کا عنصر حاصل ہوا۔ اور تھوڑی
 دیر کے لیے اس نے اس میں وہ خوبیاں محسوس کیں جو ایک اچھے افسانے میں ہونی چاہئیں
 ان کی بنا پر اس کا ہر میلان ادب ہوگا یا اس کی پسند کی جو اس افسانے کے لیے ہوگی وہ ان
 تمام اعلیٰ المناوں کو مانہ کرے گی جن کے لیے ہم یا کہ یا کوئی خاص بحث کر کے یہ نتیجہ
 نکالے گا کہ یہ اس کے پسندیدہ افسانے سے بہتر افسانے ہیں۔ اس کی ابتدائی پسند اس کا پہلا
 تاثر 'وہ جس محل میں اس افسانے کو پڑھ کر اس سے لطف حاصل کر رہا ہے' وہی اس کا
 معیار بن جاتا ہے۔ اس وجہ سے جب ہم اردو افسانے کے حلقہ منتظر کریں گے تو ہمارے
 ہمارے سامنے یہ مسئلہ آئے گا کہ ہماری پسندیدگیوں المناوں کو جانچنے اور تولیے کے طریقے
 بہت کچھ اس بات پر مبنی ہوں گے کہ ہم افسانے کو کس منتظر نظر اور کس معیار سے پڑھ رہے
 ہیں۔ میں ان اصلی بحثوں کا تذکرہ یہاں محفل ختم کرنا چاہتا ہوں جن کا ذکر ہمارے ہمارے
 سامنے آتا رہا ہے مثلاً یہ کہ افسانے کا حقیقی مقصد کیا ہے یا ہمارے ادب کا مقصد کیا ہے؟
 منتظر افسانے کا مقصد کیا ہے کہ افسانے کے ذریعے سے کسی مخصوص خیال کو دوسروں تک
 پہنچائیں۔ یا یہ ہے کہ ہم تھوڑی دیر کے لیے اس سے تفریح حاصل کریں۔ افسانے کا مقصد
 کیا ہے کہ اس کے ذریعے سے انسانی زندگی کی تصویر دیکھ لیں یا کسی فلسفہ حیات سے

روشناس ہوں۔

س طرح کے اور بہت سے سوالات پیش ہو سکتے ہیں اور اسی وجہ سے ایسے اختلاف ہوں گے کہ میں اور آپ اور ہم میں سے بچے لوگ یہاں پر موجود ہیں سب کسی ایک لمٹانے کے حلقہ یا گٹھن لٹاری کے حلقہ یعنی اپنی رائےیں الگ پیش کرنے پر مجبور ہوں گے اور سیار کے حلقہ اتحاد مشکل ہی سے ہو سکے گا۔ مقصد کے سہل پر مجھے ایک کتاب یاد آئی کہ چونکہ ادبی اعداد کے سلسلے میں یہ بحث ہے کہ اہم ہے۔ ایک نظری کتاب ہے کہ آپ میں سے بعض لوگوں نے شاید دیکھی ہو نام ہے Why do I write اس میں عین اگر اسیوں کے خطوط ہیں۔ جو ایک دوسرے کو انہیں نے اسی مسئلہ پر لکھے ہیں کہ لکھنے کا اصل مقصد کیا ہوتا ہے۔ یہ تینوں اصوب قابل نگار اور افسانہ نویس ہیں جن کے نام ہیں گراہم گرین، الزبتھ ہالین اور بریخت۔ ان لوگوں نے اپنے خطوط میں اس بات پر بحث کی ہے کہ ہم جو لکھتے ہیں کیا اس کا کوئی مقصد ہو سکتا ہے؟ یا ہوتا ہے؟ بہت تھوڑے سے فرق کے ساتھ تینوں نے تقریباً ایک ہی باتیں کہی ہیں اور بریخت نے بہت واضح تفصیلات میں یہ کہا ہے کہ میں جب کوئی افسانہ لکھتا ہوں تو میرے پیش نظر یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ اس افسانے کے ذریعے کسی خاص قسم کا نقطہ نظر یا کسی خاص قسم کا خیال لوگوں کے دلیں میں پیدا ہو گا۔ کسی کے دل میں کوئی خیال پیدا ہوتا ہے تو ہوا کرے۔ چنانچہ اس نے خود مثال دی ہے کہ میں نے ایک لمٹانے میں اسپتال کی خرابیوں کا ذکر کیا ہے اور جب وہ افسانہ چھپا تو میرے پاس متعدد خطوط آئے کہ آپ نے اپنی خوبی کے ساتھ اسپتالوں کے اندر کی خامیوں اور مریضوں کو جو پریشانیاں لاحق ہوتی ہیں ان کی طرف توجہ دلائی ہے۔ میں نے اس کے جواب میں بہت سخت خط لکھا کہ میرا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا کہ میں اسپتالوں کی ان خامیوں کا تذکرہ کروں کہ اس سے کوئی شخص یہ سمجھے کہ میں نے اسپتال کی برائیوں اور خرابیوں کی طرف اس افسانے کے ذریعے سے توجہ دلانے کی کوشش کی ہے۔ میں نے تو صرف ایک کمائی نہیں ہے۔ یہ کہا ایک استہزاء نہ تھا۔ نقطہ نظر ہوا۔ یہ سمجھ ہو سکتا ہے کہ افسانہ نگار نے جس وقت اس افسانے کو لکھا اس کا یہ قصور نہیں تھا کہ مصباح قوم رہبر یا لیڈرین کو کوئی بات کہے یا کسی سماجی مسئلے کی حیثیت سے کہ کسی ایک کام کو بدل کر کسی دوسرے کام کو لانے کی کوشش کرے۔

لیکن افسانے کا چونکہ لمبا دلی عصر زندگی ہے اس وجہ سے افسانہ وہ جس چیز کو پیش کرتا چاہتا تھا وہ تصویر اتنی لمبا کسی خاص اپہتاس کی حالت پر مطلق ہوئی کہ وہ لوگ جو اس کے تجربہ میں شریک تھے ان سب کے لیے اس افسانے میں وہ صداقتیں دکھائی دے گئیں جو برصغرت نے دیکھی تھیں۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ کسی کو انہیں دکھانا یا ان کی طرف حوجہ کرتا چاہتا تھا یا نہیں۔ اس لیے جو دنیا کے عظیم ترین افسانہ نگار مہاساں اور جیولف ہیں ان کے حلقہ بار بار یہ بات کہی گئی ہے کہ مہاساں نے زندگی کو تراش کر اس طرح سے ہمارے سامنے پیش کیا ہے کہ ہم اس کی تصویر ہو جو اس طرح دیکھ لیتے ہیں جیسے کہ وہ۔ اور جیولف کے یہاں بھی زندگی ہی زندگی ہے۔ بلکہ اگر تو وہ خود زندگی سے بھی بڑا ثابت ہوتا ہے۔ جسوں نے یہ لفظ استعناں کئے ہیں معلوم نہیں کہ ان کے دل میں کیا ہو گا لیکن میں اس سے بعض وقت یہ سمجھتا ہوں کہ کبھی کبھی جیولف کے یہاں زندگی کے ان مساکن کی طرف اس طرح اشارہ ہو جاتا ہے جو زندگی کی اصلاح سے حلقہ ہے یا وہ زندگی کی ایسی تصویر دکھانا دیتا چاہتا ہے جیسی کہ اس کو ہونا چاہئے۔

مہاساں کے یہاں یہ صورت عام طور پر نہیں پائی جاتی بلکہ مہاساں زندگی جیسی ہے دیکھائی پیش کرتا ہے۔

تو ان دو عظیم ترین افسانہ نگاروں کے یہاں جو اس وقت تک دنیا کے لیے بااثر فطیم کئے جاتے ہیں 'افسانہ نگاری کی عکاسی' تخریج اور تصویر ہے۔ ان دونوں کے لیے بھی جب ہم محنگو کرتے ہیں تو اس کے سوا ہمارے سامنے کوئی پہلو نہیں آتا کہ زندگی کی ترجمانی یا زندگی کے نقوش یا زندگی کی تصویر پیش کرنے میں کون کس پر سخت لے گیا ہے اور کس نے اس کو بحر حق میں پیش کیا ہے۔ اگر ہم اس بات کو حسیں کر لیں تو یہی آسانی کے ساتھ اردو افسانے کی مختصر تاریخ کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ یہ میں کوئی نئی تحقیق یا مٹی ہائیں پیش نہیں کر رہا ہوں۔ انہیں آپ بھی جانتے ہیں۔ آپ کو صرف یہ یاد دلانا ہے کہ افسانہ زندگی کا ادبی نقش ہے۔

آپ کو معلوم ہو گا کہ چاہے دیا میں مختصر افسانے کی عمر بڑی ہو حالانکہ وہ بھی بہت چلی نہیں ہے لیکن جوں تک اردو کا حلقہ ہے اردو میں اس کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ نہیں۔ میں جب مختصر افسانے کا ذکر کرتا ہوں تو میرے پیش نظر وہی مختصر افسانے ہیں جو مغربی

ادب سے حاشا ہو کر کہے گئے ہیں۔ ان کا اصل مکتبوں یا چھوٹے چھوٹے ایسے قصوں کا ذکر نہیں جو پنج عشرا قصہ چار رویش میں پائے جاتے ہیں۔ اگر ہم قصہ چار رویش میں سے چار پنج حصے الگ کر لیں اور ان کو افسانے کی شکل دے لیں یا فسانہ آزاد میں سے کوئی نکلا نکال لیں اور اس کو افسانے کی شکل میں پیش کریں جیسے کہ رنگے سار و فیو کو اکثر پیش کیا گیا ہے تو کہانی کے بنیادی مضمر کی وجہ سے انہیں قصہ کہا جاسکتا ہے لیکن وہ مظهر السانے نہیں ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ کسی ناول یا کسی کہانی یا داستان کا کوئی نکتہ ہمارے سامنے مظهر السانے کی شکل میں آجائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی حد تک اس کے گھٹنے کا جو احسب ہے وہ بھی اس جگہ پر پہنچ جائے جہاں ایک مظهر افسانہ نویس اسے فن کے نقطہ نظر سے لے جاتا چاہتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ غیر شعوری طور پر ایسے حصے میں گئے جن کو آج ہم مظهر افسانے کے نقطہ نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ گھٹنے والوں کے سامنے نہ تو مظهر افسانہ نویس کا کوئی فن تھا اور نہ کوئی شعور انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ہر ایک ہی ادبی صنف میں گھر رہے ہیں۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جب اس ہی صنف میں گھٹنے کا ہمارے یہاں شعور پیدا ہوتا ہے وہ شعور کے بعد کا زمانہ ہے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں ان کے نمونے ملتے ہیں۔ یہاں بھر کوئی حقیق نہیں پیش کرتا چاہتا ہوں کہ پہلا افسانہ کون سا لکھا گیا ہے یا کس نے لکھا ہے۔ یہ طاقا قومت مشکل ہے لیکن ابتدائی بیسویں صدی کے بعض رسائل میں بعض ترچے ترکی 'فرانسیسی اور مغرب کی دوسری زبانوں کے ایسے شائع ہونے لگے تھے جنہیں افسانہ کہا جاسکتا ہے۔ رسائل مخزن و فیو میں ان کی اشاعت سے لوگوں کی توجہ اس طرف ہوئی کہ اس فن کو بھی ترقی دینا چاہئے۔ ہندوستان کی چند دوسری زبانوں میں جیسے بنگالی 'کھڑالی 'مراتی اور اہل ہیں ان میں مظهر السانے غالباً پہلے سے لکھے جا رہے تھے لیکن وہ مظهر السانے ہی مغرب ہی سے حاشا ہو کر کہہ جا رہے تھے۔

جہاں تک اردو میں مظهر افسانے کا تعلق ہے میں کسی حد تک یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ بیسویں صدی کی پیدوار ہے۔ بیسویں صدی میں بھی ہم کو ابتدائی افسانہ نگار ملتے ہیں ان میں دو نام نمایاں طور پر نظر آتے ہیں ☆ سجاد حیدر و مرم ☆ ہم چہ۔ دونوں کی افسانہ نویسی کی ابتدا کم و بیش ایک ہی زمانے سے ہوئی ہے۔ ہم چہ کا جو پہلا افسانہ ملا ہے وہ ۱۹۰۵ء کا لکھا ہوا ہے۔ عنوان ہے "رضا کا سب سے انمول رتن" اور انہوں نے اس

الہائے کو اپنی بھر کی تحریروں میں خود بھی اپنا پہلا افسانہ قرار دیا ہے۔ جو لوگ ان کے افسانوں پر کام کر رہے ہیں ان کو بھی یاد آئے گا اس سے پہلے کا کوئی ایسا افسانہ نہیں ملا ہے جس کو باقاعدہ افسانہ کہہ سکیں۔ اس طرح ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ۱۹۱۵ء سے اس کی باقاعدہ تاریخ شروع کر سکتے ہیں۔ دوسرا شخص جس کا میں نے نام لیا سجاد حیدر یلدرم ہیں۔ انہوں نے بھی پہلی ادب کے اثر سے اور ترکی افسانہ نویس کا ماحولہ کرنے کی وجہ سے یہ کہہ کر ترکی پہلے ہی ادب سے متاثر ہو چکا تھا، بعض نثریے پیش کیے تھے۔ بعض افسانے لکھے تھے انہیں سے ہم اردو افسانے کی ابتداء کرتے ہیں۔

میں نے اپنے ایک مضمون میں حال ہی میں لکھا ہے کہ انگریزی کو جیسے IRVING WASHINGTON اور ایڈگر پوئل سمجھے تھے اور انہوں نے اس فن کو ہاتھ میں لیتے ہی بلدیوں پر پہنچا دیا، اسی طرح اردو کی یہ خوش قسمتی تھی کہ دو بہت اچھے فن کار اس کو ابتداء ہی میں مل سکے۔ پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم اور دونوں نے اسے کشتیوں چلنے سے بچا لیا اور اسے شروع ہی میں جواں بنا کر پیش کر دیا۔ یہ بات میں نے اس لیے کہی تھی کہ اس ابتداء کی شکل میں بھی جو افسانے ہمیں ملتے ہیں وہ اسی بنیادی حقیقت کی وجہ سے اہم ہیں کہ وہ ہندوستانی زندگی کی بعض ایسی ہی تصویریں پیش کرتے ہیں جو اس زمانے کے لیے پسندیدہ تھیں۔ اس زمانے کے لوگوں کو حیرت کرتی تھیں، یا فاضل کے لیے ایک سامان فکر اکٹھا کرتی تھیں۔ جب ہم نے ان افسانوں کو دیکھتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان افسانہ نویسوں نے کوشش اس بات کی کی ہے کہ اپنے ابتداء کی دور میں بھی مغرب ہی کو پیش نظر رکھ کے افسانہ نویس کریں۔ اس میں سجاد حیدر یلدرم زیادہ آگے تھے اب دارا ان دونوں کو زندگی کے آئینے میں دیکھنا چاہیے۔

پریم چند کے ابتداء کی افسانوں کے حلق میں کوئی ایسی نثر نہیں کہوں گا۔ صرف انکا ہی کہوں گا کہ پریم چند کے ابتداء کی افسانے داستانِ حصار رکھتے ہیں چنانچہ اگر کہیں "شیخ محمود" یا "دیا کا سب سے اعلیٰ وزن" یا "دوسرے ابتداء کی افسانے پڑھے ہوں۔ یا صنوبر وطن" کو دیکھا ہو جو چھپے کے کچھ ہی دنوں بعد سب کئی گئی اور جلا دی گئی تو کہیں کو افسانہ ہو گا کہ جہاں زندگی پیش کی گئی ہے جو اس سے پہلے تھے کہانوں میں نہیں ملتی۔ جب وہ کتاب بھیجی اور اس کے بعض افسانے "ننان" میں پیسے ہی چھپ چکے تھے تو ایسا محسوس ہوا

کہ ہمارا کہانی کہے کا شعور ہماری انسانہ نفسی ایک ایسے راستے پر چل پڑی ہے جو اس سے
پسے موجود نہیں تھا۔ پتینا پریم چند کی اس ناول کی ناول ٹائٹل ہے۔ سرشار کے اثر سے
بوجھل ہے۔ اس میں ایک داستانیں ہیں۔ شہریت اور رعیت ہے۔ جن سب باتوں سے ابھ
میں انہوں نے بھٹکارا حاصل کر لیا۔ یہ ادبی کی ساری چیزیں ان کے ابتدائی افسانوں میں
پائی جاتی ہیں ان کے کہنے کا اسٹیل بھی کم ریشہ ہے جو حاتم طائی کے قصوں میں پایا جاتا
ہے یعنی قصے کو دلچسپ بنانے کے لیے اس کے اندر ایک درجہ انداز ایک فلسفی ٹھکانا ہے
اس طور پر حقیقت کی حیثیت سے ہماری نگاہوں کے سامنے نہیں ہے لیکن ان کا بنیادی تصور
عرب وطن اور ہندوستان کی ترقی اور آزادی کی جدوجہد کی تصویر کشی ہے جو ابتدائی شکل میں
تھی۔

یاد رہے اس چیز کی طرف توجہ نہیں کی بلکہ انہوں نے ایک دوسرے مسئلے کو پہنچ
نہ کر مرکز بنایا۔ وہ یہ دیکھتے تھے کہ سماج میں عورت کا مقام کیا ہے عورت اور مرد کی محبت
سے زندگی کس طرح خوب صورت بن سکتی ہے۔ اس لیے انہوں نے اپنے افسانوں کی بنیاد
محبت پر رکھی۔ ان کے یہاں محبت کا وہ تصور نہیں تھا جو پریم چند کا تھا۔ بلکہ وہ محدود تصور
تھا جو گھلے زندگی اور خاص طور پر محبت کی زندگی کا ہوتا ہے اسی کو انہوں نے انسانے کا
مرصع بنایا۔ ان کے خیاستان اور حکایات و احساسات میں جتنے بھی انسانے ہیں ان کا
مرکزی تصور یا توجہ عورت ہے یا محبت۔ وہ دونوں میں توازن کی تلاش میں ہیں جس سے محبت
کی زندگی خوش گوار ہو سکے کیونکہ ہندوستانی سماج میں قدامت پرستی اور پست مالی کی وجہ سے
دلت در سارا کے درمیان بڑی بڑی مائیکس تھی۔ اور محبت ایک طرح سے گویا شہر ممنوعہ کی
حیثیت رکھتی تھی۔ اس وجہ سے اس کا اس وقت قلم اٹھا بہت رکھتا ہے۔ وہ زندگی کا
انقلاب دیکھ چکے تھے اور باہر کی عورتوں کی توانیات سے واقف تھے اور خاندان زندگی کے
تکڑا سے حائر تھے اس لیے سب انہوں نے اس شخص پر قلم اٹھا دیا محسوس ہوا کہ
انہوں نے بھی ہندوستان کی ایک دھنسی رنگ پڑی ہے۔ پریم چند کی طرح وہ بھی ہندوستان
سماج کے ایک مخصوص طبقہ کو گرفت میں لائے تاکہ کو شش کر رہے تھے لیکن چونکہ دونوں کا
تصور نظر الگ الگ تھا اس لیے میں سے ہندوستان میں ہی صرف توجہ دلائی ہے کہ اردو
انسانے میں اس وقت سے ہم کو تقریباً دو سواری میں چلتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں ایک کی

رہی پریم چند کر رہے ہیں اور دوسرے کی سادہ جود پر۔

میں اس وقت کے بہت سے انسان مٹاؤں کے نام نہیں لو گا۔ مجھے لگتا ہے کہ پریم چند نے جس دنیا کو دکھا تھا اس کو یلدرم اور ان سے بہت دور تھا۔ ہندوستان کی وہ زندگی جو سات میں قحطی جو عام میں قحطی ان پرچہ 'انسان' میں دکھائی گئی کہ ان لوگوں نے نہیں دیکھا۔ ان کا تصور عقل حوصلہ طبعی یا اعلیٰ لیتے۔ اور انہیں ایک محدود دبا کہ ہر پڑھے لکھے وہ بہت کی تلاش میں تھے۔ معافی دے کر ہر پڑھے لکھے کی آزادی چاہتے تھے جو مطلبی ممالک میں پائی جاتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو فکر، حیات، تلف ہیں۔ ایک حیثیت سے دونوں ایک دوسرے کی تکمیل لیتے ہیں۔ پریم چند نے زندگی کی جو تصویریں پیش کیں ان میں انہوں نے ایک مخصوص طبقے اور ان کے تعلیم یافتہ طبقے کے ان ماحول اور جنسی بے یقینیوں اور ہنگامہ کرائیوں کو جو ان کے دلوں میں پیدا ہو رہی تھیں، نظر انداز کر دیا۔ یلدرم نے جس دنیا کو پیش کیا وہ عام لوگوں کو نظر انداز کرتی تھی عام لوگوں سے یہاں پر کسان مزدور اور ایسے ہی لوگ مراد ہیں جو اس سے پہلے انسانے کا موضوع نہیں بن سکے تھے۔ یہ دونوں شانیں ہماری انسانیت کی ایک ہی وقت میں اور قریب قریب پہنچیں۔ وہ کسی کسی جگہ پر ایک دوسرے سے مل بھی گئیں اور کبھی ایک دوسرے سے اپنی وار پٹی گئیں کہ ہم نے یہ محسوس کیا کہ جو یلدرم کے رنگ میں گھسے والا ہے وہاں ہی انسانہ نظر ہے اور جو پریم چند کے رنگ میں گھسے والا ہے وہ حقیقت پسند، ہم نے سولے طور پر یہ تقسیم آسانی کے لیے کر لی۔ حالانکہ یہ تقسیم بہت زیادہ سائنٹیفک نہیں کیونکہ پریم چند بھی اپنے ابتدائی دور میں وہاں فکر، فکر رکھتے تھے جذبات کے راستے سے مسائل کی مدد تک پہنچنا چاہتے تھے (انہی کو ایک خاص طرح سے 'وہاں ہی ایک سے' تھیں) لیکن کی کوشش کرتے تھے غالباً اس کا جب یہ ہو گا کہ (انہی پر اس وقت ان کی گرفت اتنی مضبوط نہ تھی جیسی بعد میں ہوئی۔ یلدرم میں حقیقت پسندی کا عنصر تھا اور وہ اس طرح بدلنا ہوتا تھا کہ وہ حوصلہ طبعی کے اندر خاص طور پر مسلمانوں کے حوصلہ طبعی کے اندر جو مسائل شادمانیہ کے سلسلے میں اور محبت کی آزادی کے سلسلے میں پیش آتے تھے یا گھسے (انہی میں جو ایک دوسرے سے سرحدیں، آہ، جاتی تھیں، اور اس میں جو رکاوٹیں پڑتی تھیں ان کی طرف توجہ دلاتے۔ یہ حقیقت پسندی کا عنصر تھا لیکن ان کا مرکز اور محور خالی وہ

مدانی محبت پر مبنی تھی جو عورت اور مرد میں پیدا ہوتی ہے اور کبھی شادی کی شکل میں اور کبھی ناکامی کی شکل میں افسانہ بنتی ہے۔ اس وجہ سے یہ کہنا کہ ایک خالص رقی پند اور حقیقت پر رہا اور دوسرا خالص مدانی بہت عجیب نہیں۔ دونوں کے مابین یہ دونوں عناصر کسی نہ کسی حد تک پائے جاتے ہیں۔ لیکن جس چیز کی افراط اور بہتات ہے اس کی قیود پر ہم عمل کرتے ہیں کہ پریم چند کا نظم حقیقت پسندی کی طرف جا رہا تھا اور یلدرم اور ان کے ماننے والے مصائب کی طرف جا رہے تھے چنانچہ اس کے بعد جو حسیں آئی ہیں ان میں یہ چیز اور واضح ہوتی ہے مثلاً یار تقیہ کی صاحب نے خود مجھ سے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ افسانہ نگاری کی طرف ان کی توجہ یلدرم کی وجہ سے ہوئی۔ یلدرم سے ان کی ملاقات ہوئی، گفتگو ہوئی، انہوں نے ان کو سب سے حاشا کیا اور انہوں نے بھی افسانہ نگاری شروع کر دی۔ چنانچہ وہ اپنے آپ کو افسانہ نگاری میں تقریباً ان کا ایک شاگرد ماحولیم کرتے ہیں۔ لیکن فرق یہ ہو گیا کہ یار تقیہ کی عیاں خیال اور بیان کی لذت کی طرف توجہ بڑھتی چلی گئی اور ان کی افتاد مزاج کے ساتھ دوسرے اثرات مثلاً نیگور کے ادب لطیف اور ابوالکلام کی خوابت کے اثرات اور کئی دوسری چیزوں نے مل کر ان کو یلدرم سے بھری دلد کر دیا یعنی انہیں ایک ایسی مدانی فضا میں پہنچا دیا جہاں حقیقی محض خیال کے رپ میں خوش کی جا سکتی ہیں کبھی کبھی ان کے افسانوں میں کچھ حقیقی بھی مل جاتی ہیں۔ جیسا کہ ان کا ایک مختصر مضمون ہے "غائب اٹھ جانے کے بعد" اس میں جتنے بھی فسانے ہیں، وہ ساری حقیقتوں سے قوت رکھتے ہیں۔ اگرچہ ان نے مابین سوچنے کا ایک خاص طریقہ ہے جسے وہ نووی انا پند ہی کہہ سکتے ہیں۔ اس کو یہودیت کہ انہوں نے اپنے افسانوں کی تخلیق کی ہے لیکن حقیقت پسندی نہ کوئی۔ کوئی پہلا ان افسانوں میں صودہ پڑھا ہے۔ سب اگر میں... کسی قدر تصانیات میں عادی تھے۔ اس عہد میں "تراوی" کی جدوجہد کے سلسلے میں ایک رخ ہماری مدد میں یہ بھی پیدا ہو گیا تھا کہ جہاں ہم سب سی تراوی اور ملی تراوی کا مطالبہ کر رہے ہیں وہیں ہم وہاں سب پرستیوں سے بھی آزاد ہونا ہے جو سب کے فیکر دار بنے بیٹھے ہیں اور جو ہمیں، ایک قدم بھی آگے بڑھنے نہیں دیتے ہیں۔ اس طرح جس کو زندگی کے بڑے ہماری خاکے ہیں۔ جو پہلو ہاتھ لگا رہا جس کو وہ بچا سکا جس کے حلق اس کے تجربے نے اس کی رہنمائی کی، اسی کو اس نے اپنا نیروی تصور بنا لیا۔ مجھوں کو کچھ دیر کو لے لیجے

جنوں نے مخصوص مقامی اور تنظیمی اساتے رکھے ہیں۔ اسی کے انہوں نے اپنا بنیادی تصور بنالیا۔ دنیار سے اچھے عامے قریب ہیں لیکن اگر آپ ان کا مطالعہ کیجئے گا تو یہ معلوم ہوگا کہ وہ صرف محبت کو مرکزی موضوع قرار دیتے ہیں۔ محبت میں جو ہم دور لگتی ہے، عقل اور ناکامی ہے، وہ ان کا بنیادی موضوع ہے۔ ان کے اساتے کسی طرح بھی آج کی دنیا میں عام مسائل سے ہم آہنگ نہیں معلوم ہوتے۔ لیکن اس وقت کسی نہ کسی حد تک یہ صورت صدور تھی کہ گھروں کے اندر لڑکے اور لڑکیاں، ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ خون تھوکتے تھے اور دق کا کار ہوتے تھے اور ان کو سواتے تھے اور کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا کہ وہ اپنے غم کو چھپاتے ہوئے اس دنیا سے گزر جائیں۔

اس طرح تجزیہ اور تحلیل نے مختلف راہیں دکھائیں۔

میرا خیال یہ ہے کہ ہر انسان فطرتاً ہی انسانہ فطرت کا لفظ تشابہ صحیح نہیں ہے، ہر اچھا انسان فطرتاً ہی ذہنی کے جن پسوؤں کو سمجھ سکتا ہے، جن پسوؤں کا اسے تجزیہ ہوتا ہے انہیں کو اپنے افکاروں کا مرکزی موضوع بناتا ہے۔ یہ بات میں کسی قدر زور دے کر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اساتے کی ہی نہیں، دنیا کی انسانہ فطرت کی تاریخ میں یہ خصوصیت آپ کو ملے گی کہ ہر دور کی ہر اہم مذاقیں ہیں وہ اس دور کے انسانہ فکاروں کے یہاں ضرور رونما ہوتی ہیں۔ چاہے وہ عیسائی معیاروں کے ساتھ ہوں یا بعد سے پراگندہ الی انداز میں۔ لیکن محدود مذاقیں، وہ حقیقتیں، وہ بے چارے اور۔۔۔ قراروں جن کی طرف تارا ذہن مستقل مائل ہوتا رہتا ہے، جو سوالات پیدا ہوتے ہیں اور ذہن جن کے جواب چاہتا ہے، ان کی طرف لازمی طور پر ہر انسان تارا کا اس مائل ہوتا ہے۔ اب اس حد تک اس کافی شعور حالیہ اور ملتا ہوتا ہے اور زندگی جس حد تک اس کی گرفت ملتی ہے اس حد تک وہ زندگی کو خوب صورتی سے پیش کرتا ہے اور کام رہتا ہے۔

اس مسئلے میں پھر پریم چند کا خیال کیا۔ جس تک ان کا تعلق ہے پریم چند سے زندگی کے بڑے دھارے کو پکڑا تھا۔ انہوں نے افراد کو تقریباً پھر زور دیا تھا سواتے ان افراد کے جو کسی مخصوص نقطہ نظر کی یا کسی مخصوص طبقے کی یا کسی ایک قسم کے لوگوں کی یا زندگی کرتے تھے۔ افراد کی طرف انہوں نے پوری طرح توجہ نہیں کی اسی لیے ان کے سوالوں کے بنیادی مراکز کو ادھر سے ادھر لے دیا ہوتا ہے۔ کوئی واقعہ ہوتا ہے کوئی مسئلہ ہوتا ہے۔

عام طور سے وہ انسان کسی کردار کو دلچسپی نہیں لکھتے جیسے بہت سے انسان نہیں کرتے ہیں کہ اپنے کردار منتخب کرتے ہیں اور پھر اسے انسانے میں ڈھالتے ہیں۔

پہم چند کے یہاں کوئی واقعہ ہوتا ہے جو تحریک کا باعث ہوتا ہے اور اس کے لیے وہ کردار کا انتخاب کرتے ہیں جس کے لیے وہ حقیقت کے قریب تر ہوتے ہیں۔ حقیقت اور خیال آرائی کا یہ فرق آج کے لکھنے والوں میں بھی ہے اور ہر دور میں ملا ہے۔ اگر آپ ناول نگاروں اور انسان نگاروں کے امتزاجات پڑھیں گے تو یہ معلوم ہو گا کہ بعض ایک طرح لکھتے ہیں اور بعض دوسری طرح۔ چنانچہ پہم چند نے زیادہ تر واقعات سے سبق لیا ہے اور ان ہی سے اپنی تجویزیں برآمد ہیں اور انہیں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

مقرر یہ کہ انسان ہر کسی کا یہ ارتقائی اور تیسری دور جو ۱۹۴۵ء سے شروع ہوا کم و بیش ۱۹۳۰ء تک چلا آتا ہے۔ ۱۹۳۰ء تک بہت سے انسان نہیں آئے تھے، انہوں نے کوئی خاص تجربے نہیں کیے۔ یہ ضرور ہوا کہ ان کی افواہات کی وجہ سے انسانوں میں ایک خورج آیا۔ ہر انسان نگار اپنا کوئی عقائد اور سماجی نقطہ نظر رکھتا تھا۔ اس کے لحاظ سے وہ حقائق کو پیش کرتا رہا لیکن کوئی بہت بڑا فرق انسانے کے ڈھانچے میں نہیں دکھائی دیتا۔ بعض انسان نویسوں کے یہاں خود ہی سے بڑے بڑے پر تہذیبوں ہوئیں گی۔ ان کا شعور ارتقاء پر ہوتا تھا۔

پہم چند کو دیکھنے انہوں نے ۱۹۳۰ء کے قریب ایک انسان لکھا "بڑے گمر کی بیٹی" جو ان کے بہترین انسانوں میں شمار ہوتا ہے اور بقیہ بہترین انسانوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔ وہ انسان پہلی بار ہم کو اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ حقیقت کافی میں دل کھلی دلچسپی، شعور، زبان کی لطافت اور چلت کی تعمیر سازی کی ساری چیزیں کیسے ایک ساتھ ایک جگہ ہو سکتی ہیں گویا داستانی اور تعلیمی انداز سے پہم چند حقیقت پسندی کی طرف بڑھے اور بڑھتے ہی رہے۔ وہاں انسان نگاروں کے یہاں اس طرح کے ذہنی ارتقاء کی گنجائش کم تھی۔ وہ اپنی راہ پر چلتے رہے لیکن جیسا کہ میں آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ ایک دوسرے کی ہیں یہ ہر گز بھی کہتے ہیں اور ایسا نہیں ہے کہ وہ بالکل سر پہ مرکوز light compartments Water میں بند ہیں۔ یہ صورت حال ۱۹۳۰ء تک کم و بیش چلتی رہی ہے جس اس درمیان میں جو بڑی تبدیلی ہوئی وہ یہ ہوئی کہ بعض انہیں نے امریکی 'روسی اور انگریزی' انسانوں کے بہت سے ترچے کرالے۔ کچھ نے چینی 'جاپانی اور دوسری زبانوں سے

بھی کیجئے گئے۔ ان ترجموں سے جو قاتل ہوا، وہ بہت ہی غامض طریقے پر ہو۔ یعنی پالت
 پالنے کا شعور کردار نگاری کا شعور کہانی کو کیسے شروع اور کیسے ختم کریں۔ اس بات کا شعور
 ان افسانوں نے پیدا کیا۔ ظاہر ہے کہ ان افسانوں کے جو موضوعات تھے وہ موضوعات
 ہمارے اپنے نہیں ہو سکتے تھے ہمارے ملک کے نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن جو ٹھیک لکھنے کا
 ادب تک اور فن کے لوازم تھے، ان کے حلق چو تک مغربی افسانہ نگاروں کو زیادہ سمیت
 حاصل تھی اس لیے ترجموں کی وجہ سے زیادہ توجہ ہونے لگی۔ اس زمانے کے حرمین میں
 پروفیسر حبیب، منصور ابو، خواجہ منظور حسین، جلیل قذافی، عبدالقادر سہروردی وغیرہ اہمیت
 رکھتے ہیں۔

یہ لوگ اردو افسانے کو مغربی افسانے کا ہم پلہ بنانے کی فکر میں تھے اس لیے ان
 لوگوں نے جتنا کام کیا ہے وہ اس نقطہ نظر سے کیا ہے جو ایک علاج پند کا ہوتا ہے۔ خود
 ان لوگوں میں سے کوئی بھی اعلیٰ پائے کا افسانہ نگار نہیں بن سکا۔ حالانکہ حبیب صاحب کے
 مجموعے ”کیسا گر“ اور جلیل قذافی کے ”مقام خیالی“ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔
 ان لوگوں کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے فن کے لوازمات کی طرف
 توجہ کر دیا۔

ان حرمین کا یہ بہت بڑا کارنامہ تھا۔

یہ بعد ستائیس کی زندگی کو تو پوری طرح گرفت میں کس لائے اور نہ یہ سمجھ سکے کہ
 ہمارے موضوعات کیا ہوں لیکن فن کے اچھے نمونے ضرور پیش کر چکے۔ اسی وجہ سے آپ
 دیکھیں گے کہ اس کے بعد کے افسانہ نگاروں کا فنی شعور دیکھنے افسانہ نگاروں کے مقابلے میں
 زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ کم سے کم ان کو اس بات کا احساس ہے کہ وہ نہ محض مطلب کے چور
 نہیں اور نہ محض قصے کو قصے کی غرض سے کہنا چاہتے بلکہ ان کو اس بات کا شعور ہے کہ دنیا
 میں جتنے افسانے لکھے گئے ہیں اس قسم کے افسانے لکھنے کی نہیں بھی کوشش کرنی چاہئے۔

اب یہاں پر ”گر چہ پانچ جیس“ ایسی انٹھی ہو جاتی ہیں جن کا افسانے کے ارتقاء سے
 گہرا تعلق ہے۔ سب سے ”آج“ جس کی طرف ہمارا خیال جاتا ہے، ہندوستان کی سماجی اور
 سماجی بہت حالی ہے۔ دوسری پریم چند کی حقیقت نگاری کی طرف قدم بڑھانے کی صہ۔ تیسری
 وہ بے شک دھانوی اور بہت حد تک ادبی انداز نظر سے جو لہرام اور ان مقابلین کے ہمار

پایا جاتا ہے۔ چہ فحی جہ ہندوستان کی وہ سیاسی جدوجہد ہے جو ایک ایسی سطح پر اٹھی تھی جہاں گھرے ہوئے باطل کی طرح پھٹ جانے یا طوفان کے امڈ آنے کا تصور ہمارے دہن میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ ساری کی ساری چیزیں خامی طور پر یک فحی۔ اس میں جب مطلبی تعلیم کا اضافہ ہوا اور ادب کے ایسے لوگوں کی طرف ہماری توجہ مکی تو ان سب چیزوں نے مل کر ایک نئی انسانی تحریک کو جنم دیا جس کی ایک ہندوئی ناقص اور ناقص صورت "۱۹۳۰ء" کی شکل میں ۱۹۳۰ء سامنے موجود ہے۔ "۱۹۳۰ء" میں آپ دیکھیں گے تو یہ پختہ پوری کا جو مذہبی کھیلے ہیں اور انہما ہندی کے خلاف جماد تھا وہ بھی پایا جاتا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کی تحریک ہے اس کے تصورات اور اثرات بھی پائے جاتے ہیں جو مطلبی اثرات اور انسانہ لہجے کے فنی عوام ہیں اور ان کے مزید تجربے یورپ میں ہو رہے تھے ان کے اثرات بھی دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں وہانیت اور حقیقت ایک خاص انداز میں مل گئے ہیں اور وہ انساں دوستی ابھرتی ہے جس کی طرف پریم چند مسلسل سمجھنے لے جا رہے تھے۔

اگر آپ غور سے دیکھیں تو ۱۹۳۰ء میں بھوی اور ناقص شکل میں سب کی سب چیزیں مل جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے جب ۱۹۳۰ء کا ذکر آتا ہے تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ اگرچہ وہ انسانے اعلیٰ پائے کے ہیں ہیں غیر متعلق اور بھیاں خیر انقلابی دہنوں کی تخلیق ہیں یا محض انسانی ادب میں نئے تجربے ہیں لیکن پھر بھی ان انسانوں نے اپنا وہ فرض سر انجام دے دیا جو تاریخ میں انہیں انجام دینا تھا۔ یعنی ان لکھنے والوں نے نئے نئے دہنوں میں تجربے کی جرات پیدا کر دی۔ جانے پچانے راستوں سے بننے کی جرات پیدا کر دی۔ زندگی کے مسائل کو پیش کرے کے لیے نئے میڈیم اور نئے طرز کو متعارف کرنے کی جرات پیدا کر دی۔ بعض ایسی نئی چیزوں کی طرف توجہ دلا دی جو اس تک لکھوں سے اوصل تھیں۔ ان میں سے دو بھاری چیزیں تھیں۔ ایک - شلزم کا تصور دو دوسرے تھیں نفسی اور جنسی زندگی پر عمل کرانہ دیکھنا۔ اس دونوں کی بنیاد آپ ۱۹۳۰ء کے مضامین میں پائیں گے۔ اگرچہ یہ عجیب و غریب آمیزش ہے تاہم ان انسانوں میں یہ موجود ہے۔ ان انسانوں میں ایک طرف شلزم کی توجہ، نفسی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور دوسری طرف فرائڈ ازم اور جنسی تسکین جنسی بھوک اور جنسی صحت کا تصور پوری طرح مسلط ہے۔ یہ ۱۹۳۰ء تک کی تصویر ہے میں ۱۹۳۰ء اس لیے لکھتا ہوں کہ کتاب تو غالباً ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی لیکن اس کے شامل شدہ

بعض افسانے ۱۹۳۰ء میں لکھے گئے تھے۔ اس وقت یہ رقصان و میرے
دو دھڑکنے والے اور ان کی بنیادیں مضبوط ہوتی تھیں۔

پھر ۱۹۳۶ء میں ایک تاریخی ناول لکھے ہیں اور اپنی ادبی زندگی میں جسے بہت
سے لوگ ایک ادبی خلل تسلیم کرتے ہیں۔ بہت سے نہیں بھی کرتے۔ لیکن ہم حال وہ ایک
سوالی تھا جب ترقی پسند تحریک شہر ہوئی۔ یہ ترقی پسند تحریک بھی مندرجہ بالا اثرات کے
نتیجے کے طور پر وجود میں آئی تھی۔ یہاں سے ہم کو افسانہ نویسوں کی ایک نئی پار سے واسطہ
پڑتا ہے۔ ان میں سے چند ایسے ہیں جنہوں نے بہت جلد ادب میں اپنی جگہ بنا لی جیسے کرشن
چندر، بیدی، اٹک، اختر رائے، پوری، صحت، حیات اللہ، ستوا، احمد علی دہلوی۔

اگر آپ نے ان کے افسانے پڑھے ہوں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ لوگ خیال
پرستی اور معاشرت کی مٹولیں طے کر کے ترقی پسندی تک پہنچے۔ مثلاً کرشن چندر ہی کو سمجھئے۔ ان
کا پہلا مجموعہ ”عظم خیال“ ہے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ اس پر پروفیسر فیاض محمود کا ایک بہت طویل مقدمہ ہے۔ مجھے یہ بات
یاد آتی ہے کہ اس مقدمے میں انہوں نے ان کے حقیقت پسندانہ انداز کو نہیں سراہا ہے
بلکہ ان میں ہر دعوائی عنصر پر اس کی تشریح کی ہے۔

کرشن چندر کے یہاں اس وقت خیال آرائی اور دعوائی عنصر کی اطلاع تھی۔ شاید اسی
لئے انہوں نے اپنے مجموعے کا نام ”عظم خیال“ رکھا تھا۔ اس مجموعے کے افسانوں میں ہم
کو ہفتاب کی زندگی کی وہ فضا اور تصویر ملے گی جو عام طور پر ایک نوجوان محبت کی جستجو کرتے
ہوئے اپنے دل میں پاتا ہے۔ اس کے اندر کوئی پورا غم نہیں، قوت و افلاس کا سماں، احساس
نہیں اگر اس کا ذکر اتفاقاً آجاتا ہے تو دوسری بات ہے۔ ان کے افسانوں کا بنیادی موضوع
نہیں ہے۔ اس کے بعد ان کا دوسرا مجموعہ ”نظارے“ شائع ہوا۔ مگر آپ ”نظارے“ اور
”عظم خیال“ کو ایک ساتھ دیکھ کر پڑھیں گے تو آپ محسوس کریں گے کہ ”نظارے“ کا مبالغہ
کوئی دوسرا آدمی ہے یا کرشن چندر نے کوئی اور دنیا دیکھی ہے۔ اس میں ”دو فرنگی“ جی
سڑک“ اور ”خولی تاج“ جیسے افسانے شامل ہیں۔ ہندوستان کی آزادی کی تحریک ایسی تیزی
سے آگے بڑھ رہی تھی، خیالات میں اتنے شدید انقلابات آئے شہر ہو گئے تھے کہ کرشن
چندر کے لیے یہ بالکل ناممکن ہو گیا کہ وہ اپنے ”عظم خیال“ کی دنیا میں پھنسے رہے۔ لہذا ان

خیالوں کی ظلمی دنیا سے باہر نکلے اور ان حالات کا بھی نکال دیا جو ان کے گرد و پیش تھے۔ یہ باتیں میں نے تبدیلی کی مثال کے طور پر کہی ہیں۔ اس کی روایت جیسا کہ آپ کو معلوم ہے پریم چند نے قائم کردی تھی بعض افسانہ نویس اسی راستے پر چل بھی رہے تھے جیسے کسی حد تک سدرشن 'پھر رات کو ایک' جو اپنے آپ کو پریم چند کا مقلد اور شاگرد کہتے ہیں۔ علی عباس جیسی جو ان سے متاثر ہوئے کا ذکر نہیں کرتے، لیکن جو حال کم و بیش انہوں نے بھی پریم چند کا راستہ اختیار کیا تھا۔ مادہ 'نثر' جسوں نے گھریلو زندگی کے پھولے پر رے واقعات اور عام لوگوں کی زندگیوں پر پھولیں پھونکی کنا یاں اس زمانے میں لکھیں۔

تو ایسا تھا کہ جو لوگ ان دنوں افسانے لکھ رہے تھے ان میں سے وہ لوگ جو پریم چند کے قریب یا متاثر تھے اور وہی فنون نظر رکھتے تھے ان لوگوں نے ترقی پسندی کی تحریک کو بلیک کرنا اور ایسا محسوس کیا کہ اس تحریک کے ذریعے سے ان کی جو لکھی کی خواہش ہے یا جو ان کے لکھنے کا احتیاج ہے وہ زیادہ پائدار بنے گا۔ اس سے رہا نہ طاقت اور توانائی گئے گی۔ ان کو 'چانک' موضوعات کی وسعت کا بھی اندازہ ہوا۔ انہوں نے دیکھا کہ جو موضوعات اس وقت تک چھوڑ دیئے جاتے تھے ان سب کو جی آسانی اور خوبی کے ساتھ اپنے افسانوں میں لائیتے ہیں۔ جہاں تک اردو افسانہ نویسی کا تعلق ہے ۱۹۳۵ء کے بعد بہت کم ایسے افسانہ نگار رہ گئے تھے جو عصری زندگی کے نئے عناصروں سے متاثر نہ ہوتے ہوں۔ پھر بھی موضوع کے اہم ہونے اور انفرادی زندگی کے مسائل کو پیش کرنے کے بارے میں ایک طرح کی تکلف برآمد رہی رہی۔ اسی میں وہ بھی شامل رہے جو اپنے آپ کو ترقی پسند کہتے تھے۔

بچہ افسانہ نویسوں نے ایک طرح کے روحانی انداز میں جنس زندگی 'عروانی اور فحاشی کو اہمیت دینا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۵ء کی ترقی پسند کاغذیں منعقد حیدر آباد میں ایک قسم کا رینولوشن پیش کرنے کی صورت پائی کہ ترقی پسندی پر جو یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اس میں عروانی، بد حیثیت اور جنسیت کی طرف بہت زیادہ میلان پایا جاتا ہے ہم اس سے بالکل نفی پیشگی کا اعلان کرتے ہیں اور ترقی پسند تحریک کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

یہ تجویز پاس نہ ہو سکی۔ کیونکہ مولانا حسرت موہانی اور قاضی عبدالغفار نے اس کی بہت شدید مخالفت کی لیکن یہ بات ضرور واضح ہو گئی کہ ترقی پسندوں کے پیش نظر جو زندگی کی تصویر تھی اس میں جنسی موضوعات مکمل جنس کی حیثیت سے نہیں بلکہ سماج کی ایک حیثیت

کی حیثیت سے آتے ہیں جو پورے سماجی نظام کو درہم برہم کرتی ہے۔ دروازوں کا ڈھلوانا ہے اور اس طرح نہ ایک اہم سماجی مسئلہ بن جاتی ہے۔ اس وقت بھی یہ بحث تھی اور آج بھی ہے اور کل بھی ہوگی کہ انسانی زندگی میں جنس کی کیا جگہ ہے۔ اور ادب میں اس کا اعتبار کس طرح ہونا چاہئے۔ یہ سوچنا کہ ہم کسی وقت — اس سے پہلے کا حاصل کر لیں گے یا اسے الٹانے یا نظم کا موضوع نہیں بنائیں گے، محض ایک خیال عام ہے۔ تاہم ہر یہ حد بھی تصور کا بدلتے رہتا بھی ایک حقیقت ہے۔ دروازے الٹا۔ نگاروں کے لیے کافی نور ہے۔ انہیں سوچنا ہے کہ جب وہ کوئی جنسی موضوع میں تو اسے سماجی حقیقت کے طور پر پیش کریں یا محض انفرادی رجحان کی حیثیت سے 'ایک عبادی کی حیثیت سے' ایک انفرادی کبروی کی حیثیت سے اسے الٹانے کا موضوع بنائیں اور تسکین حاصل کریں۔

ان دونوں صورتوں میں فرق ہے۔ آپ کو ایسے سوچ میں گمے اور دنیا کے ہر ادیب میں ایسے لوگ موجود ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم یہی لکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو اعتراض کیا ہے اور ہمارے یہاں بھی ایسے الٹا۔ نگار ہیں جو اپنی آزادی کے پودے میں میر سماجی اور انسان دشمن مسائل پر لکھنے کی آزادی چاہتے تھے۔

میں اس وقت اس بحث کو نہیں پھینکنا چاہتا کہ نقطہ نظر کس حد تک خطرناک ہو سکتا ہے۔ میں نے کی قدر تفصیل سے اس کا ذکر اس لیے کیا کہ اب سے پندرہ بیس سال پہلے یہ بحث نہ صرف ترقی پسندوں اور غیر ترقی پسندوں میں چل رہی تھی بلکہ خود ترقی پسند بھی اس میں الجھ ہوئے تھے۔ اس لیے آپ کو خیال ہوگا کہ اس بار سنو کے حلقے ترقی پسندوں میں وحشت اخلاقیہ بنی۔ ان باتوں کا یہ مقصد نہیں کہ صرف جنس ہی انسانیت کا موضوع تھا۔ بلکہ اگر آپ تجویز کریں گے تو سماجی زندگی کے متحدہ پہلو آپ کو مایاں سو رہے ہیں گے۔ مثلاً ہندوستان کی سیاسی جدوجہد، مزدور تحریک اور اس کے، 'ثرات' افلاس اور غریبی کے نتائج۔ لکھا ایک طرح سے سوشلزم کی طرف ذہن کو متوجہ کرنے کی کوشش۔ غیر متوازن جنسی زندگی کا خوف۔ جنگ سے فطرت و فیوض سے الٹانے آپ ان موضوعات پر پائیں گے۔

میں نے شہر میں جو بات آپ سے کہی تھی اور جس کی طرف ہم بار بار پت کر آئیں گے وہ یہ ہے کہ اپنے عہد کی صداقتوں کو بکسر نظر انداز کرنا الٹا۔ نگار کے پس میں نہیں۔ نہ چاہے اسے ایک فنی حیثیت سے 'ایک ریو' پائندہ اور اعلیٰ تعلیمات میں

احاس کے 'یا بہت ہی محدود اور گھٹیا شکل میں چرچندے کے انداز میں پیش کر سکے۔ یہ دونوں باخبر افسانہ نگار کے امکان میں ہیں اور ہمیں ایک ہی السارہ نگار یا شاعر کے یہاں بھی اس کی مثالیں مل سکتی ہیں۔ کبھی زندگی اور اس کے تخلیقی گرفت میں آتے ہیں اور کبھی ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔ موضوع کے انتخاب میں افسانہ نگار بہت دور تک آزاد ہے۔ لیکن جب وہ پوری طرح اس کو اپنی مانچے میں ڈھال دے سکے تو وہاں السارہ نگار ناکام ہو جاتا ہے اور کبھی ہی موضوع ہو پریکٹیکل بن جاتا ہے۔ جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے جو لامعا رے زندگی کے کچے مواد اور بکھرے ہوئے حالات سے لیے جاتے ہیں اور انہی کی بنیاد پر افسانے بنیں گے۔ لیکن 'ادب' موضوع اور واقعات کس طرح اہل اہمیت اختیار کرتے ہیں۔ اسے السانہ نگار کو جانا چاہئے۔ مثال کے طور پر مجھے ایک بات یاد آئی، جب ہم مدنی گوشت اور شراب کا ذکر محض مدنی گوشت اور شراب کی شکل میں کرنا چاہتے ہیں اس وقت تو کسی بڑے بڑے اعلیٰ پائے کے ادب کا موضوع نہیں لیکن جب ہم مدنی گوشت اور شراب کا ذکر ایک ایسے مسئلے میں کریں جیسے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی آخری دعوت کے منظر میں پیش ہوا تھا کہ انہوں نے مدنی کے ٹکڑے تو توڑ کر اور ذرا ذرا سی شراب اپنے شاگردوں کو دی اور کہا کہ یہ میرا گوشت ہے اور یہ میرا خون تو مدنی اور گوشت ایک بہت ہی اعلیٰ پائے کے 'ادب' موضوع بن جاتے ہیں۔ اس حقیقت میں فرق اس طرح آیا کہ محل کیا ہے۔ دینے کا انداز کیا ہے اور ضرورت کیا ہے اسے اپنا خون اور گوشت کسے کی۔ یہ آخری کہا تھا جو حضرت یحییٰ اپنے شاگردوں کے ساتھ بیٹھے کھا رہے تھے انہوں نے اسی وقت اس بات کا ہی اعلان کیا کہ تمہیں میں سے ایک شخص مجھے گرفتار کرے گا۔ ایسی حالت میں ان چیزوں کی حیثیت بالکل بدل جاتی ہے۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کوئی موضوع نہ ہم کو بظاہر معلوم ہو اور نہ وہ اعلیٰ ادب کا موضوع نہیں بن سکتا۔ نہ انتہا میں نہ انتہا میں نہیں ہو سکتا۔ انتہا میں (ہم کو) Hunger میں ہم کو ایک غیر معمولی چیز بن گئی ہے جس کو میٹھوں آپ اپنے ذہن سے نکال سکتے ہیں۔ تب کا لاکھ بٹ بٹا ہوا 'آپ' بالکل آسودہ حال ہوں لیکن ہم کو آپ کے ذہن سے ہٹ نہیں سکتی۔ جس بات پر میں زور دیتا چاہتا ہوں یہ ہے کہ کوئی فوری حقیقت بذات خود اہم یا غیر اہم نہیں ہوتا بلکہ اس موضوع کو پیش کرنے کا طریق

اے اسم ہے۔

ہاتھ تھکی اس انسانہ لڑکی کی جس کا ارشاد ہے "میں نے کب ہوا۔ لیکن چند عرصے
مستراح پہلو ایسے نکل آئے جن کی وضاحت کے لیے رکنا پڑا" کیونکہ موضوع کو نہیں کرنے میں
کامیابی ہی کی بناء پر ایسے اور معمول انسانہ لڑکیوں کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے۔ اس حد میں جن
پرانے اور نئے انسانہ لڑکیوں نے اس فن کو سرزد کیا ان میں عباس حسینی اور کوثر چاند پوری
اعظم کریم جیسے بزرگ بھی ہیں۔ اور راجہ راجہ بیدی، کرن چند، احمد علی، منو، رشید جانا
حیات اللہ، اصاری، الہ، صحت، اختر انصاری، اختر اور لوی، سبیل عظیم، کبادی، ممتاز
ملتی، پریم ناتھ، ہرکی، آغا، ایم، ایم، اس راجہ راجہ، ہاجرہ سواد، صدیقی، مستور، رشید
سہاد، قلیز، مسیح الحسن، یونس، شکر، غلام عباس، نظام، حسین، شوکت، صدیقی، منور، ناتھ،
راجندر، ستیا، تھی، حسن، سری، احمد، عظیم، قاسمی، خواجہ احمد عباس جیسے جوان اور نوجوان
انسانہ لڑکیاں بھی ہیں۔ ان میں سب یکساں مرتبے کے میں ہیں اور۔ ان کے ارتقاء کی رفتار
یکساں ہے مثلاً علی عباس حسینی اور کوثر چاند پوری نے نئے ماحول کی ترجمانی نئے موضوعات
کی تلاش میں نئے انسانہ لکھنؤ کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی کوشش جاری رکھی۔ محمد علی اور
حسن عسکری شہر کی ایک خاص صنف پر پہنچ کر میدان سے ہٹ گئے۔ رشید جانا کی رفتار
ست ہو گئی لیکن انہوں نے صحت، صدیقی، ہاجرہ اور رشید کی راہوں میں چراغ جلا دیے۔

اس دور میں شہرت اور اہمیت کے لحاظ سے کرشن 'بیڈی' 'صحت' 'حیات' 'اللہ' 'منٹو' کے کارناموں پر نگاہ جاتی ہے جن میں سے ہر ایک نے فکر اور فن 'موضوع' 'مواد' اور انداز بیان پر قدرت حاصل کر کے اس میدان کو وسیع کیا جو پریم چند پھوڑ گئے تھے۔ بعض ایسے بھی ہیں جن کی شہرت کی ابتدا ہوئی تھی۔ کرشن چندر جس طرح بدلتی ہوئی ہندوستانی زندگی کے ساتھ روحانیت سے حقیقت کی طرف بڑھے اس کی جانب اشارہ کر چکا ہوں۔ آغا اور کتا ہے کہ گو ان کے لکھنے کے انداز میں ایک طرح کا جدائی اور شعائرانہ گداز ہا لیکن انہوں نے مواد کے لیے اس زندگی کو سامنے رکھا جو ہر لمحے سنے سانپوں میں اچلنے کے لیے تھلا رہی تھی۔ ان کے موضوعات کا شروع بھی حیرت خیز تھا۔ دس سال کی مدت میں انہوں نے "بالکل" "ان داتا" "گر جن کی ایک شام" "کونے ہوئے نارے" "زندگی کے موڑ پر" "عین غلغلے" جیسے افسانے لکھ کر افسانوی ادب کے نگار خانے میں بڑے صمیم مرتفعے کجا کر دیے۔

نے کم کھا تین "زانہ و دام" اور "مگرین" کے اکثر المانوں میں شعور فن کا مظاہر کیا۔
 بہت سامنے کے موضوعات سے بچ کر انہوں نے اپنے مواد سے کام لیا جو ان دیکھے نوازے کی
 طرح چمپا پڑا تھا۔ "مگرین" "مگر کوٹ" "دس صف بارش میں" "مگوارا فن" اور
 "سلس" ایسے ہی المانے ہیں۔ شعور کا فن شعور غالباً انسان فنی کے لیے سب سے زیادہ
 سونپا تھا۔ اس میں ایک طرح کا فطری ہوا۔ ایک قسم کی لذت آمد تھی۔ ان کے
 المانے پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ بغیر زیادہ کاوش کے دھو میں آگئے ہیں۔ ان کے
 المانوں کے دارما کی اختتام خاص طور سے حجب کرتے ہیں۔ لیکن ان کی افکار و تصانیف پندہ
 کبھی کبھی شعوری طور پر انہیں اپنے موضوعات منتخب کرنے پر مجبور کرتی تھی جو وقت کی
 انتہائی حقیقت سے ہم آہنگ نہ ہوں۔ یہ بات بے شک کم تھی۔ بعد میں زیادہ بڑھی تاہم
 ان کے متعدد المانے اس حد کی افانہ فنی کا لادال سرمایہ ہیں۔ صحت کی بے باک
 قیادت ان کی قوت اظہار سے اس طرح ہم آہنگ تھی کہ ابتداء ہی سے ان کے المانے حجب
 کرنے لگے تھے۔ شعور میں انہوں نے بھی ساری زندگی کے صرف چند پہلوؤں کو لیا۔ انہوں کو
 کہنا "ان پر تنگ ڈالا اور دیکھنے والوں کو الجھنی میں ڈال کر چھوڑ دیا۔ لیکن جب انہیں
 اپنے حد کے حقائق کا احساس ہوا تو ان کے موضوع اور مواد میں وزن پیدا ہو گیا۔ حیات
 اللہ انصاری نے بھی کم کھا۔ لیکن انہی حیات کی دھڑکنوں کو محسوس کر کے لکھا۔ اس طرح
 یہ سب لکھنے والے المانوی ادب کے افق پر چمکتے رہے۔ المانوی ادب میں اضافہ کرتے
 رہے یہاں تک کہ ملک تقسیم ہو گیا۔

میں نے صرف چند المانہ نگاروں کا ذکر کیا ہے جیسا کہ اکثر ہوتا ہے اور سوال کیا
 جاتا ہے کہ صرف انہیں کا ذکر کیوں؟ اس سلسلے میں میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے
 نہ تو نگاروں کی بددعائی ہوئی ہے اور نہ انہیں دوسرے المانہ نگاروں سے کوئی پر غاش ہوئی
 ہے۔ بلکہ اگر کوئی تفصیلی بحث ہو تو ہو سکتا ہے کہ دوسرے المانہ نویسوں کے نام بھی لئے
 جائیں جو اس حد میں لکھتے تھے لیکن جن کے ذریعے سے دہائی کی صدائیں اور فن کا شعور
 فن کی بالیدگی اور جہاں تک فن پہنچا ہے اور اس کو پہنچانے کا قصور ہے اس میں تمام لوگ
 نہیں آسکتے۔ ان چند بڑے المانہ نویسوں کے نام انہیں کے جن کے ذریعے فن کا ارتقاء ہوا
 ہے اور فن نے نئی حوصلیں ملنے کی ہیں جن کے المانے پڑھ کر ہم کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اب

ہمارے قدم کچھ آگے بڑھے ہیں۔ دنیا کی کسی بھی ادبی تاریخ میں تمام ناول نگار تمام ناول نگار تمام شاعر دنیا میں رہے۔ یہ بالکل غلط بات ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ان ہی لوگوں میں سے 'جن کو نظر انداز کیا گیا ہے کسی نے بہت اعلیٰ پائے کی چیزیں بھی لکھی ہوں۔ اور وہ بہت کے لئے دہن ہو گئی ہوں۔ لیکن ایسا بھی اتفاق ہی سے ہوا ہے جس پر ہمارا آپ کا کام نہیں ہے تاہم اس دور میں جن لوگوں نے اپنے لئے جگہ بنائی ہے، شہرت حاصل کر لی ہے۔ ان کا جو کہ کسی نہ کسی طرح ہونا ہی ہے اور دوسروں کا ان کے مقابلے میں کم ہونا ہے۔ جب کوئی تفصیلی کتاب لکھی جائے گی تو ان کا جو کہ بھی ہوگا۔ اگر آپ وہاں تھیم کی کتابیں مہارے المائے نیا افسانہ اور داستان سے افسانے تک" الفاظ دیکھیں تو اس میں ایسے افسانہ نگاروں کے نام بھی لکھیں گے جن کے المائے نہ تو آپ نے پڑھے ہیں اور نہ عالم پڑھیں گے اس لئے غلطی طور پر یہ ہونا ہے کہ جنہوں نے افسانہ نگاری کے فن کو سنوارا اور موضوعات کے انتخاب کے وقت زندگی کے تحریک ہوئے مواد میں سے بہترین چیزوں کا انتخاب کرنے کی کوشش کی ہے ان لوگوں کے نام سب سے پہلے ذہن میں آتے ہیں اور ان کی کوششیں اور کاوشیں ہمارے لئے ادبی سرمایہ بنتی ہیں۔

نہ یہ تو ایک ضمنی بحث تھی۔ آگے بڑھ کر زندگی کے مسائل اور ٹیزے اور پیچیدہ ہو جاتے ہیں اور ۱۹۳۷ء کے بعد کا ذکر اس لئے الجھن کا جب بنتا ہے کہ وہ ٹکوں کی تقسیم کی وجہ سے بہت سے المانہ نگار جن کو ہم عام طور پر یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ ہمارے ساتھ قدم طائے چل رہے ہیں، اگرچہ باقاعدہ پل تو نہیں گئے 'افسانہ نگاری کرتے ہی رہے لیکن ان سے ہمارا بعد کسی نہ کسی شکل میں ضرور بعد کیا، ان کا ذکر ہم اس طرح تو نہیں کریں گے، جیسے کسی انگریزی کے افسانہ نگار کا کرتے ہیں، لیکن یہ حقیقت کہ ان میں سے بعض نے جان بوجھ کر مدد کی اختیار کرنے کی کوشش کی یہی نہیں ہوا کہ وہ جہاں سے چلے گئے بلکہ یہ محسوس کرانے لگے کہ ان کا راستہ تلف ہے۔ انہوں نے جد ہالی بعد کو بھی بھیڑنے میں مدد دی ہے اس لئے اگر بعض دوستوں کے نام پھوٹ جائیں تو آپ مجھے مطالبہ کریں گے۔ وہ مجھے اب بھی عزیز ہیں لیکن کبھی کبھی ان کی حقیقت سامنے نہ ہونے کی وجہ سے ان کے حقائق کچھ کہنے میں بھی دشواری ہوتی ہے۔

تو ہوا یہ کہ ۱۹۳۷ء سے ہوا افسانہ نگار۔ افسانے نگار۔ ہم نے بھی اپنی رفتار

تیز گوی۔ مثلاً منو نے ۷۳۳ھ کے بعد بت لکھا اور کئی مجموعے شائع کئے۔ بعض دفعہ ایک ایک نشست میں پورے افسانہ غم کر دیا۔ افسانوں پر تو بھی پڑی ہوئی ہیں۔ کب و کجہ سکتے ہیں بعض مجموعے پانچ برسوں کے اندر لکھے گئے ہیں۔ "بادشاہت کا حاتمہ" "غالی و غلیس" "خان ابے" چند دنوں کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔

اس طرح سے کرشن چندر نے ان دنوں بہت زیادہ افسانے لکھے اور اپنے موصوفات پر لکھے بدلوں سے قریب تھے۔ بعض لوگ کہہ کر لکھتے تھے جیسے خواجہ احمد عباس 'اس کی رفتار بہت زیادہ تیز ہو گئی' یہ باتیں اہم سبب تھیں بدلتے ہوئے حالات کی نشانی ہیں۔

اب افسانہ نویسوں کی کئی قسمیں ایک وقت دکھائی دیتی ہیں۔ ایک تو وہ نسل ہے جو ۱۹۳۷ء تک پہنچی حاصل کر چکی تھی جن کا ذہن بن چکا تھا۔ اس میں ان افسانہ نگاروں کا بطور نام "نئے کا جن کا درہم پلے کر چکے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے بعض افسانے پچھلے زمانے کے افسانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ اچھے ہوں لیکن ہم انہیں اس وجہ سے ۱۹۳۷ء کے بعد کے افسانہ نگاروں میں بھی رکھتے پر بحیور ہیں جیسے بیدی حسوں نے "گلابوٹی" ۱۹۵۰ء کے قریب لکھا اور "اپنے دکھ مجھے دے دو" ابھی دو سال پہلے اسی طرح کرشن چندر نے "بہت جاگتے ہیں" "مسا کشمی کا بل" "داور پل کے بچے" جیسے اہم افسانے ۱۹۳۷ء کے بعد ہی لکھے۔ صحت کا "بچہ تھی کا جوڑا" "جڑیں" "نالی اماں" بھی اور ہی لکھے گئے اور حیات اللہ کا افسانہ "شکر گزار آنکھیں" اور "ماں بیٹا" بھی بعد ہی کے ہیں۔

ایک اور نسل جس کی شہرت ہو چکی تھی یک ایک جہاں ہو گئی، دایوں کیسے کہ بھائے دوام کے دربار میں داخل ہو گئی۔ اس میں غلام حسن، "احمد ندیم قاسمی" "مسح الحسن" "شوکت صدیقی" "ہاجہ خدیجہ" "میرزا احمد" "اے عید" "اختر اور ندوی" "ممتاز شیریں" "دہر بہوت سنگھ" "رضیہ" "سجاد ظہیر" "نثار حسین" "نور الحسن" "حیدر" "ممتاز علی" "انور دفیو" شامل کئے جاسکتے ہیں۔

اس کے فوراً پیچھے ایک اور صف ہے جس میں رام لال، "میلالی ہانو" "اقبال" "مبین" "ہم نامہ" "داہد" "تمیم" "میلانی" "شہبہ" "پنچ" "اقبال عید" "عاجہ سبیل" "رتن سنگھ" "روضہ رونی" "علاٹ احمد" "اشفاق احمد" "رحمان غنیمت" "آمنہ ابوالحسن" "دفیو نظر آتے ہیں۔

اس کے بعد ایک اور نسل ہے جو اوپر چار پانچ سال میں ابھری ہے ان کے نام ابھی دنوں پر نہیں چڑھے آہم غلام الفطین، "سابق حسین" "جوگندر پال" "غیر تمہیں" کے نام بطور

کوشش کے یاد آ رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ ان فرشتوں سے الگ رہے ہوں گے۔ ہر شخص اچھے گا۔ میں خود بھی الگ رہا ہوں کیونکہ بقول فیض یہ ناموں کی ایک کھول بن گئی۔ ان کے حلقہ کار تک تکھ کی جاسکتی ہے 'تھا' یہ ہے کہ یہ کھول بھی کھل نہیں۔ بہت سے لوگ اپنے ہندو افسانہ نگاروں کے نام۔ پا کر جیسے نہیں ہوں گے مگر میں جس انداز میں اسلامی ادب کے ارتقاء کی بات کر رہا ہوں ان کے لئے یہ نام بھی بہت ہیں۔ موقع موقع سے ان میں سے بعض کے حلقہ کار عرض بھی کروں گا۔

اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ جب آدرج حاصل ہوئی تو ایک ملک کے ملک بن چکے تھے اور اگرچہ ایسا بعض ناگرم حالات کے ماتحت ہوا تھا لیکن اس کے ساتھ ہر مسائل داہستہ بے باک اب تک ہیں اسوں سے دہن جذبہ اور ضمیر ہر جگہ کو سمجھ کر رکھا ہوا۔ حساس مطالعہ کے لئے یہ بہت بڑا واقعہ تھا۔ آزادی تلچن خوشی اور مسرت کی دھڑلہ اپنے ساتھ نہیں لائی جس کی تلاش تھی بلکہ بہت سے ملک اور شے 'بہت سی نفسیاتی الجھنیں بہت سی مادی پریشانیوں لائی۔ اگرچہ ہندوستان جمہوریت کی راہ اختیار کرنے کا مدعی تھا لیکن فوری طور پر جو حالات پیدا ہوئے، سوں نے اس ملک میں جھکا کر دیا کہ آزادی حقیقی آزادی ہے بھی یہ نہیں؟ کچھ لوگوں کے دہن میں یہ سوال یہی سی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن نوادہ نوجوانوں کے لئے سماجی اور سماجی تھا۔ شاعروں اور افسانہ نگاروں نے اپنے اس ملک کا اظہار اپنی تعلقات میں اکر لیا ہے۔

یہاں ایک خاص پسو کی طرف متوجہ کر دیتا ضروری ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سے سیاسی مسائل پر غور کرنے کی اوجہت اچھی خاصی دل گئی۔ افسانوں میں سیاسی مسائل جیسے پہلے آ کر کرتے تھے اب ان کی اوجہت نہیں رہ گئی۔ اس لئے ایک موضوع کم سے کم افسانہ نگاری سے خارج ہو گیا یعنی غیر ملکی جبر و ستم کے خلاف جو ہمارا احتجاج تھا ہماری افسانہ نگاری میں وہ اب باقی نہیں رہا۔ اب اس کی جگہ دوسری چیزوں نے لے لی ہے۔ اب تو ہم اپنے ملکی نظام کی خامیوں کی طرف لوگوں کو افسانہ نویس یا شکر کی حیثیت سے متوجہ کریں جیسے بعض افسانہ نویس یا شاعر کرتے رہے ہیں یہ اس پہلو کو نظر انداز کر دیں اور افسانہ نگار کی حیثیت سے زندگی کے ان تمام مسائل کو جو ہمارے سامنے آتے ہیں چاہے وہ فقیر کے ہوں یا ترقی یافتہ کے چاہے جمہوریت کی کامیابی کے ہوں یا ناکامی کے چاہے منصوبہ بندیوں کے بعض پہلوؤں سے

دائست ہوں چاہے وہ عوامی مذہب و مذہبی میں ۱۹۳۷ء کے بعد کے جو واقعات ہوئے ہیں ان سے حقیقت میں بحال سیاسی مسائل کی حیثیت کا نہیں رہا تھا۔ ۱۹۳۷ء سے پہلے قحی، لیکن چونکہ وہ اس سیاست سے ۱۹۳۷ء سے پہلے رہ چکی تھی اور جس نے بعض مسائل پیدا کر دیئے تھے رشتہ بھی رکھتی تھی اس لئے اس کے ابھر کا فوری تہوہ ۱۹۳۷ء کے بعد کہ انسانوں میں اکثر یہ ہے میرا مقصد فسادات سے ہے یہاں ہمارے سامنے جو انسانہ نہیں بنے ہیں۔ "یعنی ہمارا صاحب" رام لعل صاحب اور دوسرے حضرات "ان لوگوں نے بھی جو فسادات ہوئے اور جن کی بنیاد فرقہ دارانہ قحی اور جو شرارت فتنہ اور مہاجروں کے مسائل بنیں ہوئے وہ بچوں کی گمشدگی ہوئی جو عورتیں اغوا کی گئیں" جو گھر چھوڑے ہوئے ہوئے ہوئے اپنے گھروں کے پھولنے کی وجہ سے جذباتی انتشار پیدا ہوا" ان تمام مسائل کو اس جہ کی جگہ دے دی جو اس سے پہلے سیاسی مسائل کی حیثیت رکھتی تھی وہ مسائل جو غیر ملکی حکومت کی وجہ سے پیدا ہوا کرتے تھے۔ گویا ایک طرف سے موضوعات کا دورانہ بند ہوا لیکن دوسری طرف سے نئے موضوعات کا دورانہ نکلا۔ "حقیقی کام کرنے والے کے لئے یہ نہایت خوش آمدید ہوتی ہے کہ اس کے لئے کسی وقت میں ایک طرح کی حقیقی "ایک طرح کی غم پسندی اور انسان دوستی پیدا ہوئی جو سیاسی نظری "مجموعی اور جمہوری پیدا کرنے والی سے مختلف تھی اور یہاں پریم چند کی "جو ہمارے انسان کی سب سے بڑی دین تھی وہ ابھر آئی۔ یعنی انسان دوستی "عام سے ہمدردی اور ذہنی کو بہتر بنانے کی خواہش۔ وہ سب کو بے چین دیکھنے کے بے چین ہونے اور بے قرار ہو جانے کی جو روح ہوتی ہے اس نے مجبور کیا کہ انسانہ نہیں ۱۹۳۷ء کے بعد پیش "نے والے واقعات کی ایک پورے پورے عکاسی کریں۔

جیسا کہ "تپ کو معلوم ہے یہ بھی ایک بہت بڑا بحث طلب موضوع بن گیا کہ کیا فسادات "ملک کی تقسیم" مہاجروں کا ادھر سے ادھر ہونا "ایک ایسا ہے یا محض ایک انسانی ہے۔ کیا ایک انسانہ کار کا کسی حقیقی کام کرنے والے کا اس سے حائر ہونا ضروری ہے۔ یہ بحث بھی چمڑکی اور تپ کو یہ خیال ہو گا کہ بعض کھینے والوں نے اس وقت یہ لکھا کہ "ترانہ سے قبل قول کر انسانے کھینے جارہے ہیں بھی ایک طرف اگر ہندوؤں کی زیادتی دکھائی جاتی ہے تو دوسری طرف مسلمانوں کی۔ ایسا کہلا جاتا ہے کہ چھ نہ چلے کہ ہندوؤں نے زیادتی کی یا مسلمانوں زیادتی کی تاکہ کسی کا دل نہ دیکھے۔

اردو میں ترقی پسندی کی روایت

ادب جدید میں ترقی پسند ادب کا مقابلہ عام ہوتا جا رہا ہے، اس کا تاریخی پس منظر کیا ہے۔ اس مقالہ میں اس پر نظر ڈالی گئی ہے، ترقی پسند ادب کی توارجلہ کرنے والے کوئی ایسا مقابلہ نہیں کرتے جو غیر فطری غریب اخلاق یا ناشائستہ ہو، اسے عجیب اور انوکھا کہنا اور سمجھنا بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ تبدیلی کے قانون کو برے بھلے سب ہی مانتے ہیں، چاہے وہ کوئی فلسفیانہ نقطہ نظر رکھتے ہوں یا ہندوئی، لیکن ترقی پسند یا نئے ادب کا ذکر سننے ہی کچھ آنکھیں خشکیں ہو جاتی ہیں، کچھ ہاتھ قمر قمر کر غم کی جانب پڑتے ہیں، کچھ ڈپر وادوں سے ڈھونڈتی ہیں اور بہت سے دل غرت اور غصے کے طوفان سے بھر جاتے ہیں۔ قمری دہر تک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نئے ادب کا ذکر کرنے والوں سے لڑاؤ کوئی گھٹا ر اور گمراہ نہیں۔ شور بلند ہوتا ہے کہ یہ لوگ ادب کا مضموم نہیں جانتے۔ یہ شاعری کی دہری کو کھینچ کر عام انسانوں کی سطحوں میں لاکھڑا کر دیتے ہیں۔ اسے گور کر دیکھتے ہیں اور لفظ تاریخ اور سائنس کی مدد سے تیار کی ہوئی تنقید کی ترانہ پر ادب کو بھی قوت دیتے ہیں۔ بحر قیاس بلند ہوتے ہیں، مذاق اڑائے جاتے ہیں، اور لوگ اپنی جگہ پر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ بس جو کچھ تھا وہ اچھا تھا، جو کچھ ہو رہا ہے وہ برا ہے۔ اس کا ادب سے کوئی تعلق نہیں یہ چند سرچھو کی دقتی اور ہنگامی خیال آرائیاں ہیں۔ جو چند دنوں میں ختم ہو جائیں گی۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔

انہماک کے وہ شیدائی جنہوں نے نئے ادب کو جذبات اور محسوسات کے راستہ سے

پسند کرنا سیکھا ہے۔ جنہوں نے داغ نہیں دیا کو رخصتا ہے۔ جسوں نے قیوں لیفہ کو کوئی
 لٹائی جج کچھ رکھا ہے۔ جو ادب کو سانی رمدی کا مگر نہیں سمجھتے جو ان مذاہد کو نہیں دیکھتے
 جن سے صرف ادب ہی نہیں بلکہ اساموں کے در سے انہیں بھی بدھے ہوئے ہیں ان کے
 لیے قدیم اور جدید وہ ایسے نقطہ ہیں جو ادب کے جسم کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ شاید
 یہ کتا ملا وہ مناسب ہو گا کہ قدیم ادب کے ایسے پرستار جدید ادب کو بد گوشت اور جدید ادب
 کے عاشق قدیم ادب کو قائل و معنی سمجھتے ہیں۔ ایسے حضرات طنز لیفہ میں متعل قدروں
 کے قائل ہوتے ہیں۔ ادب کو ٹھہرا ہوا 'پاکار اور عہد مانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ادب کی
 تاریخی اہمیت بالکل نظر انداز ہو جاتی ہے۔

دنیا بچی تلی تیار شدہ اشیاء کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ تخریب اور تعمیر کے ارتقائی عمل سے
 ہر لمحہ نئی طرح صورت پذیر ہوتی رہتی ہے۔ اس ارتقائی عمل میں زندگی کے تمام مظاہر کی
 نشوونما ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے اور جس کا صحیح
 ادراک ہی زندگی کے شغفات کو سمجھا سکتا ہے۔ دور دورہ ایک دیوانے کا خواب ہو کر رہ جائے
 گی جس کا اعتراف صرف شک اور قنوطیت کے انداز میں کچھ اس طرح کرنا پڑے گا۔

اک مصرعے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا رمدی کا ہے کہ بے خواب ہے دیوانے کا

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم مہا پر دہم کہ ہم میں سوہ بھی کیا معلوم

دوسری ہے رشتہ عمر کاں دیکھتے تھے نے ہاتھ پاؤں پر ہے نہ پاؤں رکاب میں

یہ اشعار یوں ہی لے لے گئے ہیں۔ اس میں اس فطرت حورہ جمشہ اس کا پتہ چن
 ہے جو تبدیلی کے فلسفہ کو نہ سمجھ سکا لیکن تعمیرات کا مگر ہونا بھی اس کے لیے ممکن نہ تھا۔
 ارتقائی عمل میں تخریب اور تعمیر دونوں طاقتیں کام کر کے مقدار اور خصوصیت کے تناسب کا
 پتہ لگاتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ ایک نئی خصوصیت نمود پر ہو جاتی ہے اس نئی خصوصیت کا
 شعور کچھ لوگوں کو پرانی خصوصیت اور مقدار کے رشتہ کے ساتھ ہوتا ہے کچھ لوگوں کو ہر
 ہی نہیں اور کچھ لوگوں کو وجدانی اور جذباتی طور پر ہوتا ہے۔ سانی افعال و اعمال فکر
 خیال کی آمیزش سے جو نظام معاشرت بنتا ہے اس میں حکمران یا اقتدار رشتے والے طبقہ
 کی دو استیں اس کی پسندیدگی کے معیار اس کا فتنہ سلیم ہوتی لوگوں پر چھا جاتا ہے اور وہی
 صحیح معلوم ہونے لگتا ہے اسی میں تفسیر و تہن کی قدریں اخلاق کے اصول اور سچائی ملتی
 ہے اسے منکرین نے بار بار دہرایا ہے۔ مہی ضرب اشل الناس علی دین ملوکہم میں یہی بات

نقدی حقیقت ہے جو اختلافات کی ترس میں ہوتی ہے۔ اس کے تحت سے اور اسباب ہیں جن میں سے کچھ شعوری اور کچھ نیم شعوری ہیں۔

تبدیلی کا پہلے والے رائج اصول اخلاقی اور ادب کی پاکیزگی کو نہیں دیکھتے مطلقاً ہوتے ہیں اور یہ خواہش ان کی بدلتی ہوئی گول کی جالی ہے۔ لیکن خود کرنے کی بات یہ ہے کہ ہر جگہ اور ہر زمانے میں قدیم اصولوں سے بنیاد رکھنے والے کچھ پیدا ہوتے ہیں۔ اور ابتداء میں کچھ ان کی مخالفت جو اسے شہد سے ہوتی ہے ان کی کوششوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ جب یہ شعور کے دور کے بعد ہندوستانی زندگی ایک نئے موڑ پر آگئی، نیا متوسط طبقہ پیدا ہوا۔ تجارت صنعت و حرفت، کتابت، شاعری اور دوسرے اخلاقی تصورات نئی زندگی کی عکاس میں پیدا ہوئے، نئی رواجوں کی ضرورت ہوئی تو حالی نے اپنی رام کمانی چھوڑ کر نئی آواز سنائی۔ مسلمانوں کی جامعہ میں اسید کا بیکہ سرخ کیا جاسکتا تھا۔ حالی تاریخ کے تقاضے کو پار کر رہے تھے لیکن کھنڈ کے مشہور اخبار اور بیچ نے حالی کی شاعری، ان کی نظم کوئی، ان کی تبدیلی کی خواہش، ان کے نئے تصور حیات سب ہی کا مذاق اڑایا۔ حالی بد دل نہیں ہوئے لیکن اس کا پتہ چل گیا کہ وہ حالی جو اس کے قائل تھے کے تقدیر قدرت کا قانون ہے اور خیالات واد کے بغیر نہیں پیدا ہو سکتے، وہ اپنی راہ کو صحیح سمجھ رہے تھے اور اوروں سے دلچسپی رکھنے والے سیاست میں ترقی پسند نقطہ نظر رکھنے کے باوجود یہ شعور اور ادراک نہیں رکھتے تھے کہ ادب اور زندگی کے رشتہ کو سمجھیں، اس بات کا تعین کریں کہ بطور ادبی تبدیلی کے شاعری کی یہ نئی لہر بھی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ تو ایک مثال تھی۔ دہا کے ادب میں، اسکا مثالیں مل سکتی ہیں جب قدیم سے جذباتی دلچسپی رکھنے والوں نے ہر نئی تحریک کو قلب کی نظر سے دیکھا ہے، 'راج بھی مخالفت کرنے والے صف آراء ہیں، 'آج بھی یہی کہتا ہے کہ یہ دور اچھا ہے، 'لیکن تاریخ عالم بتاتی ہے کہ جس طرح بیٹہ قدیم دور میں ماضی حال میں پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح آج بھی جسے ہم اپنی 'ساری کے بے قدیم کہتے ہیں جدید کے بے جگہ چھوڑے گا۔ قدیم اور جدید وقت کے دھارے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے، 'سامانی زندگی ماضی، حال اور مستقبل میں اپنا دامن پھیلانے ہوئے ہے۔ اور ہر عہد میں اپنے ماضی رشتے، اپنے معاشی اور مذہبی اثرات سے اڑنے لگتا ہے۔ یہ تبدیلی کبھی بھی غیر شعوری ہوتی ہے اور خود فن کار یا شاعر کو اس کی خبر نہیں ہوتی کہ وہ ایک مخصوص ذوق نظر کیوں رکھتا ہے، 'اس کے علم میں کی نہیں ہوتی لیکن زمانہ کا عام وجد ان ہی انداز پیدا نہیں

ہوتا کہ خارجی حالات سے پیدا ہونے والے شعور کا پورا اور اک ہو سکے۔ ویسے تو ہر فن کار شاعر اور ادیب کے یہاں اس کے نہ لے کی تکلیف سانس لیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ چاہے وہ لہانہ کی آہ روکی اور تقاضوں کا اظہار مثبت میں کرے یا مد عمل اور اختلالات کے طور پر لگی میں 'لیکن جب وہ جتنے کل شعوری بن جاتی ہے' اور ادیب اس کا اظہار بھی کرتا ہے کہ وہ مخصوص حالات اور ہدایت کی ترہال کر رہا ہے تو وہ لوگ ہر کسی معاشرتی یا معاشرتی و صرف ذاتی سبب سے حالات کو بدنے دنا نہیں چاہتے وہ شور مچانا شروع کر دیتے ہیں جب غالب نے کہا تھا "یہاں کہ قادر۔ آساں بگر ایم" یا جب موسیٰ نے کہا تھا۔

اے حشر جلد کرتے دہلا زمین کو

ہوں کچھ نہ ہو امید تو ہے انقلاب میں

تو لوگوں نے اچھا شعر سمجھ کر قریب کردی تھی۔ اس کے بعد احساس اور عملی پہلو کو

سمجھائی نہ تھا لیکن آج جب انسانوں کو دعوت فکر دی جاتی ہے 'جب انہیں شعوری طور پر

ان کی زندگی کا متحد بنایا جاتا ہے' دیا کو اپنی خواہش کے مطابق عملی جامہ پہنانے کی جانب

متوجہ کیا جاتا ہے تو اسے غلط سمجھتے ہیں۔ انقلاب کہ وہ انفرادی خواہش چونکہ بے مرز تھی

وہ سروں کے مفاد سے ٹکرتی تھی 'اس لیے اس کی جانب کسی کی نظر نہ لگی لیکن موجودہ عہد

میں چونکہ انقلاب کا احساس اجتماعی شعور اور عمل سے تعلق رکھتا ہے اور امید کے بے پناہ

ہدف پیدا کرتا ہے اس لیے وہ لوگ جن کے مفاد بحال ہوتے ہیں یا خطرے میں پڑ جاتے

ہیں ان کے لیے اختلاف لازمی ہے اور قدیم روایتوں 'مطلق قدموں حسن اور طاعت' ان

سیم کی آڑ سے کر پور پیچھے کا الزام لگا کر اس کی اہمیت گھٹائی جاتی ہے۔

یہ بات کسی طرح ماننے کوئی نہیں چاہتا کہ جدیدوں کی مخالفت کرنے والوں اور

اہل رفاقتات پر معترض ہونے والوں کو اس بات کی خبر نہیں ہے کہ ساری دنیا کے ادب میں

تغیرات ہو رہے ہیں اور وہ تغیرات ساری دنیا کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔ موجودہ تہذیب

بنیادیں سرمایہ دارانہ اور استعمارانہ ہے 'بڑی دشواریوں میں جلا ہے اور انسانی آبادی کے

ایک بڑے حصے کو تسکین نہیں دے رہا ہے۔ دلوں میں نئے شک اور رہائوں پر نئے سوالات

ہیں سماجی عمارت کی دیوار میں رخنے پڑ چکے ہیں۔ معاشرتی زندگی میں غلامی واقع ہو چکا ہے۔

زندگی سیاست کی اقتدار پرستیوں سے بے ہوش ہونے ہر متفقہ نظام سے دلی ہوئی کرا رہی ہے۔

خانگی اور جنسی زندگی خاندانی روایات کے قدیم تصور سے ہر قدم پر تصادم ہے۔ طبقاتی ٹوٹ

کسوٹ میں آواراج ہونے والے طبقات پیدا ہو رہے ہیں اور اگرچہ حکمرانوں کی ساری

ہوئی اور کے لیے پناہ مان چلا دیتی ہے لیکن یہ بے غم کاری اجتماعی دکھ درد کا احساس نہیں
 کر سکتی۔ یہ دائمی انفرادی زندگی میں کم دکھائی دیتی ہیں لیکن اجتماعی احساس ان کا شعور جلد
 کر لیتا ہے۔ انتھاب اور تہی کی خواہش 'عوامل' پر مبنی نہیں ہے، 'ادی' کشش کا نتیجہ ہے،
 اپنی مصروفیات کا احساس ہے اور جب اس کا شعور مٹتی ہو جاتا ہے تو موانعت اور مخالفت
 دلوں میں رول پڑا ہو جاتا ہے اور دلوں میں رخ کی بدھتی ہوئی اور مٹی ہوئی طاقتوں کو پس
 پشت سے کر مقابلہ پر تیار ہو جاتے ہیں۔ دلوں کے راستے ایک دوسرے سے بالکل مخالف
 سمتوں میں جاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کائنات میں رگھونات کے حامیوں اور طہر
 واروں کے حق میں اس لیے عید ہوتی ہیں کہ بہت سے لوگوں کو جو جدائی مخالفت رکھتے ہیں
 کھائی کا پتہ چل جاتا ہے، تاریخی حقیقت کا شعور ہو جاتا ہے، اپنی قدریں اصولی اور فطرتی
 جگہ میں پس کر دیا واضح ہو جاتی ہیں اور اس کا فطرتی زندگی کے دوسرے پڑھتے در پڑھتے
 ہوئے مظاہر سے معلوم ہوئے لگتے ہیں اس لیے قدیم اور جدید کی بحث اگر خلوص کے ساتھ کی
 جائے تو ایک دوسرے سے نفرت کی گنجائش کم رہ جاتی ہے۔ جدید کی مخالفت کرنے والے
 صرف وہ لوگ ہوں گے جن کے ساتھ کو چٹ گھٹی ہے یا پھر وہ تاریخی کی رفتار زندگی کی
 جدائی چھیدنیوں 'حقائق' کی نشوونما کا شعور نہیں رکھتے، یہ ہے اس بحث کی تاریخی اہمیت۔
 ایک ضروری بات اور نظر میں رکھنے کی ہے کہ قدیم میں سب کچھ اچھا ہے اور نہ جدید
 میں سب کچھ برا، نہ پرانے ادب میں خرابیاں ہی خرابیاں ہیں اور نہ نئے ادب کا ہر لفظ
 کامل تحریف، بلکہ جس طرح پرانے ادب میں مواد اور صورت کے کل سے حیرت مہرے
 تیار ہوئے ہیں اسی طرح نئے ادب میں بھی الفاظ اور خیالات کی مدد سے دل کی بات کہی
 رہی ہے۔ پڑھنے والوں نے دلوں میں کئی بزرگ شاعر اور اصحاب گزر چکے ہیں لیکن چھ کے نام ہم یاد
 دینے کی ضرور رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کی بصیرت و درن کی گہرائی زندگی کی شہوں میں جیسی ہوئی
 ہے۔ ان کی تصانیف کے ہمیں جسے سن بھی نہ آتا ہے۔ اسی طرح نئے لکھنے والوں میں بھی
 سب دگر رہیں گے۔ صرف انہیں کو جیسے کا حق ہو گا جس کی نظر انسانی زندگی کی رفتار اور
 تہی جو اس کو خدا میں نہیں، عمل اور حرکت کے نتیجے میں دیکھ رہے ہیں جہاں تک نئے
 لکھنے والوں کا تعلق ہے ان کے بارے میں کسی قدر یقین کے ساتھ کہ جاسکتا ہے کہ وہ اسی
 کی عظمت کے منکر نہیں ہیں، وہ اپنے کو، ماضی کا ورثہ دے جاتے ہیں۔ اگر پرانے لکھنے والے
 یا قدیم ادب کے پرستار اس حقیقت کو سمجھ لیں تو بہت سی غلط فہمیوں کے دروازے بند ہو سکتے

ہیں۔

ترقی پسندی ایک تاریخی حقیقت ہے۔ سے معاشی یا معاشرتی تبدیلیوں کی روشنی میں ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ ان تغیرات کے باہر اس کا صرف ایک مایوسہ طبیعتی مفہوم نہ دینے کا اور یہ مفہوم تغیرات کے گھٹنے میں مد نہیں دیتا۔ ویسے تو ہر ملک اور ہر زمانے کا ادب اس عہد کے رجحانات کا شعوری اور غیر شعوری طور پر پتہ دیتا ہے۔ اس کے تجزیہ میں معاشی و معاشرتی حالات کا اثر ضرور دکھائی دے گا۔ لیکن اردو ادب میں غور سے پہلے ترقی کی واضح روایتیں نہیں ملتی۔ وہاں کی عہد بہ عہد ترقی کو چھوڑ کر اردو ادب میں نصف اسیویں صدی تک ایک طرح کی یکساںیت ملتی ہے۔ وجہ کے لیے کسی دور نہیں جانا ہے۔ ادب کا درباری رنگی سے تعلق، امر کی سرپرستی یا گیارہ وار نظام میں اونچے طبقے کی زندگی اور خوشحالات کا اظہار اس وقت تک یکسانیت اور یک رنگی پیدا کرنے کے لیے کافی تھے۔ جب تک یہ حالات ہندوستان میں موجود تھے۔ حالات حقیقت بہت کم لیکن روحانی حیثیت سے اب بھی موجود ہیں اس لیے بہت سے لوگ تاریخی طور سے غصے بلکہ جذباتی طور سے آج بھی انہیں کے اظہار میں تسکین پاتے ہیں اور ان کا رواج چلا جا رہا ہے ورنہ تاریخی حیثیت سے ان کا دور ختم ہو چکا ہے۔

ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے سے شروع ہو کر تقریباً مسلمانوں کے دواں تک معمولی معاشی اور معاشرتی تغیرات کے علاوہ کوئی ایسا انقلاب رونما نہیں ہوا جو رنگی کے دھارے کو بدل دے۔ وقت کی گود میں نہ جانے کتنے انقلابات سوتے رہتے ہیں اور ہر لمحہ تغیرات کی رو سے گزرتا ہے۔ لیکن ہمارے رنگی مع اپنے سارے اعلیٰ طبقے کے کروت لیتی ہے وہ مواقع ہر وقت نہیں آتے۔ ایک مخصوص نقطہ حرارت و دھلت پر پہنچ کر دلی بھاپ یا برف نئی شکل اختیار کرتا ہے۔ ہندوستان زندگی میں طبقاتی تعلقات 'معاشی اور معاشرتی زندگی اور کسی عہد تک درباری اور جاگیردارانہ تمدن کی روایتیں دہی رہیں' اس لیے ہندوستان کے فارسی ادب اور سنے پیدا ہونے والے 'اردو ادب میں رنگی کی نئی قدروں کا پتہ نہیں چلتا۔ صرف بادشاہت، دربار اور امارت کے عکس حقیقت اور مجاز کے پردے میں دکھائی دیتے ہیں۔ سترہویں صدی سے ہندوستان میں یورپ کی طاقتوں نے اقتدار کے لیے محکمش شہر کی۔ لیکن اس کا تعلق بھی بہت دور تک عوام سے نہ رہا اور اگرچہ آہستہ آہستہ اس نئی تہذیب نے اندری اندر ان جگہوں پر اپنا اثر ڈالنا شروع کر دیا۔ جہاں اسے

اقتدار حاصل کرنے کا موقع نہ لیکن اس کا مستقل اثر ایسویں صدی عی میں دکھائی دیتا ہے۔ اور اس وقت جب کہ دہلی اور اردوہ میں تقریباً پرانے عی صورتات کی کار فرمائی تھی بنگال کے اوسب اور مسلح نئے صورتات کے محل بنا رہے تھے بنگال میں انگریزی اور ہندو سرمایہ داری کا تصادم تھا اور اگرچہ یہ تصادم ایک دوسرے کے خلاف قہ کے جذبات پیدا کرتا ہے لیکن بنگال میں انگریزی نسیم نے ایک اصلاحیاد روشن خیالی پیدا کر کے انہیں جاگرواوانہ اقتدار سے انحراف اور تفرق پر مجبور کر دیا تھا۔ بنگال کے اوسب میں اس کا شمار ایک سرسری مطالعہ کے بعد بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ دہلی بنگال سے دہر تھی اس لیے وہاں کے دیوار اور دیوار میں زندگی بسر کرنے والے شعراء اس سے متاثر نہ ہو سکے اور ہمیں طرادی طور پر بلکہ بلکہ قہرات اور رجحانات دکھائی تو دیتے ہیں لیکن وہ چیز نہیں دکھائی دیتی جس میں نئی روایات تلاش کی جاسکیں جس میں تبدیلی کا تاریخی شعور ہو۔

اردو کے شعراء اپنی دنیا کے صحیح زمان اور سچے مصور تھے لیکن انفرادی بغاوتوں اور نزاع کے غیر شعوری خواہشوں کے آگے نہ بڑھتے تھے۔ ان کے دلوں میں زندگی کے بے کئی کے جذبے پیدا ہوتے تھے۔ حالات نامساعد اور حسدوں سے ہم آہنگ نہ معلوم ہوتے تھے لیکن چوں کہ ادب شعاشی اور اقتصادی نظام بدلتا ہی نہ تھا اسی لیے وہ اپنے انہیں تاریک خواہش کو اپنے اپنے سے چھٹائے ہوئے پڑے تھے اور اگر وہ انہیں چھوڑ دیں تو ایک جانب وہ اصول اخلاق سے بغاوت کرنے والے قرار دیئے جائیں گے دوسری جانب انہیں دقتوں اور نفعوں کے رک جانے کا مادی دچکا لگے گا۔ اپنے دیہاری تعلق اور جاگرواوانہ نظام کی دوائیوں میں پرورش پانے کے سبب سے وہ کسی مادی انقلاب کے رہنما بننے کی صلاحیت اپنے اندر نہ رکھتے تھے۔ معمولی ذہنی بغاوتوں سے آگے بڑھنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ ان کی ساکن اور چاہ دنیا میں انہیں حدود کے اندر رہنے رکھوں اور بدلتوں کی گھٹائش تھی مصلحتیہ کہ ان کا دور وقت پر نہیں اپنے عی گریبان پر پڑتا تھا۔ زندگی کے کسی شے میں کوئی اہم تبدیلی نہ تھی کچھ تک کوئی سیاسی نصب العین بھی نہ تھا جو حالات عی کو بدل سکتا۔ اقتصادی انقلاب ذرائع پیداوار اور تقسیم کے طبقاتی تعلقات میں قہ پیدا ہونے سے رونما ہوتا ہے اور وہ بالکل رے کے رے اور ٹھہرے ٹھہرے تھے۔ ان میں یکساہت تھی۔ اس لیے کوئی مادی انقلاب نہ ہو سکا اور جب تک مادی انقلاب نہ ہوا اس کی شدہ ضرورت کا احساس نہ ہوا تو ان کی تہوں میں کسی طرح کی تبدیلی کا شمار نہیں ہو سکتا۔ بادشاہ اور شای نظام کے طرف دار

ہونے کی وجہ سے شعراء کوئی انقلاب چاہتے بھی نہ تھے۔

فرد واقعات کے لحاظ سے یقیناً کوئی بڑا انقلاب نہیں ہے۔ کیونکہ دہلی اور کھنڈ کی حکومتوں کا خاتمہ صرف وقت کی بات تھی۔ ان کی اصلی قوت بہت پہلے ختم ہو چکی تھی۔ ان کے جسم سے خون چوس کر نکالا جانا تھا۔ انہیں صرف برطانوی تہذیب نے برقرار رکھا تھا۔ غالب اسی خیال سے اکثر عہدہ دار مسخ ملے اسے انقلاب نہیں قرار دیا ہے کیونکہ انقلاب کے ساتھ جو اچانک تبدیلی کا تصور وابستہ ہے وہ اس میں نہیں پایا جاتا لیکن یہ بات فخر احمد اذکرنے کے قابل نہیں ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد سے کوئی اتنی بڑی معاشی تبدیلی نہیں ہوئی جس کے ساتھ ہندوستان کی معاشی اور سیاسی زندگی بدل گئی ہو اور ان مادی روابط حیات کے بدل جانے سے ہندوستان کے فکر و خیال کی نشوونما بھی تبدیل ہو گئی ہو۔ فرد اپنے اثرات اور نتائج کے لحاظ سے اپنی تحریکیں اور فکری سرگرمیوں کے لحاظ سے 'جاگیواری' اور 'حوسط طبقہ کی تحکیش' کے لحاظ سے ایک بڑا انقلاب تھا۔ جس کے قریب ہی نئے معاشی تعلقات، نئے ادبی رجحانات، نئے طریقہ تعلیم، نئے طبقاتی روابط اور نئی اصلاحی تحریکات کے نئے طوفان اٹھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ 'جاگیواری' کا پرانا نظام، 'دوباروں' کے ساتھ تقریباً ختم ہو گیا اور نئی 'جاگیواری' کی بنیاد پڑی۔ انگریز تعلیم میں مسلمان بھی آگے بڑھے اور نیا حوسط طبقہ پیدا ہو گیا۔ حکومت ختم ہو چکی تھی۔ بہت سے لوگ اس کے خطرہ پر بیٹھے آندھا رہے تھے اور مغرب سے آئے ہوئے سبباً غالب پر آمنا تھے۔ یہ تحکیش معاشی تھی۔ انگریز نے پرانی 'جاگیواری' کا خاتمہ کر دیا۔ اس کی نئی 'جاگیواری' پیدا کی۔ صنعتی انقلاب جو تقریباً ساری دنیا میں اپنا اثر پھیلاتا تھا، ہندوستان میں شروع ہو کر رہ گیا۔ اس لئے یہاں کی شاعری اور ادب میں دونوں طرح کے اثرات نظر آتے ہیں۔ چلتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ جن لوگوں کا تعلق دکن و رام پور و دیوبند کے درباروں سے تھا۔ ان کی دنیا بدل رہی تھی۔ ہر پرانے کردار کی تحکیش میں شامل ہو گئے تھے۔ جدید تحریک کے علمبردار بن گئے۔

اس کے قریب جس ادبی تحریک کا نشیونما ہوا اور جس میں سرسید 'حالی' آزاد اور نذیر احمد کی 'بہتیں بہت نمایاں ہیں' اس نے نئی ادبی تحریک کی سرلہ ابتداء ہی نہیں کی بلکہ ہندوستان ادب کے ساکن و جاہر سندھ میں طوفان اٹھا دیا۔ اس وقت سے ہم جدید ترقی پسندی کی روایتیں تلاش کر سکتے ہیں اور ادب کا یہ تاریخی تصور ان تغیرات کی پوری ترجمانی

کرتا ہے جن کی گزریاں اس وقت سے اس وقت تک برابر چلی جاتی ہیں۔ غور کے بعد سے شعراء نہیں بناوے، کس نیز اور کس آہستہ کس سبک رفتار اور کس سوجوں اور گردابوں کے ساتھ۔ جن لوگوں نے اس تاریخی تبدیلی اور سماجی معاشرتی انقلاب کا تصور شعوری طور پر کر لیا تھا انہوں نے اس وقت کی طبقاتی تقسیم کے مطابق اپنے طبقوں اپنے گروہوں اور طبقہ کے لوگوں کو نئے حالات سے مقابمت کر لینے کی ترغیب دلائی کہ تاکہ ہر کے لئے ہوئے ہندوستان میں ایسی طاقت جاتی نہیں رہی تھی کہ وہ مسابقت کے علاوہ کچھ اور سامان نہکے جس بیداری کے دور کو ان کے حس نے دیکھ لیا جس امکانات پر ان کی نگاہ پہنچی تھی انہیں سے اپنے طبقوں کو بھی آشنا کرنا چاہتے تھے اس لئے ان کے یہاں بھی قدیم رواجی ادب کے مقابلہ میں ترقی پسندی کی ملائشیں برابر چلی ہیں۔ ان میں حالی کا شعور سب سے زیادہ متحرک اور جاندار تھا۔ انہوں نے اپنے پورے تصور حیات کو نئی حالتوں کے مطابق بنانے کے لئے ایک بدم مقادست کا سبق سکھایا۔ وہ اپنی نظم اور نثر دونوں میں یہی کہتے رہے "پھر اس طرف کو ہوا ہو جدھر کی" اور "خدا اس قوم کی حالت نہیں بد" ہے جسے خود اپنی حالت کے بدلنے کا خیال نہ ہو "پھر سے ہوئے مسلمانوں کو"۔ "بھولنے کی کوشش تھی۔ جس کا عمل کئی حیثیت سے سرسید اور ان کے ساتھی کر رہے تھے۔

اس طرح یہ یا دور بیداری تاریخ کو پشت بنا دیا کر شروع ہو گیا اور ایک بڑھتی اور بچتی ہوئی زندگی کے ساتھ ایک بڑھتے اور پھیلتے ہوئے ادب کی ابتداء ہوئی حال کا صرف ایک جملہ خامی حالات کی اہمیت کو ان لمبے کے لئے کافی ہے۔ مقدمہ شعور و شعری میں انہوں نے صاف کہہ دیا ہے کہ خیال بگیراد کے میں پیدا ہوا۔ یہی شعور سنگ بنیاد ہے ان تمام ادبی تکیرات کا جو ہم ہر کے بعد سے پاتے ہیں۔ ان کی اہمیت کا اقرار خیال کا مادہ کے نتیجے کے طور پر اور اک "یہ نئے صمد حیات ہی کا پھر رہا ہے" لیکن حالی اس ہیئت کے باوجود مسلمانوں کے جس متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے انہیں کی ترجمانی کر سکے۔ یہی حال کم و بیش اور لوگوں کا بھی رہا اسوں نے مسلمانوں کے نئے متوسط طبقے کے لئے مددائیں فراہم کیں جن کی جڑیں یک وقت صحنہ حال اور مستقبل میں پہنچی تھیں، ماضی سے الگ ہو جانا ممکن نہ تھا، حال کے تھامنے کچھ اور تھے اور مستقبل اسی طرح روشن بن سکتا تھا کہ انگریزی اقتدار سے مصالحت کر لی جاسکے۔ چنانچہ غور کے بعد سے جو چند دہائی خاص طور سے لہجہ ہو جاتی ہیں وہ اور۔ کہ تمام شعبوں میں انکسار پاتی ہیں۔ نذیر احمد کے ہاں۔ حالی کی

سید کرنا چاہتا تھا۔ ان لوگوں اور اسمیلیوں میں نشستوں کا قہقہہ اور ملازمتیں میں
ہندوستانوں کا افساد چاہتا تھا۔ اپنے سرایہ سے جہاں سرایہ کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا اور اس
لئے دو سو گنتی تحریک کو ملک کے لئے ضروری سمجھتا تھا۔

اس وقت ترقی پسندی کی یہی علامتیں تھیں اور نہ کے بعد سے جس طرح کی
ورجوں کا نشوونما رہا تھا اس میں کسی طرح کی کی نظر نہیں آتی۔ یہ عداوت تاریخ کا دورہ ہی
پڑا کر رہی تھی۔ اس وقت کے ادب میں وہ تمام افکار تھے جن سے حقوق کے لئے
لڑنے والے طبقہ کو تسکین مل سکتی۔ یہ بات ہی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ایسے شعراء
بہت کم ہوئے تھے۔ اب بھی رام پور اور دکن کے درباروں میں تھے اور زندگی کی نئی نگاہوں سے
دور دور نہ ہوئے تھے۔ اس لئے وہ قدیم دور کے روایات ہی کے ترجمان بنے
رہے۔ اگر ان کی آنکھوں سے آمو گئے تو وہ غم و خضہ کا پتہ نہیں دیتے۔ بلکہ مایوسی کے
دال ہیں۔ ایک دربار سنا تو انہیں دسرا مل گیا۔ اس نے اس کو راہیں لینے کی جگہ کھول
ضروری ہوئی۔ بھار اور تھل 'ترقی پسندی اور رنعت پسندی کی لڑائی ہندوستان میں ساتھ
ساتھ چلتی ہیں اور دونوں اپنے لئے الگ الگ دلائل پیش کرتی ہیں۔ اس وقت ترقی پسند ادب
پر بحث ہے۔ اس لئے اسی کے آثار کا ذکر کرنا چاہئے۔

جنگِ حکیم جلی اور ۱۸۵۷ء سے ملتا جلتا زندگی اور موت کا عجیب و غریب خاک تھا۔
رہنمائی دی۔ سیاست اور مہارت کے رقص میں انسانییت خوب بکلی گئی۔ 'سرایہ دار طاقتوں
نے اپنے سرایہ میں اضافہ کے لئے اور اپنے ریشہ کی حفاظت کی غرض سے جانوں کی قیمت
گھٹا دی۔ قہار اور خشک ساری 'پادری اور موت کی کرم داری نے یہ بات بہت سے لوگوں کو
مادی کہ حکومت کے وہ ظلم جو انسانی طاقتوں کا نہیں بلکہ انسانی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ
لوگوں کے لئے سید نہیں ہو سکتے۔ حاکم طبقے کا نام ہے جس میں رہتے ہیں اور 'مادام اپنے ملک میں بھی
اراد نہیں ہوتے' تنہا کے نام پر وہی ظلم کرتی ہیں۔ 'عرب حکومت کا ساتھ دینا
ہے اور تمام کو قحط کی تعلیم دے کر خاموشی کھڑے ہے آزادی کی ایک بے پناہ لڑائی
در اپنے ظلم زندگی کی تلاش ہوئی جس میں انسان زندگی کی قدر ہو جس میں صحت بخش
شدن کا موقع ہے جس میں دولت کی جس انسانیت کی قدر ہو جس میں نوازہ سے زیادہ
لوگ ریش اور مسرت کی زندگی بسر کر سکیں یہ کوئی خواب نہ تھا بلکہ ایسویں صدی کے وسط
میں ایسے ظلم و جبر کا پتہ چلا لیا گیا تھا کہ انسان پر انسان کی حکومت کا خاتمہ کر دینے'

دوسرے جنگ کے دوران ہی میں وہ رہتا ہوا اور دوسرے ملکوں نے بھی دوسری دیکھی۔
 سرمایہ داری کا قلعہ کرتے کرتے رہ گیا۔ ہندوستان جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے پوری طرح
 جاگیردارانہ تہذیب رکھتا رہا۔ عوام اندھیرے میں تھے لیکن دوسرے ملکوں سے روشنی ہمیں
 چمن کر پہنچ رہی تھی۔ انگلستان کے اس نقشہ پر جہاں فائدہ گر تھی اور موت کے سوا کچھ نہیں۔
 اعلیٰ کسی کے بتائے ہوئے ان کی کچھ میں یہ آنے لگا کہ اگر حالات بدل جائیں تو وہ اپنی رنجش
 کے سوا کچھ نہ کھوئیں گے۔ پڑھے لکھے جوان جنگ کے بعد اور بیمار ہو گئے۔ حدودِ حق ۱۹۱۹ء
 کی اصلاحات سے مطمئن نہ ہو سکا۔ ہندوستانی سرمایہ داری نے معمولی ترقی ضرور کی لیکن
 اس نے ہمارے تہذیبی کردار انسانوں کو معمولی فائدہ بھی نہیں پہنچایا۔ ہندوستان جنگ
 ہی کے دوران میں دنیا کے اور ملک کے قریب پہنچ گیا۔ گو جنگ میں خارجی حیثیت سے نہ تو
 ہندوستانیوں نے کچھ کھوایا اور نہ کچھ پالا لیکن اس بے اطمینانی اور اقتصادی کشش کا شمار
 ضرور ہو گیا۔ جو ساری دنیا پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ یہ تغیرات خارجی ہی نہ تھے۔ اسوں نے
 داخلی زندگی میں بے شعور "اور ترقی پیدا کر دی" اور اگرچہ غور کے بعد اب کوئی انقلاب
 ہندوستان میں نہیں ہوا تھا لیکن ساری دنیا میں جو انقلاب ہو رہا تھا اس کا اثر بہت گہرا پڑا
 نظامِ تمدن "لے وہب" سیاسی ادارے، طریقہ تعلیم، علم و ادب ہر چیز کی تہذیب کی جانچ اور پرکھ
 نئے طریقوں سے شروع ہوئی۔ قدیم چیزوں پر سے ایمان اٹھنے لگا۔ مڑا ہوں میں ایک طرح کی
 حنبلیہ مت اور خصل پیدا ہوا اور اس کا شمار مختلف شکلوں میں ہونے لگا۔ ادب میں بھی
 ایک طرح کی لکیر پندہ (Radicalism) قدامت سے بھیز چھاڑ دیا جس سے بنیاد کا
 ایسا شدید انکار ہوتا ہے جو ہر دور کے بعد والے تغیرات میں نہیں ہوتا۔ اس کی بنیاد میں
 مذہب اور اخلاق، معاشی اور سیاسی ادارہ سب پر سے کچھ کچھ گئے۔ قدیم کے ساتھ جو نقد
 کا خیال شامل تھا جس نے ظلم کی طرح باطل ہو گیا اور جس طرح کی آرونی خارجی حالات
 میں نہیں پیدا ہو سکتی تھی وہ خیالات میں پیدا کیے گئے۔ ابتداء میں اس کی صرف ایک
 طرح کی خواہش ہی تھی کہ جسے جیسے وقت گزرنا گیا ہے خواہش ہی عامانہ احساس
 اور نئی ہمسرت میں تبدیل ہو گئی یعنی صرف داخلی تبدیلیوں کا کافی مضمون ہو نہیں اور ادب پوری
 حالت سے اس بحث کی طرف منتقل ہو گئے کہ جب تک خارجی حالات میں تبدیلیاں نہ ہوں
 کی جب تک ان پر قابو حاصل نہ کیا جائے گا جی مسرت کے منتظر صرف خواہش اور خیال
 سے نہیں چمکتے۔

یہ نظریہ سنی حد پر رتی پسندی کی طرف ایک اہم قدم بڑھانے میں بہت معاون ثابت ہوئی۔ اس نے تعمیر کی رفتار تیز دینی ہے اطمینان اور اپنی انتشار کو خدایا پسپائی اور مسلم لوہ پر میں اور مدت دوسر کا احسنہ نقشہ پیش کر دیا۔ اگر اقبال کی ہدایت نقد 'یارِ فتح' پر کی گئی رہیں اور منظرِ عربہ قدس شمس سلطان حیدر جوش اور سجاد حیدر و یلدرم کے یہاں عشق و محبت کے کہیں کہیں صاف و درست نقش ہو۔ ہنگست کی وطن پرستی اور 'احرار' و لاسی حشری کی محبت سے محبت دوسر کا آخر سے سرورِ دہائی انکار جوش کی بنیاد میں 'سما' اصرار کی بے باک نہ۔ اصرار اس قلم باتوں سے مذہب 'اعلاق' خاکی زندگی اور عشق و محبت سے کا جانے سے سب سے زیادہ۔ سور نے نئی سل کی راہ سے وہ کانٹے بھی پڑا دیئے جو حالی 'سور' اور نذر محمد کے بعد باقی رہ گئے تھے۔

صلاح پسندی کے بعد تعمیر پسندی تک پہنچنا ہندوستانی 'سیاست' معاشرت اور ادب میں بہت بڑی بات تھی۔ جنگ عظیم نے فتح ہو کر نہ صرف ہندوستان کے لئے بلکہ ساری دنیا کے لئے ایسے مسائل پیش کر دیئے تھے جن کا تعلق زندگی کے کسی ایک شعبہ سے نہ تھا۔ بلکہ پورے نظامِ حیات سے تھا۔ اس کو بدلنے اور نہ بدلنے کا سوال تھا۔ انہیں ہر نتیجہ شخص کو ہونے لگا کہ حالات زندگی کی صورتوں کے مطابق نہیں ہیں۔ اس کا نام رکھئے 'جنگ' سے نچپے اور انہیں کو خدایا ہونے سے بچانے کی تدبیریں پر غور کیا جائے گا۔ ہندوستان نے بین الاقوامی مسائل پر غور کرنا شروع کیا اور یہ حقیقت آہستہ آہستہ واضح ہوتی چلی گئی کہ ہندوستان کا مسئلہ دنیا سے الگ نہ کر حل نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ آف نیشنز قائم ہوئی تو بہت سی ہنس ماند قوموں کو امید کی روشنی دکھائی دی کہ شاید انہیں بھی جینے کا حق مل جائے۔ انگلستان میں لیبر گورنمنٹ کے قیام سے بہت سے لوگ خوش ہوئے اگرچہ ہندوستانی سیاست کی باگ سروسے ملک کے ہاتھ میں تھی لیکن 'اند' اندر مزیدوں اور کسانوں کے مسائل بھی پیدا ہو رہے تھے۔ جس میں خوش رکھنے کے لئے بچانہ کارواں ہو رہی تھیں۔ ہندوستان ترک سوالات اور خلافت کی تحریک اٹھا کر ایک انقلابی دور سے گزرا۔ ابراہن اور ترکی کا انقلاب لیکن میں نئی زندگی کا تصور 'عرب' میں جنگ عظیم کے بعد حالات کو درست کرنے کی کلکشن 'روس' میں انقلاب کی کامیابی ان سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ ان داخلی اور خارجی اثرات نے ہندوستان کو جھنجھوڑ دیا اور تھوڑی سی مدت میں اس کے قدم ثقافت کی زمین میں جیسے گئے۔ بے چینی اور اضطراب نے 'پنا' گہرا لایا اور نظامِ زندگی کو بدل دینے کی خواہش کا

انھد ہر قدم پر ہونے لگا۔ اجماع کے باطل چھینے ہوئے دکھائی دینے لگے اور آزادی کا ہندوئی ملبوم اس حقیقی اور مکمل آزادی کے ملبوم سے بدل گیا جس میں معاشی آزادی کا تصور پچسے پیدا ہوتا ہے۔

تبدیلیوں کا گہواں میں چٹا تھا۔ پائے واپس اور کھولنے والوں کی مکمل جاری تھی۔ سرمایہ داری اور شہنشاہیت دونوں مہام کی بدقسمتی ہوئی طاقت کے مقابلہ میں قاشزم اور اصلاحات کا کرکٹوں کے حشر بند کر دینے کی فکر میں تھیں۔ ابھی جنگ کے بعد معاشی توازن درست بھی نہ ہوا تھا کہ جنگ کے ہاں پھر سوں پر مڑلانے لگے۔ قاشزم کی ترقی نے پھر دنیا کی زندگی خطرے میں ڈال دی۔ یورپ کے لکھنے والے نئے حالات کے مقابلہ پر تلی گئے۔ کیونکہ قاشزم کے مروج میں انہیں شہنشاہیت و تحن کا جتان اھتا ہوا دکھائی دیا۔ یہ بات واضح ہو گئی کہ قاشزم کا مقابلہ نہ کیا گیا تو علم و فن کا خاتمہ چلی ہے۔ اس کا احساس سیاست دانوں کو نہیں بلکہ انہوں کو ہوا اور انہوں نے قاشزم سے مقابلہ کے لیے یورپ میں کانفرنس قائم کیں اور انجینئرس بنائیں۔ یہی نائن تھا کہ دوس کی ترقی کی رفتار نے ہر جگہ دوپٹے والوں کو حاشا کر دیا۔ ہر جگہ کے ادب میں اشتراکیت کے اصولوں کی تبلیغ ہو رہی تھی کیونکہ ہر جگہ وہی انتشار اور بے چینی تھی جسے اشتراکیت حل کرتی تھی ہندوستان کی فضا میں یہی آواز گونجا شروع ہوئی تھی کیونکہ کوئی اور دوسرا راستہ جو غلطی، افلاس طبقاتی مکملش اور جنگ سے نجات دلا کر صحیح آزادی کی صدا پیدا کر سکے، دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اشتراکیت کے نئے خانے اصولوں سے مددانی لگاؤ اس کے بارے میں شک اور پھر اس کا صحیح علم عام طور سے پڑھے لکھے لوگوں کو ہونے لگا۔

موجود ترقی پسند تحریک کی بنیاد اور نشوونما کو سمجھنے کے لئے اس میں پھر نظر ال بین ضروری ہے کیونکہ ہندوستانی ترقی پسند تحریک دنیا میں ترقی پسندی کی تحریک اشتراکیت کے اصولوں کے پرچار، قاشزم کے خلاف تھی اور اہل کار قائم کرنے کی عام تحریک کا ایک حصہ ہے۔ اسے ان تحریکوں کے ایک جزو کی حیثیت سے سمجھا جانا چاہئے۔ لیکن اس سے یہ غلط نتیجہ نہ نکال لینا چاہئے کہ یہ تحریک باہر سے لائی گئی ہے یا ہر کی تحریکوں کی نقل ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ اس وقت ساری دنیا میں انسانی دکھ درد کو دور کرنے اور زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے جو تدبیریں سوچی جا رہی ہیں، جو درائش اختیار کیئے جا رہے ہیں، ان میں ایک طرح کی یکسانیت ہے، انہیں کی طرح ہی اور جنگ کے باوجود انسان ایک دوسرے کی جانب کھینچے چلے

آ رہے ہیں، خاص کر وہ طبقے جس کے مسائل میں یکسانیت اور جن کے مفاد کی فوجیت میں اشتراک ہے ان کا حریف فکر یکساں ہے۔ ترقی پسند ادیب ایک دوسرے سے متاثر ہیں۔ لیکن ایک دوسرے میں کچھ نہیں جانتے۔ ان کے موضوعات میں کافی اشتراک اور ان کے زاویہ نظر میں یک رنگی پائی جاتی ہے۔ لیکن ان کی اطروحات اس میں ہر جگہ الگ الگ رہتی ہے۔ بہت کچھ انہیں کے شعور پر منحصر ہوتا ہے۔ اور شعور کی پیدائش ان مادی روابط سے ہوتی ہے جن سے ایک انسان کا اس مادی زندگی میں گزارنا ناری ہے۔ نئے مادی حالات سے یا شعور نئے شعور سے نئی زندگی اور نئے ادب کا شعور یہ پید کی پیدا ہو، منطوق ہے۔ جس کو اس لئے میں کسی طرح کی داخل و بعدی دشواری پیش نہیں کرتی ہوں۔

ہندوستان میں کھل آزادی کا شعور ۱۹۴۷ء سے متاثر رہا تھا۔ لیکن آزادی کا مطلب کیا ہے؟ آزادی کب ملے گی؟ کیسے حاصل ہوگی؟ آزادی کے بعد زندگی کا نظام کیا ہوگا؟ انسان حقیقتاً آزاد ہوگا یا نہیں؟ آزادی کسی خاص طبقے کی ہوگی یا تمام لوگوں کی؟ ان سوالوں کے جواب پر ہے اصول سیاست اور قدیم سماجی معاشرتی فلسفہ میں نہ تھا۔ اس لئے خود آزادی چاہنے والوں کے یہاں اس نقطہ نظر کو صاف اور واضح کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ سیاسی جماعتوں میں نئے خیالات کی رنگ آمیزی شروع ہوئی۔ ساری دنیا پر نظریں گئیں اور ایسے نظام حیات کی تلاش ہونے لگی جو آزادی کا صحیح تصور پیش کرے۔ اس طرح دانشمندانہ فکر اور سوشلزم سے دلچسپی علمی، عملی اور شعوری جذبہ بن گئی۔ صرف ہندوستان کے نہیں دنیا کی حالات کا نگاہ تھا کہ اصطلاح پسند، فلسفہ، سنی اور جاہل قوم پرستی کے تصور کو بدلا جائے، ہندوستان کے مسائل کو دنیا کی آزادی اور نظامی خوش فہمی، 'اقبال مندی اور جاتی کا ایک جڑ سمجھ جائے۔ چنانچہ اس کا اظہار نظموں اور کہانیوں میں ہونے لگا۔ بعض کے یہاں یہ شعور جہادی اور معنوی تھا اور بعض کے یہاں علم و عمل کی دنیا سے آگیا تھا لیکن ہندوستان میں زیادہ تر ایسے ادیبوں اور شاعروں کا ابھی تک ہونا تھا جو زندگی کی جھنجھکیوں سے سر چراتے تھے۔ غلط فہمی دیا میں بنا، لیتے تھے اور ایک طرح کی خود فریبی میں مبتلا تھے۔ یہ حالات ان کی سمجھ میں نہ آتے تھے یا ان میں جرات نہ تھی کہ انہیں بد دینے کی تحریک کریں۔ ہر کچھ فوجیوں نے جرات کر کے وقت کے تقاضوں کو کچھ کہانیوں میں بند کیا اور 'لاہور' کی شکل میں اس کو کوئی ہوئی، راستہ نکلتی ہوئی، 'سحر' اور 'آواز' اور 'نار' پر پینٹ دیا۔ آواز بالکل نئی قسمی، لہجہ میں حرارت اور بہت کا پچھل تھا، مسائل سب اپنے ہی تھے،

ناجہ مگرا اور وسیع تھا۔ جسے صحت اور چوٹیں کڑی تھیں۔ اس نے ایک ہنگامہ ٹھہر کر ہوا
کتاب طبیب ہو گئی لیکن مخالف اور موافق گردہ تقسیم ہو گئے۔ دشمن عملی کام کے لئے ہوا
ہو گئی۔ عمل اور رد عمل کی حدیں ختم ہو کر ایک نتیجہ آ کر ہونے کی امید ہوئی اور وہ "انجمن
ترقی پسند مصنفین" تھی۔ چونکہ یہ مجموعہ "انکارے" خود ایک طرح کے رد عمل کی حیثیت
کھاتا تھا اس لئے اس کے مصنفین کے بے میں طنز اور تلوی 'جوڑ' اور ہدایت اس شعور
سے زیادہ تھی جس پر ترقی پسند ادب کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس کے مصنف خود انکارے را
بعض کہانیوں کو کوئی اعلیٰ کارنامہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے صرف ہوا کا سرخ ظاہر کہنے کا اور
سمجھتے ہیں۔

انجمن ترقی پسند مصنفین ۱۹۳۵ء میں قائم ہوئی۔ اس نے ترقی پسندی کی اس روایت کی
سختی حیثیت سے تکمیل کر دی جس کی ابتداء اندر کے بعد نئے احساس سے ہوئی تھی۔ اس
نے ماضی سے زندگی کا تسلسل یا 'سار' کا تجزیہ کیا اور مستقبل کی تعمیر کے لئے بہت ماسا مان
اکٹھا کر دیا۔ ویسے تو بہت سی جدید ادبی تحریکیں ترقی پسندی کے نام سے چل رہی ہیں لیکن
انجمن ترقی پسند مصنفین اس شعور کی رہنمائی کر رہی ہے جو ہر طور پر سارے ملک میں پڑ
ہو چکا ہے۔

ادب اور فنون لطیفہ کا ترجمان

سہ ماہی ذائقہ جدید

مدیر: جمشید حسان - مرتب: نویر رضوی

قیمت: بیس روپے

پوسٹ باکس نمبر ۷۰۴۲ - نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اردو تنقید کا ارتقاء ایک مختصر جائزہ

کسی ادب میں تنقید کے ارتقاء کا مطالعہ اس لیے ایک بحث طلب مسئلہ بن جاتا ہے کہ مختلف قسم کے لوگ مختلف قسم کے مطالبات کرتے ہیں اور یہ طے کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ تنقید سے کس قسم کا اندازہ نظر مراد لیا جائے۔ بحث میں کئی پہلوئیں اور کئی قسموں کو شامل کیا جائے اور کئی کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اس کی تاریخ کا نقشہ آگاز کیا ہو اور اسے تخلیقی ادب کے مقابلے میں کوئی جگہ دی جائے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ تنقید کی ایک کل حقیقت کے اندر بھی کچھ بھی نہیں ہے اور تقریباً ہر ادب کی ابتداء کے ساتھ ہی بعد میں آنی ہے۔ مگر ایک نئی شعور ہوتی ہے۔ روایت کا سم جاتا ہے۔ داخلی و خیالی تجربوں کے اظہار کا وسیع جاتی ہے اسالیب اور استعمال الفاظ سے پیدا کرنے کی صلاحیت اور قوت کا ادراک ہوتا ہے یہ ساری باتیں خاص قسم کی تنقیدی بصیرت کے بغیر مدئے کار نہیں آسکتیں۔ تخلیقی عمل کے ساتھ یہ تنقیدی عمل مسلسل جاری رہتا ہے اور فنکار کی قوت بے پناہ بن کر پرواز و ترتیب خیال، طرز اظہار اور انداز بیان کی ترقی اور قدیم میں مصروف رہتا ہے۔ اس لیے ہم ایک مضمون میں تنقید کی کہانی ادب کی کہانی کے ساتھ شہدع کر سکتے ہیں اور ہر ایک ادب یا شاعر کے یہاں سے خود یہ قدریں اٹھ کر سکتے ہیں جو درپہ اس کی راہ لگاتی

سنبھال رہی ہیں۔ یہ درست ہے کہ آپ باگداری کی حیثیت سے ایک واحد منف ادب کی حیثیت سے اس کے خدوخال دیر میں واضح ہوتے ہیں اور اچھا خاصا ادبی مجموعہ بن جانے کے بعد ہی اس کی پرکھ کے اصولوں کی طرف ذہن مائل ہوتا ہے۔ نام تنقید کے ان ابتدائی نقوش کو نظر انداز کرنا تنقید کے تاریخی ارتقاء کی ایک اہم اور بنیادی کڑی کو نظر انداز کرنا ہے۔ تنقید کے اس پہلو کو پیش نظر رکھنے سے ایک نکتہ یہ بھی ہو گا کہ تخلیق اور تنقیدی ادب کے باہم تعلق کا نقشہ بھی واضح ہوتا ہے۔ سامنے رہے گا۔ درہم ردہ نہ ہو یہ محسوس کر سکیں گے کہ ان لوگوں کے ایک مخصوص سماجی اور ذاتی ارتقاء کے مدار میں تخلیق اور تنقید کے بنیادی مسائل الگ الگ نہیں ہو سکتے۔

اس وقت متنگو مسائل اور ادبی تنقید کے ارتقاء سے ہے۔ اس لیے مختصر طور پر ہی سہی لیکن اس بات پر غور کرنا ضروری ہے کہ تنقید کا مسئلہ ہے کیا؟ کیونکہ اس طرح ہم یہ حتمی کر سکیں گے کہ ہم کس چیز کے ارتقاء پر متنگو کر رہے ہیں۔ ایسی بحث میں اختلاف نظر ناگزیر ہے اور اس سے گھبرانا بھی نہیں چاہئے کیونکہ جب تک تنقید سے بھی لڑائی بنیادی مسائل میں اختلاف کا رہو ہے، تنقیدی نقطہ نظر میں اختلاف کے وہاں تسامی سے ہاری کچھ میں آسکتے ہیں۔ اسے محض فنی سیلان قرار دینا ارتقاء تنقید کے تمام پہلوؤں کو نظر انداز کرنا ہے۔ اس حقیقت کو تو تسلیم کرنا ہی چاہئے کہ تنقید کا یہ سانس لینے کی طرح ناگزیر ہو لیکن اس میں وہ یکسانیت اور نظم بیضہ نظر نہیں آتا جو سانس لینے میں ہے۔ نظام محض میں ارتقاء نہیں، تنقیدی تصور میں ارتقاء ہے، جو نتیجہ ہے انسانی شعور کے ارتقاء کا۔ ہر حال یہ بات بالکل واضح ہے کہ تنقید سے ہر دور میں نہیں بلکہ ایک دور میں ایک ہی چیز مراد نہیں رہی ہے۔ تشریح و توضیح کو بھی تنقید کہا گیا ہے۔ بحالیاتی تاثر پذیری اور اس کے اتحاد کو بھی۔ تخلیق اور تائید کو بھی اسی درجے میں شامل کر لیا گیا ہے اور ماحولہ و محاکے کو بھی۔ ادب کو ہر خیال سے الگ کر کے محض ادب سمجھ کر رکھنے والا بھی غلوں میں غمار کیا گیا ہے اور ادب کو عام سماجی، نظام کا منظر تسلیم کرنے والا بھی۔ محض اور ذاتی پسند کی بنیاد پر رائے دینے والا بھی غلوں میں غمار ہے اور کسی فلسفہ ادب کی جستجو کرنے والا بھی اور پھر سب سے غلوں کو گالیاں دینے اور سراہنے کا سلسلہ شروع ہوا ہے تو اس نے بھی ہم سے غلوں کی کاوش فکر کی طرح ہوا و قیودے کی اصل اختیار کر لی ہے۔ اس لیے باقی تو بحثی کے ساتھ

تہذیب سے دُشمنی کو محدود کرنا چاہئے اور عقل اصول تہذیب سے، ثقافت کو نہیں نظر رکھ کر ادب کارناموں کے پر کھینے والوں سے سوداگر دکان چاہئے یا پھر ہرستان کے ثقافت کو اس کا موقع دینا چاہیے کہ وہ بھی اپنی دکان بگاڑ بیٹھے اور "تہذیبوں کو کھانے کھانے کے پر کھینے کا حق دے۔ تہذیب کے ارتقاء کی داستان بیان کرنے میں یہ دوسری صورت سمجھنا ہوگی تاکہ یہی نہ ہو کہ ہر نقطہ نظر اور ہر قائل ذکر ثقافت اپنی فریاد اور خامیوں کے ساتھ سامنے آجائے۔

اب دوسری دُشمنی یہ پیش آتی ہے کہ اس قدر مزاحمت دیکھنے کے باوجود مختلف ثقافت نظر کی اہمیت، افادیت اور قدر و قیمت کے حلقے خود مجھے بھی نہ کوئی نہ کوئی راویہ ثقافت اختیار کرنا پڑے گا تاکہ محکمہ میں کسی قسم کا سستی حاصل اور نتائج میں تسلی بخش نظر پڑ جائے۔ زاویہ ثقافت تو یہی چیز ہے، عملی سہولت کے لیے کوئی طریق کار پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ یہ طریق کار کسی قسم کے تاریخی اور عمرانی امداد نظر ہو تو عموماً ارتقاء کا مفہوم زیادہ واضح ہو سکے گا۔ ابتداء، "حلیہ"، "تہذیب"، "وسعت" اور "احتیاج" کی مختلف حدیں اسی طرح سامنے آسکیں گی۔ یوں تو یہیں حضرات کی نظر میں اردو میں تہذیب کا وجود ایک عرضی نقطہ اور معشوق کی مہموم کر ہے اور بعض حضرات کے خیال میں حال اور غلی سے آگے نہیں بڑھی ہے۔ لیکن جو ہر اہم صفحات (خراقات ہی سمی) تہذیب کی شکل میں موجود ہیں انہیں دیکھنا اور پرکھنا بھی تو ضروری ہے۔ آخر کچھ لکھتے وقت تہذیب کے نام پر کچھ لکھتے ہی رہے ہیں۔ ان تحریروں کی نوعیت کیا ہے۔

سب سے بڑی دُشمنی جو تہذیبی عمل کے حلقے کو سمجھنے کے مسئلہ میں پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر فرد کی اپنی اور تہذیبی قدروں کو الگ الگ اصولوں کے تحت رکھ کر عقل اسی مخصوص محدود دائرہ کے لیے عقل کرنا چاہئے یا ایسے اصولوں کی جستجو کرنا چاہئے جو زمانہ سے زیادہ اودار پر مبنی ہوں؟ لیکن یہ مسئلہ یہاں پھیلنے کا نہیں ہے۔ اس کا تعلق حالات اور تہذیب کے بنیادی اصولوں سے ہے۔ پھر بھی اتنا ضرور بجا لینا چاہئے کہ مسلسل کر لکھنے کے لیے سماجی حقائق کو بنیاد رکھنا ایک ایسا اقدام ہوگا جس کی جانچ، عقلی و درصحت کی پرکھ آسانی سے ہو سکے گی۔ تاریخی ارتقاء کی جستجو کے ساتھ ہی چیز میل بھی کھاتی ہے۔ ادب جن سماجی حاضریوں سے بعد میں آتا ہے، جن لحاظوں میں پیمانہ چلتا ہے اور جس حقائق حیات کا درس چھو کر چلتا ہے ان کو نظر انداز کر کے تہذیب کے ارتقاء پر غور کرنا بے معنی

ان مسائل کو ذہن میں رکھتے ہوئے اردو میں تنقید نگاری کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے لیکن ایک مقالے یا تقریر میں کھل اشارے کیے جاسکتے ہیں۔ جو اصول بننے والے اور میرا ہم یا اہم ثابت ہوتے رہے ہیں ان کا کھل تجزیہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ تنقید کے بعد کا تفصیلی بیان بھی نہیں ہو سکتا اور مختلف نثرات کے عمل اور رد عمل کی شرح بھی ضمنی طور پر ہی کی جاسکتی ہے۔ اہم قضاے سے وقت رد قضاے کی جگہ میں ہے۔ اداکار صرد پٹر کہ جاسکتا ہے جو مفصل بحث کے لئے قہید کا کام دے گا۔

جس وقت اردو شعراء میں ادب کے دور و خال ابھرے جس کا قدارہ ان کا اپنی حقہ تھی اس وقت اردو سے ادبی چٹکی سے ادب کے اصل ر تنقیدی سرور یا دھیت تھی یا ہو سکتی تھی اس کا اندازہ لگانا کچھ ایسا مشکل نہیں ہے۔ اسباب و احوال خیال کے جوچہ مانچے ان کی دسترس میں ہو سکتے تھے اور خود میں چند ہیں۔ اپنی زبان پار کی نئی زبان کو انہیں سانچوں میں ڈھال دینا اور انہیں کو معیار قرار دینے میں لیے صریح تھا کہ زندگی کے سانچے بھی بنے مائے موجود تھے اور ان سے انحراف کے محرکات پیش نظر نہیں تھے۔ یوں تو اردو زبان کی مرتبے سات سوسائے سے کم نہیں لیکن اس کی قابل ذکر ادبی زندگی سترہویں صدی سے شروع ہوتی ہے۔ عملی اور قاری ادب کی عمریں بہت زیادہ تھیں۔ ان میں فن اور فکر کی روایتیں بن چکی تھیں جن سے چھٹا کھانا طبقہ عام طور پر واقف تھا۔ جی سے کم اور لاری سے زیادہ بلکہ یہ کتنا مناسب ہو گا کہ یہاں سے جو عملی ادب سے اس کی واقعیت اتنی ہی تھی جتنی ایران کی ادبی روایات میں جذبہ ہر کر اس تک پہنچی تھی۔ ہندوستان میں ہونے کی وجہ سے اسے مسکرت اور پراکرت کے ادبی خیالوں اور تنقیدی روایات سے واقف ہونا چاہیے تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ نہ صرف ہندوئی دور میں بلکہ اس وقت تک اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی ہے کہ مسکرت کے ہندوئی اور تنقیدی اصولوں کو پرکھ کر ان سے کام لیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ اپنی کتاب نورس تھے وقت ابراہیم صاحب شاہ غانی نے مسکرت کے رسوں، بھانوں اور انکاں کو جاننے کی فکر کی۔ پھر دیگر انفرادی اور واقعیت کا نہیں ہے بلکہ اس کی روایت بننے کا ہے۔ جہاں تک ہندوستان متعلق ہے ان میں سے کئی کا ارتقاء تو خود اردو کے ساتھ ساتھ ہی ہوا اور ابتداء میں ان زبانوں کے اندر

جو مذہبی ادب تھا اگر اردو کے شعراء ان سے کم واقف تھے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ یہ ظاہر یہ خیالات ضمنی معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس بنیاد پر ہماری ادبی تنقید کی عمارت کھڑی ہوئی ہے اس کی جتنی کڑے ہوئے ان کوڑوں کا بھانپنا بھی ضروری ہے۔

عروں کا فن نقد قدیم تھا اور ایک سماجی پس منظر رکھتا تھا لیکن سماجی معاشی اور معاشرتی اختلافات کی وجہ سے فارسی نے اس سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا۔ دہرے دہرے یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ عربی فن نقد کسی مخصوص جمالیاتی فلسفہ پر مبنی نہ تھا۔ اس لیے ایران جس نے اپنے تمدن کا بڑا حصہ فراموش کر کے اسلامی عرب سے بہت کچھ مستعار لیا تھا کوئی متعجب نہیں کہ مرتب نہ کر سکا۔ اور جب اردو کے فن نقد سے اثر لینے کی صورت پیدا ہوئی تو اسے بھی شاید اس لیے وہاں کے نظام شعرو ادب میں سمجھا نہ جاسکا کہ وہ غلطی اثرات زیادہ عجزی سے چھارہ رہے تھے اس لیے اردو کو ایران سے فن نقد کا جو ورثہ مل سکا تھا وہی تھا۔ اگر ایران کے بڑے بڑے شعراء کے کلام کا مطالعہ کر کے کچھ اصول مرتب کیے گئے ہوتے تو ایک ایسے تنقیدی شعور کی بنیاد پڑ سکتی تھی اور جس طرح رد شعراء نے مختلف فارسی اصناف ادب سے کسب فیض کیا اسی طرح تنقیدی انداز فکر سے بھی فائدہ اٹھاتے لیکن تذکروں کے علاوہ اگر کسی فن شعری سے بحث کی گئی ہے تو وہ بھی اوجھڑی ہے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس پر اصناف نہیں کئے گئے ورنہ ادبی سینا نظامی عروضی اور مختلف طوسی نے جو خیالات ظاہر کیے تھے وہ مزید خورد لاکر کی بنیاد بن سکتے تھے۔ وہ تذکرے انہماک ان کا تنقیدی پہلو کنور اور نکتہ ہے۔

اس طرح اردو تنقید کسی اعلا بنیاد کے بغیر شہر ہوئی۔ جن شعراء نے شعرو فن کے حلق اپنے خیالات ظاہر کیے انہوں نے بھی کوئی ترتیب طرز نہیں رکھی۔ ان کی توجہ زبان و بیان کے ان پہلوؤں پر رہی جن سے محض ادبی واسطہ پڑتا تھا۔ گو ایک حیثیت سے شعرو فن کے لیے وہ باتیں اہم تھیں لیکن شعرو فن کی راہیں ان سے واضح طور پر نہیں نکلتی تھیں۔ ان کے نگرے ہوئے خیالات اور جمل اشاروں سے تنقید کے اصول اخذ نہیں کیے جاسکتے۔ اس کا سمجھا جاسکتا ہے کہ ان شعراء کے نزدیک پندرہ شاعری کیا تھی؟ یہ طریقہ آج بھی رائج ہے اور اکثر شعراء کام کی کسی نہ کسی خصوصیت کا ذکر اپنے افسانوں میں کرتے ہیں۔ ان کا احساس فن عروضی معانی و بیان کے مسائل کا پورہ تھا۔ اس لیے وہ عام طور سے انہیں کر

پنی توجہ کا مرکز بناتے تھے۔ شاعری کی حقیقت اور تمدنی زندگی سے اس کا تعلق کا سوال نہیں زیادہ پریشان نہیں کرتا تھا۔

سب اگر ہم تذکروں پر نگاہ ڈالیں تو وہاں ملاحظہ ہے کہ بہت سی باتیں اور شاعری کی تاریخ پر غور کر کے کے لیے کی پہلو میں گئے۔ لیکن جہاں تک، صرف تنقید کے نقطہ پانے کا سوال ہے، ان تذکروں سے بہت زیادہ مدد نہیں ملتی۔ اردو شعراء سے متعلق پہلا تذکرہ جبر نا ہمیں علم ہے میر کا نکات شعراء ہے۔ یہ تذکرہ ۱۸۵۷ء میں مرتب ہوا۔ اس کے بعد اور اس کے تقریباً سوا سو سال بعد تک پچھوٹے چھوٹے تذکرے لکھے گئے۔ معمولی فہرست کے علاوہ ان میں اصولی اختلاف نہیں پائے جاتے۔ اس کا اندازہ ہی ہے جو ان سے پہلے شعراء نے فارسی کے تذکروں میں پایا جاتا ہے۔ جس طرح وہاں زبان و بیان کے نام سے کسی سے آگے بڑھ کر مخصوص تنقیدی نقطہ نظر کو راہ نہ لیا گیا تھا، اسی طرح اردو شعراء کے تذکرے بھی، اصولی بحثوں سے خالی ہیں۔ ان کے تنقیدی اشارے بعض شعراء کی تیاری خصوصیات اور شاعرانہ کمالات پر ضرور روشنی ڈالتے ہیں۔ کبھی کبھی اہل عقائد اور میلانات کا ذکر بھی جاتا ہے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اصول اور اسے سمجھنے کے بجائے شعراء کی قائم کی ہوئی روایات یا اپنے ذاتی میلانات کے پابند ہوتے تھے۔ ان کے ذہنی عقلی ہونے کے بجائے نقلی اور ذاتی ہوتے تھے۔ کچھ دامودار تذکرہ نویس کی شخصیت اور مزاج پر ہوتا تھا۔ کچھ اس مقصد پر جس کے تحت تذکرہ مرتب ہوا۔ اس طرح ان تذکروں میں بھی تاریخی معلومات، سوا کی متعدد جہات، سبائی ماحول اور تنقیدی بصیرت کے لحاظ سے تفریق کی جاسکتی ہے۔ میر کا تذکرہ (۱۸۵۷ء) لی تذکروں میں دوسرے تذکروں پر فطرت رکھتا ہے۔ کیونکہ میر کے یہاں تنقید سببی اراے نہیں ہے۔ اس میں ان کے مزاج اور ہندی مذاہب کی جھلک ملتی ہے۔ اس کے برعکس گرجی کے تذکرے کی کوئی انفرسٹ نہیں ہے۔ میر حسن کی تنقیدی صلاحیت بہت نمایاں نہیں ہے لیکن وہ وسیع المجالہ، سخن، فہم اور طوطی لہجی معلوم ہوتے ہیں۔ قائم اور مصحفی کے تنقیدی اشارے روایتی ہونے کے باوجود ایک معیار کا پتہ دیتے ہیں۔ یہاں تذکروں کا تفصیلی یا غامبی مطالعہ ضرور نہیں ہے۔ بس اس حقیقت پر غور رہتا ہے کہ ہمارے تذکرہ نگاروں نے شعراء کے شعل راہیں تو دے دیں لیکن ان کی شاعری کو خود شعراء کے انفرادی یا اجتماعی شعور سے حلق کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کیس کیس

ان سطور میں یہ خیالی سارے سرور منید مملکت ہم پہنچا رہے ہیں، لیکن ان سے
شاعری کے عصری حالات و بیاد کی تفصیلات زیادہ روشنی نہیں پڑتی۔

سترھویں صدی 'ف' اور 'د' تقریباً 'دھم' اسوہر عدی تک، یہ یکساں اور یک رنگی
انفرادی سیلابات سے مطلع تھا، جتنا ہائے دھڑلے پر بے ہوش وچ کاہلی 'واسی لکر سے کچھ
میں' نکلتی ہے۔ حقیقی در تبادلی عمل میں یہ 'رور اور ارتقائی رنگ' سماج میں ذرائع
پیداوار کی ترقی و تبدیلی سے ر سے پیدا ہوتا ہے۔ حالات اپنی بیادوں میں نہ بدلیں تو
تبدیلیاں بھی سطحی رہیں گی۔ اب ان دنوں سے کچھ ٹوٹ اٹھتے ہیں اور مسائل پر اس طرح نگاہ
دالنے کو ایک میرا ہی شمس کا کمر کھلتے ہیں جس کو تغیرات کی کوئی ذبیہ زبان و مکالمہ کے
تغیرات کے باہر پیش نہیں کر سکتے۔ رہے اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ یہ کچھ لکھی کے اس
دور میں ابد شاعری سے دلچسپی لینے والوں کا ذہن سماجی شعور کا کمر، حلق میں تھا تو نہیں
یہاں کے سماجی معاشرتی ارتقاء پر نگاہ کرنا ہی ہوگا۔

اسی میں ان خیالات اور فنی عناصر کے سرچشمے میں کے 'جن کی روشنی میں شاعر اور
شاعری کی پرکھ ہوتی تھی۔ ترقی و تخیل کے تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے سے یہ بات سمجھ میں
آتی ہے کہ سترھویں اور اٹھارویں صدی کا ہندوستان ایک ادب اصطلاحاً جاگیا اور اس نظام کے
سارے اجتماعی رد عمل، جس کو رکھا دے کر آگے بڑھا۔ لڑائی قوت کھلی کچھ روایتیں تھیں۔
مگر ان روایتوں کی طاقت گھٹتی جائے، اگر ان کا تعلق اصل ادبی حالات سے ختم ہوتا
ہائے، اگر نئے حالات کے مطابق ان میں 'صاف نہ ہو تو کھلی روایتیں نہ تو ادب اور زندگی
کی قدروں کو زندہ رکھ سکتی ہیں۔ دور۔ اس میں آگے بڑھا سکتی ہیں۔ روایتوں کے تسلسل اور
ارتقاء کی یہی منطق ہے۔ اب اگر سماج نواں آزاد ہے طغیانات کی کھلی جلی پرانی ہے۔
ذرائع پیداوار کی لٹرائی نہیں ہو رہی ہے۔ دست کاریاں مٹ رہی ہیں 'لڑائی اور اطلاقی
تصورات ایک دائرے کے اندر ہی پکرنا رہے ہیں، کوئی باوقوفی و تنہا ہی تصور منظور ہے تو
زندگی کے کسی شعبہ میں وضع ہونے والے تصور صورت کی ختم ہے مٹی ہوگی۔ نتیجہ اس
سے باہر نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ ناقدانہ نگاہ رکھنے والوں کو زندگی کی اس پہچانی کا احساس ہوتا
پا رہے تھا۔ چاہے وہ اس کے بدلنے کی راہ نہ پا سکیں۔ یہ کتنا تو غلط ہوگا کہ شعراء ادب کی دنیا
اس احساس سے خالی ہے۔ مختلف ہماری بولیں کے بھگت شعراء اور اردو کے چند شعراء کا

عام میں احساس کا اتنی ہے جتنی اس کا عکس تذکروں میں نمایاں نہ ہو سکا۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت شاعر اور ناقد اپنے فرائض الگ الگ جانتے تھے۔ شاعر اپنی تحلیل میں کسی حد تک آزاد تھا، زندگی کو اپنے لیے ایک خام مواد سمجھتا تھا، ناقد ان میں سے کسی ایک خصوصیت کا، ایک نہیں سمجھا، تھا۔ وہ شعراء کے ان خیالات اور عقائد پر محسوسات اور جذبات پر کتر ہٹا کر اس میں نہیں رکھتا تھا جن کا سرچشمہ انعام اور مدح اللہ کو تھا۔ پھر نگاری تذکرہ نگاری کی جگہ یہ روایت میں رہی تھی۔ وہاں بھی زبان 'اسلوب' محسوس اور سہ کا زور تھا۔ اس لیے تنقید کے نام سے جو کچھ ملتا ہے وہ اسی کے دائرے میں اسیر ہے۔ مگر یہ کہ تذکروں میں بالعموم تنقید کے وہی پہلو ملتے ہیں جو شاعری کے ظاہری لہجے، مساک سے تعلق رکھتے ہیں۔ شاعر کے شعور سے قرض نہیں کرتے۔ مضامین کی تحلیل، خیالات کے تجزیہ، مواد کی حقیقت سے ان میں سوز کا اثر نہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ شاعری فنا ہے فن میں طرز اظہار اور زبان دیمان پر قدرت کو پہلی اہمیت حاصل ہے لیکن محض اسی پہلو پر زور دینے سے شاعری کی حقیقت واضح نہیں ہو سکتی کیونکہ اظہار کے ذرائع اور اسلوب، مخصوص اوزار کے فنی طریق کار اور اصول کے پابند ہوتے ہیں۔ طرز اظہار میں تبدیلی ظاہر میں کوئی تجربہ نہیں ہے۔ ذرائع اظہار کے نئے نکات سے واقفیت کا نتیجہ ہے۔

اس ساری بحث کا مقصد یہ ہے کہ تذکرہ نگاری کی کچھ حدود ہیں۔ ان میں ڈر تنقیدی بحث ملتی ہے وہ اس وقت کے عام ادبی شعور کا عکس ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان سے غلط فہم کے اہم اصول مرتب نہیں کیے جاسکتے، جس ضمن میں قوی مستعد نہاد کل سکتی ہے۔ ان اصولوں کی مدد سے ہم شاعر کے ناں مخالفوں میں جو تک کر رہے نہیں دیکھ سکتے۔ میں تذکروں کا ذکر کر رہا ہوں، خود شعراء کے کام کا نہیں۔

انیسویں صدی کے ہندوستان میں زہدیت معاشی معاشرتی درہمائی تغیرات رونما ہونے لگی تھیں، ان کے اہم اور بارور نتائج نگاری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ اور بارہا زیر بحث آچکے ہیں۔ ان حالات نے نئے طبقاتی رشتوں کو جنم دیا، زندگی سے عہدہ برآ ہونے کی فنی راہیں دکھائیں، غور و فکر کے نئے دروازے کھولے اور ایک ہم گیر تصورِ ادبی انقلاب کی جانب راہ نمائی کی، اس طرح تنقید کی کنجہ بانجھ میں پھر رونماں تھی۔ اس کا اظہار زندگی کے بہت سے شعبوں میں ہوا۔ جو پچھلے گیارہ سو سال کے اندر پیدا ہو رہی تھیں ان کے مناسب سے

نہ سہی ان سے اس حد تک مطابقت رکھتے ہوئے تنقید کے کاروں کا وجود میں آتا لازمی نہ
 کیونکہ یہ سہی اسانی شعور کی خصوصیت ہے کہ وہ حالات کا مقابلہ کرنے کے وقتی و شخص
 درائج و موجد نکلا ہے۔ بلکہ ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ اصلاح اور تہذیبی کے نام پر
 پرانی قدیم معروضات میں "تکس" اور بنے نئے "محبوں پر چلتا آسمان نہ رہا۔ جو نئے
 تصورات و معاشی، نفسی و فنی ماحول کی پس "س" ہوئے تھے انھوں نے ہندوستان کی
 جاگیردارانہ "وکی صنعتی و صنعتی زندگی پر گہرا اثر ڈالا اور سائنس - سائنسہ طور پر لکھی
 انسانی اور تہذیبی پہلوؤں کو متاثر کیا۔ جس میں "ہندوستان و جہاں میں آج جو پائے اور سنے"
 شرقی و مغربی "ہدایت اور درایت" جاگیزاری، "صحت" "ہدایت پرستی اور صلاح
 ہندی کی شکست میں جلتا تھا۔ لوگ اپنی دکھاو پرور میں مبت گئے تھے اور ہر بھی بہت تھوڑے
 سے لوگ تھے جن کے رہنے زندگی کا کوئی واضح تصور تھا۔ تنقید کے لیے کسی طرح کے وضع
 تصورات کی ضرورت ہوتی ہے وہ عام نہ تھے ہر شخص نے "راجا رام موہن رائے اور کیٹھ
 چندر سین تھا" نہ صرف "ادب چراغ ملی" چہ ان لوگوں کے افکار و خیالات بھی اپنی
 حدوں اور مفروضات رکھتے تھے۔

ادب پر نئے افکار اور تصورات کا جادہ بڑے جلدیہ انداز میں چلا ہے۔ ادب کی
 روایتیں بھی اپنے ارتقا اور نوال کی ایک آگ راہ بناتی ہیں۔ چنانچہ جب انیسویں صدی
 کے عام نظریات کا ذکر کیا جا رہا ہے تو اس کو ادب پر منطبق کرتے ہوئے فنی روایات اور ادب
 تصورات "شاعرانہ زبان اور ادبی سلیب کا حیاں رکھنا ضروری ہوگا۔ تہذیبی تہذیبی کے
 نقش کیس طیس کے "کیس مفقود ہوں گے" "کیس خیالات میں" "تعلیم کے" "کیس انداز حیاں
 میں۔ کیر، شاعر اور ادیب شعور پر اس کے پس کا تصور کرے گا، "کیس وہ اس طرح
 آئیں گے کہ اسے خود بہت زیادہ غیر نہ ہوگی۔ اس لیے کوئی یہ کا حد مقرر کر لیا کہ سارے
 نظریات کا کس شعور سے ادب میں ملنے لگے گہرا کن ہوگا۔ نئے تصورات کے رد و قبول
 میں بہت کچھ شاعر یا ادیب کے طبقاتی شعور کا ہاتھ ہوگا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے وسط
 تک نہیں بلکہ بہت دیر بعد تک ادب میں اس نظریہ کے بہت واضح نقش نہیں ملتے۔ متوسط
 طبقہ جس کے ہاتھ میں آہستہ آہستہ زندگی کے اکثر شعبوں کی رہنمائی مرکز ہو رہی تھی اسے
 روحانی اور ادبی مطالبات سے بے خبر نہ تھا۔ لیکن پھر اثر اور فیصلہ کن انداز میں ادب کی فنی

اور معنوی روایات کو یکایک بدل نہ سکتا تھا اس لیے تنقید بھی احتیاط پسندی پر مبنی تھی بلکہ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تقریباً مائیک تنقید نے ادب کی پرکھ میں ان حالات طم سے بھی کام نہیں لایا جو اس کی دسترس سے باہر نہ تھے۔ اس طرح ایک تاریخ معین کر دینا مجھے بھی کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا لیکن میرے پیش نظر محمد حسین آزاد کے پھر نیزنگ خیال حصہ اول کا دیباچہ "آپ حیات" اور محمود لکھنوی میں حالی کا دیباچہ (مقدمہ) اور اسی طرح کی ایک تہہ چڑک ہیں جن میں قطعی طور پر تنقید اور ادب کا نیا شعور ہے۔ یہ شعور انفرادی پسند و ناپسندگی کا منظر نہیں ہے، نئے تاریخی اور سماجی احساس کا منظر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "آپ حیات" شعراء کا تذکرہ ہوتے ہوئے بھی قدیم تذکروں سے بالکل غفلت ہے۔ یہ ایک سماجی اور تہذیبی تاریخ بھی ہے، اس میں تنقید کی کوشش بھی ملتی ہے اور شاعری کو شاعر کے شعور سے ہم آہنگ کرنے کا ارادہ بھی۔ گویا اس وقت سے تذکروں کی اہمیت کم ہو جاتی ہے اور تنقیدی شعور نئی فضاؤں میں پرواز کرتا ہے۔

اثر قائم شعور کی اس نئی منزل میں جو عناصر اہل نقد کی تحلیل کر رہے تھے وہ اسی نکلتش پر مبنی تھے جن کا ذکر ادب کی سطحوں میں ہوا۔ مثلاً ان حالات سے جو تصورات وجود میں آئے انہیں ہم حقیقت 'قوی ہدایت' خواہش اصلاح اور افاقہ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ان تصورات کی کار فرمائی سماجی، مذہبی، تعلیمی، تہذیبی اور سیاسی اساس سے وابستہ تھی اور کوئی شخص یہ جرات نہیں کر سکتا کہ ان کی اہمیت اور نئے پن سے انکار کرے۔ اس وقت کے نظام زندگی اور شعور حیات کے تمام عمرانی اور نفسیاتی پہلوؤں پر نگاہ رکھی جائے تو تصور کی بنیاد میں حالات کو قدیم روایت کے درمیان ایک سمجھوتے کی شکل میں دیکھا جائے گا۔ یعنی افکار نہ تو بیکر قدیم روایات کے زائیدہ ہوں گے اور نہ حالات کہہ سکیں اس فضا اور ابھرنے کا سبب ہے جو اس دور تعمیر میں نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم اس زمانے کے اخلاقی تصورات کو لیں تو واضح طور پر نظر آئے گا کہ اگر ایک طرف اس پر مذہب کی چھاپ ہے تو دوسری طرف نئے حالات میں نئے سماجی اثرات کی وجہ سے اور نئے تکنیکل ارتقاء کے نتیجہ میں اس پر حقیقت کی پرچھائیاں بھی پڑ رہی ہیں۔ تنقید نگار یا تنقیدی صلاحیت رکھنے والے کے لیے یہ ناممکن ہو گیا تھا کہ وہ ان سے بے نیازانہ مگر جائے اور عام حالات زندگی میں جن حقائق کو سمجھنے کا مطالبہ کر رہے تھے انہیں ادب میں بھی نہ دیکھا جائے۔

ایک بات جو بعض حضرات کو الجھن میں ڈال رہی ہے وہ مطلب کے ثبات کا صحیح تفسیر ہے۔ کچھ لوگوں کے لیے یہ مصلحتانہ ہے کہ اس کے پس کی ہال چلنے کی کوشش ہے۔ مشرق کی زبانوں سے واقفیت ہے، کچھ لوگوں کے لیے دہتے ہوئے حالات کا ناگزیر نتیجہ ہے جس کے نتیجے اور بڑے مدوں پہلو ہیں، تاریخی رفاہ کی ایک خاص مصلحت ہے جس نے ہندوستان میں ایک نیا ۱۹۰۰ء کی ابتداء کی ترقی اور خاص کر انگلستان سے تعلقات قائم کرنے سے ہوا۔ یہ بھی ایک ہر گیز اور دور رس انتظام تھا جس نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا۔ نتیجہ میں اس کا عمل از 'دہلی' اور 'فلی' کے یہاں پھرتا ہے کہ ان کے اثر قبول کرنے کی مصلحتیں مختلف اور اہم کے طریقے الگ الگ ہیں۔

عمل اس کے کہ ان مصلحتوں کے افکار اور خیالات پر نظر ڈالی جائے ایک خاص مسئلہ پر غور کر لینا ضروری ہے۔ ہم اس وقت اردو ذکر کرتے ہیں اور دوسرے سامنے انتظام ہندو کے بعد کا ہندوستان ہے۔ اس وقت اردو زبان وہ عمومی حاصل کر چکی تھی کہ عام طور سے اسے ہندوستان کی مشترک زبان کا درجہ دیا جا رہا تھا۔ لیکن اس کی رہنمائی جن لوگوں کے ہاتھ میں تھی وہ زیادہ تر مسلمان تھے۔ کسی سائنٹفک بحث میں اس حقیقت کو نظر انداز کرنا بالکل غلط ہوگا۔ مسلمان اپنی مذہبی روایات میں اعتدالی تصورات اور روحانی میلانات میں شدید بکرائی کیفیت محسوس کر رہے تھے۔ ہندوستان کے کئی سو سال کے قیام میں اصول نے اپنے مذہب کو دوزخ کی زندگی سے الگ رکھا تھا۔ رسم و رواج، مذہب و معاشرت میں کچھ باہر سے لائے گئے تھے کچھ یہاں سے توں کیا تھا۔ لیکن یکہ مبرا ایسی بھی تھی جو ان حدود کو توڑ کر انیس عام مکی زندگی میں ضم کر دینا چاہتی تھی۔ اس کا اظہار بعض صوفیوں کے یہاں ہوا تھا۔ بعض بادشاہوں نے اس کی شعوری کوشش کی تھی لیکن ان کی تکمیل نہیں ہو سکی تھی۔ مگر انگریزی سیاست نے جان بوجھ کر اس مصلح کو دسج کرنے کی کوشش کی۔ حوصلہ طلب کی پیدائش نے مختلف مذاہب کے لوگوں کو الگ الگ راہوں پر چلتا دکھایا۔ اگرچہ کئی معاملات میں اشتراک اور اتحاد کے دھارے بھی بہتے رہے لیکن کلیتہً اور اعتدالی انداز فکر کے باوجود ہندوؤں اور مسلمانوں کی 'مصلحتی تحریکوں' ترقی کی خواہشوں، آگے بڑھنے کے ارادوں نے مختلف راہیں اختیار کیں۔ یہ بحث بڑی پیچیدہ ہے اور اس وقت اس کی تفصیلات میں جانا اس کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ناممکن ہے تاہم یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جہاں

مستان عقیدوں نے عروپ سے بہت کچھ سیکھا دیں اپنی روایات کے سوتے بھی تلاش کرنے کی فکر کی اور کہیں کہیں مشرق و مغرب کو ملا دینے کی کوشش کی یا مغرب کی برتری تسلیم کر کے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ ایسا بھی ہوا کہ مغرب کو اخلاق کا دشمن سمجھ کر اس کے ہر پہلو کی مخالفت کی۔ اس میں مگر میں اس دور کے تنقیدی خیارات اور تعلیمات بہت واضح ہو جاتے ہیں۔

آزاد اور حالی دونوں ادب اور خاص کر شاعری کو زندگی کے ادبی تغیرات سے وابستہ سمجھتے ہیں اور اس کو زندگی کے سنوارنے، بہتر بنانے اور زندگی سے خدا حاصل کرنے کا اریہ تسلیم کرتے ہیں۔ آزاد کے یہاں یہ باتیں بہت واضح نہیں ہیں۔ حال کے یہاں پوری طاقت کے ساتھ آتی ہیں۔ وہ باری زندگی نے شاعری کو کس طرح متاثر کیا ہے اس کا ذکر دونوں کے یہاں ملتا ہے۔ حقیقت اور سادگی پر دونوں زور دیتے ہیں کیونکہ وہ شاعری کے افادہ پسند کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ اس طرح تنقیدی نقطہ نظر میں انھیں اختلاف آتا ہے شاعری سماجی شعور سے وابستہ ہو جاتی ہے اور شاعر براہ راست اپنے تخلیقی عمل سے سماج کے شعور کو وسیع کرنے میں شریک ہو جاتا ہے۔ آزاد اور حالی کی کچھ مجبوریوں اور مضبوطیاں ہیں۔ وہ مغرب سے متاثر ہونے کے باوجود کہے بہت دور تک نہیں جاتے کچھ تو اس لیے کہ ان کو مغربی اصول تنقید سے واقفیت بہت کم ہے کچھ اس لیے کہ وہ زندگی کے کسی شعبہ میں بھی معمولی اطلاعات سے آگے بڑھنا نہیں چاہتے تھے۔ آزاد تو بزرگوں کا ادب اس حد تک کرنا چاہتے تھے کہ جب ان کی خامیاں ظاہر نہ کی جاسکتی تھیں تو ان کی زبان تنگ ہو جاتی تھی اور حالی پر ایک اخلاقی نقطہ نظر اس طرح مسلط تھا کہ وہ کسی نسبت پر اس سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھے بلکہ شاید میں کہتا ہوں کہ انہوں نے شعری حسین روی کی اخلاقی کی چٹان سے باندھ رکھا تھا۔ اخلاقی نقطہ نظر بنیادی طور پر تو اسلامی تھا لیکن علاقائی ضروریات سے بھگوت کی مثبتیت رکھتا تھا۔ جہاں تک شاعری کو دقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ بنانے کا تعلق ہے۔ آزاد کا رویہ جذباتی تھا حالی کا عقل پسندانہ اور افادہ۔ اس وقت حالی کے یہاں اسلوب اور طرزِ ادب اپنی طاقت اور شعری کمالات پر اتنا زور نہیں جتنا حقیقت واقعہ اور صداقت و سچ ہے اس کے برعکس آزاد مواد کے مقابلہ میں شاعرانہ حسن کا زور دے کر کرتے ہیں۔ اس معاملہ میں وہ شبلی کے قریب مظلوم ہوتے ہیں جو جمالیاتی تاثر کو جی حد تک زبان و مقام

سے اور محسوس کرتے ہیں۔ اس جملہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ فطرت میں فطرتی کے انداز فکر میں تاریخی تسلسل یا تئیرات کو بالکل نظر انداز کر رہا ہوں۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ فطرت نے فطرت میں مضمون اور مواد کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی ہے۔

تئیدی نظریات، انداز جان اور زندگی کے عام میلانات مسلمانوں کی اخلاقی زندگی اور سیاسی زندگی کے حقیقی مختلف خیالات رکھنے کے باوجود یہ فطرت کے مطالبات کا خیال کرتے ہیں۔ وہ فطرت شاعری اور فنون لطیفہ کی ماریٹ پر غور کر کے اس حقیقت کے دور کے رہنما بننے میں جو مصلحتیں درپیش تھیں، اسے سمجھنا چاہتا تھا۔ ان کے ذرائع معلومات، فطرت اور مختلف تھے۔ چنانچہ الفاظ اور اسلوب کے خیالات سے آزاد حال اور فطرتی سبب حاشیہ میں مگر حال کے یہاں یہ اثر فطرت اور مکالمے سے ہوتا ہوا پہنچا ہے اور فطرتی کے یہاں بحالی علوم کے عینی تراجم یا ان کی تفسیروں سے جو ممکن ہے کہ دوسرے قدیم تئیدی فکر یا تئیدی فطرتی ان خیالات سے واقف رہے ہوں لیکن انہوں نے ان کی تشریح نہیں کی اور اپنے خیالات کے اعکاس میں ان سے مدد لی۔

اس طرح یہ تئیدی فطرت و فطرتی تئیدی کی طرف حجب ہوئے اور اپنے اپنے انداز میں انہوں نے مختلف شعراء کے کلام کا تجزیہ کیا حالانکہ سوائے معمولی اشعاروں کے کہیں بھی یہ شعراء کے خیالات کی بنیادوں یا شعور کے سرچشموں تک نہ پہنچ سکے اور اسے واضح شکل میں زندگی کے میلانات سے حقیقی کہہ سکے۔ تجزیہ کی یہ کمی ان علوم سے واقفیت یا سطحی واقفیت کی غمازی کرتی ہے۔ تئیدی میں جن کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ تفسیرات یا دوسرے سماجی علوم سے واقف تھے یا نہیں۔ اسی وجہ سے ان کے یہاں گہرائی کی کمی کا احساس ہوتا ہے لیکن قدیم سے قدیم کے یہاں تئیدی فطرتی کی حدود وسیع کرنے میں فطرتی تئیدی کے اور یہ بعض اہمیت کی حدود اور امکانات کی چھان بھی کرنے میں ان فطرتوں کے کارنامے غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی خیال سے یہ کہا جاتا ہے کہ اردو تئیدی کی ابتداء بلکہ شاعرانہ ابتداء انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے ابتدائی حصے میں ہوئی لیکن زمانہ ہندوستان کی دوسری نواہوں میں بھی تئیدی کی ابتداء کا ہے۔ اس لیے یہ تئیدی نکالنا مشکل نہیں رہتا کہ یہ تئیدی میلان حد تئیدی کی مکمل اور تئیدی فطرتی کے ذوق فطرت اور فطرت اور فطرت کا فطرت ہے اور اس کے اندر اس حد کی فطرتوں اور فطرتوں کی جھلک

تھی ہے۔

جب ہم ان قصوں پر یہ سرسری نظر اٹال رہے ہیں تو یہ بات نکالوں سے اوچل نہیں ہوتی چاہیے کہ انفرادی طور پر ان کے شعور کے دائرے مختلف ہیں چنانچہ ایسی زندگی میں تعمیر اور اس کے نتائج پر 'مادے اور خیال کے تعلق پر حالی نے جس طرح نظر اٹالی ہے وہ ان کے طرز فکر کا پتہ دیتی ہے۔ انہیں اس عہد کے دوسرے فلاسوں سے آگے بڑھتی ہے اور ان کے دائرہ خیال میں اس حد کا اضافہ کرتی ہے جس سے ترجیح کا مفاد بھی مت بکھ سکے تھا۔ بلا خوف تردد کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت سے تنقید کے لیے نئی راہیں کھل گئیں۔ سادہ نقطہ نظر کی جستجو کرنے والا حالی کے اس اس کی بجائے دیکھ سکتا ہے۔ 'ذوق' و 'دہائی' اور 'مہالوائی' پیلوؤں سے دلچسپی لینے والا فطرتی کی گفتگو دہائی میں اس کا جلوہ تلاش کر سکتا ہے۔

اردو ادب کا آغاز تو لیس چاہے تو اس دور کو صدمہ میں ختم کر سکتا ہے۔ اور اگر چاہے تو حالی، آزاد اور فطرتی کے متبعین کو بھی شامل کر کے ۱۹۰۶ء تک کے تنقیدی ارتقاء کی کہانی رقم بند کر سکتا ہے گو اس درمیان میں اور اثرات کی پیمائیاں بھی پڑتی رہیں۔ اور نئے عناصر فکر و خیال میں داخل ہوتے رہے۔ مثلاً اثرات مختلف شکلوں میں جذب ہونے لگے، کہیں ہوں کے توں اگل سپرے گئے۔ کہیں اضمح ہو کر خدا کے خون میں شامل ہو گئے، کہیں تحقیق کی گن بن کر تنقید نے شعروادب کے سادہ پیلوؤں اور مہالوائی کیفیتوں دونوں سے آنکھیں چراتیں۔ کہیں مدعائی انداز میں اپنے دل کی دھڑکن ادب کے اندر تلاش کی۔ اس طرح تنقیدی سانچوں میں طرح پیدا ہوتا رہا۔ اس میں شک نہیں کہ چند محققین کے سوا کسی اور نے تنقید کی جانب اس گن اور مدعی سے توجہ نہیں کی کہ مبسوط تصانیف و عہد میں انہیں 'نظراتی تنقید' کے لئے پیلو واضح ہونے لگے مگر بھی امداد امام اثر، 'طیلم پانی پانی'، 'صدی افادی'، 'سرحد قدار'، 'سلمان مدنی'، 'مکتب'، 'عہد الیف'، 'پڑت کہنی'، 'عہد حسن قادری'، 'عہد الما جد'، 'درا افادی'، 'اکثر لدر'، 'عہد ارمین بجنوری'، 'سہاد انصاری'، 'عہد اسلام ندوی'، 'رشید احمد صدیقی'، 'مسعود حسن رضوی'، 'عہد الحق'، 'علقت اللہ' اور دوسرے فلاسوں کو بکسر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ سچ ہے کہ ان لوگوں کے علاوہ سے تنقید کے اصولوں کی خاص طور سے وضاحت نہیں ہوئی۔ ایسے نئے اصول مرتب نہیں ہوتے جو طبع راہ بن سکیں، 'مطلبی' یا 'مشتی' انداز نظر کی ایسی وسیع ترجمانی نہیں ہوتی کہ آگے بڑھنے کے لیے انہیں بنیاد بنایا جاسکے جن سے یہ کہنا بھی

درست نہیں ہوگا کہ تنقیدی ادب کا دائرہ وسیع میں ہوا۔ حقیقی میلان سے قطع نظر ایک تاریخی ترجمان کی جھلک عبدالحق 'سلیمان عدوی'، عبداسلام مدنی، عبداللطیف کے یہاں ملتی ہے۔ بحالیاتی اور آثراتی انداز 'صدی افادی'، عبدالرحمن بھوری، سجاد انصاری کے یہاں ملتی ہے۔ نفسیاتی پہلو عبداللہ درویش، کمالی، حکمت اٹھ اور ڈاکٹر زور کی بعض تنقیدوں میں نظر آتا ہے۔ ہر کس کس میں ان کی آمیزش بھی ہو جاتی ہے اور کسی انداز کی۔ تکمیل ہوتی ہے نہ واضح اصول چلتے ہیں نہ ان کا کوئی دیستان وجود میں آتا ہے۔ سب اپنی اپنی جگہ پر بھولتی یا بڑی چنگی ہوئی چنگاڑوں میں جو بھڑک کر شطرس میں ملتی۔ ان کی سب سے بڑی غالی یہ ہے کہ ان کے یہاں ادب اور زندگی کا حقیقی لٹاپا نہیں ہوتا۔ شاعرانہ انصاف کے تقاضا اور ساری رشتے کا ہر ضمیمہ ہوتا۔ جذبات اور حقائق کی بنیادوں کا پتہ نہیں چلتا۔ ان میں بعض شعروادب سے بڑا لطف لیتے ہیں اور کیف حاصل کرتے ہیں لیکن مدلل طریقے سے وہ سواں تک پہنچا نہیں سکتے۔ گویا یہ لوگ کسی مخصوص نقطہ نظر کے ترجمان نہیں ہیں۔ بہت سے لوگوں کے خیال میں بھی ان کی خوبی ہے کہ ان کا انداز کسی خاص فلسفہ فکر کا پابند نہیں ہے لیکن یہ خیال اتنا سطحی ہے کہ اس پر تنقید کرنے کی ضرورت نہیں۔ غدار ہونا اور بعض چیزوں پر ترجیح دینے کی عقلی صلاحیت نہ رکھنا تضاد باتیں ہیں اور جیسے ہی اپنی قوت امتیاز کے استعمال کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے ویسے ہی نقطہ نظر کا سوال بھی درمیان میں آجاتا ہے۔ اس سے گھبراہٹ منبہ نہیں، اسے حلیم کرنا صحیح راہ عمل ہے۔ ہر ماں اس وقت تک تنقید کے اصولوں کا ارتقاء کسی مخصوص نقطہ نظر کا پتہ نہیں دیتا، محض ان کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے لیکن اگر ہم انہیں کوئی نظر رکھیں جو اصطلاحی مفہوم میں غدار نہیں تھے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ جس کے پاس زندگی کا کوئی فلسفہ ہوتا ہے اس کے پاس تنقید کا ایک فلسفہ یا کم سے کم نقطہ نظر ہونا ضروری ہے۔ اقبال 'تاریخ تنقید'، معاشرت، اقتصاد، زندگی، قومی ارتقاء، ہر چیز کے حقیقی ایک ذریعہ نگاہ رکھتے تھے۔ معمولی تضاد کے باوجود ان میں ہم اب بھی حسی۔ وہ زندگی کے بڑھتے پھلتے اور قابو میں رکھنے کے بارے میں کچھ خیالات رکھتے تھے۔ اس لیے وہ شعروادب کے اصل مقام سے واقف تھے۔ ہمارے اس سے پہلے کے غدار زندگی کو ایک کل ایک وحدت کی حیثیت سے 'میں دیکھتے تھے' اس لیے شعروادب زندگی کے روبرو مظاہر سے کوئی کمر بستہ رکھتے ہوئے نہیں معلوم ہوتے تھے۔ ایسی حالت میں واضح

تجیدی اصولوں کا وجود میں آتا آسمان نہیں تھا۔ بعض باتوں کی طرف معمولی اشارے اور بات ہے اور عمل یا واقعہ، تجویز اور استدلال کی کسوٹی پر پورا اترنے والا تجیدی نقطہ نظر بالکل دوسری بات۔ اس لیے یہ کتنا مناسب ہو گا کہ بہت بہت زمین ہموار ہو رہی تھی اور تاریخی حالات ایسے خیالات کی شکلیں اور قہر کر رہے تھے جو تجید کو عملی بنیادوں پر سزا کر دیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہر عقار کا شعور محض حالات کے بدل جانے سے ہی خاص سانچے میں داخل کیا۔ نہیں بلکہ ایسی صورت پیدا ہوئی کہ جو انداز تجید بھی اختیار کیا جائے اس میں وزن، کمزوری اور استدلال ہو۔ یہاں تک کہ خالص تاریخی نقطہ نظر رکھنے والے بھی اپنے خیالات کے بنیاد میں بہت سی دلیلیں پیش کرتے ہیں۔

سومیں صدی میں ہندوستان کی تاریخ جن راہوں سے گزری وہ بہت سی عجیبہ و غریب اور ناہموار تھیں۔ ایسے عجیب و غریب مشکل سی سے کسی ملک کی تاریخ میں ہوں گے۔ کویریشوں کی اتنی شکلیں اور کہیں نظر نہیں آئیں گی۔ ان پر چچ واریوں سے انسانی ذہن کا گزرتا اور مختلف کویریشوں، سختی جو حتیٰ کہوں، قوی اور بینا الاقوامی جہوں، مانی اور روحانی الجھنوں کا احاطہ کر کے اپنی راہ حسین کرنا ایسا آسان نہیں ہے جیسا آسمان نظر آتا ہے۔ اس لیے تجید نگار کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ اگر وہ ان تمام عناصر کو پیش نظر نہ رکھے، ان تمام علوم سے کام نہ لے جو انسان کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں اور اس کے خیالات، جذبات کی گتیاں کھولتے ہیں تو وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے شاعرانہ ادب کے مانی الضمیر کو سمجھا ہے۔ فن کے مقصد و منہاج کو سمجھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۵۶ء کے دور سے چند فلاسوں کے یہاں شعرو ادب کو پرکھنے کی بالکل بدلی ہوئی شکلیں ملتی ہیں جو غیر قدیم روایات سے اپنا رشتہ نہیں توڑتیں لیکن جو ادب کے حلق پیدا ہونے والے ہر سوال، جواب دہنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان کے دوش بدوش دوسرے کارواں بھی چلا رہے ہیں، کہیں ان کی راہیں ایک دوسرے کو کاٹ جاتی ہیں، کہیں متوازی چلتی ہیں اور پس بہت دور جا پڑتی ہیں۔ ان حلوں میں تجید کے سر کی کمانی غور طلب اور دلچسپ ہے۔

انسان، اس کے افکار اور اعمال، اس کے بدلتے ہوئے ماحول اور فطرت کے ساتھ اس کے تعلق کا عالم حاصل کرنے کے ذرائع ہمارے پاس کیا ہیں؟ ان سوالوں سے جواب دہ اس سوال کے جواب کا بھی انحصار ہے کہ عصر حاضر میں تجیدی نقطہات ۷۱

اندازِ فکر میں تبدیلی ہوئی ہے یا نہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ جن خوابوں اور حقیقتوں کی دنیا 'تاریخ'، 'تفہیمات'، 'مراعات'، 'سائنسیات' اور 'سائنس' کے بصارتِ افواہ پر انھوں سے منور ہو رہی ہو، اس وقت ان سے آنکھیں بند کر کے انسان اور اس کے کارناموں پر نگاہ ڈالنا حلیٰ بخش نتائج تک نہیں پہنچا سکتا۔ علم کی یہی خصوصیت یہی ہے کہ جب وہ ایک بار شعور کا جڑ میں جاتا ہے تو جدید اعمار خیال کے ہر پہلو پر اپنا عکس ڈالتا ہے۔ اس کا اعمار اپنے حدود کے اندر پہلے بھی ہونچکا تھا۔ چنانچہ اردو تنقید نے ۱۹۳۰ء تک کئی حیرتیں طے کر لی تھیں اور اس میں وہ خصوصیتیں نمایاں ہو چکی تھیں جو اب ڈاکٹر حیل کی جانب سے دی ہیں یا حقائق کی جستجو کرنے میں علم و ادب کے نئے و سائنس کے کام لے کر وسیع تر اور عمیق تر رہی ہیں۔ چنانچہ اس وقت تک پہنچنے پہنچنے ادب اور خاص کر شاعری کی پرکھ میں اصیت پر نور دیا جانے لگا تھا۔ ادب کے طبقے میں سماج کے عام اخلاقی نظام کا ذکر بھی آئے لگا تھا۔ شعرو ادب کو کہتے ہیں شعر، زبان، 'مناخ'، 'بلاغ'، 'انسانی خصوصیات' پر نور دیا تاکم ہونچکا تھا۔ شاعری کے علاوہ ادب کی دوسرے اصناف پر بھی نگاہ پڑنے لگی تھی۔ ادب میں ادبیت کے علاوہ 'تاریخی'، 'تفہیمی' اور 'سماجی' مسائل کی جستجو کی جانے لگی تھی۔ تنقید کے ساتھ ساتھ حقیقی 'پیمانہ' اور صحت کی جانب بھی توجہ کی جارہی تھی اور جس پہلو کو سخیل اثر کا جارہا ہے وہ عقل اور عقل کی راہ سے ہو کر فاضل اور ادیبوں کے طریق فکر کا جو پیمانہ چکا تھا۔

اس مقام تک پہنچنے میں وقت لگا تھا اور تاریخی تحولات کی وجہ سے تنقید میں جو تبدیلیاں ہوئی تھیں، علمی حیثیت سے وہ اگرچہ اپنے ابتدائی مراحل طے کر رہی تھیں لیکن بے سمت و بے بہت نہ تھیں۔ تنقید کے نئے اسالیب و دور میں آ رہے تھے لیکن وہ اسالیب بھی باقی تھے جو محکمہ لٹری کے دور کی یاد دلاتے تھے۔ ان میں درست اور عقل کے پہلو ابھرتے پیدا ہو رہے تھے یا جو سوالات انھوں نے پرچھے تھے ان کے جواب دینے کی کوشش کی جارہی تھی کیونکہ وقت کے تقاضوں کی وجہ سے تنقیدی شعور وسیع تر اور عمیق تر ہو رہا تھا۔ اور جس کا جو انداز ابھی تھا اسی کے اندر صحت، استدلال اور اقتدار ادب کی پرکھ سے کام لے رہا تھا۔ گویا کسی نہ کسی شکل میں تنقید کو اصولی خاک پر پیش کرنے کی کوشش تھی۔ اس وقت خالص 'طنز' پرست اور کھل طور پر بحالہائی اور ناثراتی اندازِ ظہور رکھنے والا بھی اپنے نقشہ نگار کے لیے لیں پیش کرتا ہے۔ وہ دلیلیں کیسے ہی کیوں نہ ہوں اس کا سبب کیا ہے؟ یہی کہ ایک طرف

ادب کی اہمیت اور عظمت مسلم ہوئی جا رہی ہے۔ اسے ثقافت کا ایک اہم جز قرار دیا جا رہا ہے اور دوسری طرف مختلف علوم و فنون اسان اور اس کے خیالات، جذبات اور محسوسات کے سمجھنے میں مدد دے رہے ہیں۔ انہی حالت میں تنقید میں نئے تجربے، نئے اصولوں کی تلاش، نئے اسالیب، نئے زاویے ہائے نظر ہر بات کی نگاہ کش ہے۔ تنقیدی اسالیب میں جو نفع ہے وہ بھی اسی بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ ہزاروں کے شعور پر مختلف وزن اور حجم کے خیالات دباؤ ڈال رہے ہیں۔ اس وقت کا "مہم سزا اور مصالح" سب ہی برسر کار ہیں اور بھانت بھانت کی تنقیدی نظریات اس طرح پیش کیے جا رہے ہیں کہ بعض اوقات ان کی حیثیت محض ایک ذہنی کرتب کی ہو جاتی ہے جس میں نظریہ صرف "۳۱ پی پی پی" ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تنقید کے وہ اصول بھی بعض محققوں میں پسند نہ ہیں جن کی اہمیت پرانے نام رکھی ہے۔

یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ تنقیدی نظریوں اور اصولوں میں تبدیلی کیوں ہوتی ہے۔ ایک ہی عہد میں مختلف نظریات کیوں پیش کیے جاتے ہیں اور میرا ہم اسالیب کو بھی نئے لباس اور نئے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کیوں کی جاتی ہے؟ اصل سبب کا تعلق ادب کے مقصد سے ہے یا کبھی کبھی ادب شعوری یا غیر شعوری طور پر زندگی سے اپنا ربط ٹکڑا کر رہا ہے۔ ادب کا مطالعہ کرنے والوں کو بھی اس ربط کی جستجو ہوتی ہے۔ یہی جستجو علمی ہو کر تنقیدی نقطہ نظر میں جاتی ہے۔ مطالعہ سیدھے سادے طریقہ پر شروع ہوتا ہے لیکن پڑھنے والا جس قدر گہنے واسطے کے جذبات اور خیالات، تجربات اور افکار میں شریک ہوتا جاتا ہے اتنا ہی اس کا مطالعہ معنی خیز ہوتا جاتا ہے۔ یہ معنی خیزی مختلف سطحیں رکھتی ہیں۔ کسی کے لیے لذتِ ابدی اور جمالیاتی سطح کی غلط پکڑ کر ختم ہو جاتی ہے۔ کسی کے لیے وسیع شعور اور علم کا ارتقاء بنتی ہے۔ شعروادب کے مطالعہ سے معنی تو ہر شخص اٹھ کرتا ہے لیکن اس کی نوعیت مختلف ہوتی ہیں۔ محض ہر جگہ پہنچے ہیں لیکن ان کی وضع قلع اور اہمار میں یکسانیت نہیں ہوتی۔ اس طرح محض اہمار نے ادب معنی پیدا کرنے میں مصطف اور مطالعہ کرنے والا دونوں شریک ہوتے ہیں اور اپنے اپنے علم، شعور، ذوق اور تصور لیں کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ ایک نسل کے بعد دوسری نسل اپنے آپ کو خیالات، تصورات اور مادی حالات کی ایک نئی دنیا میں پاتی ہے اور گزشتہ امدار کے سرمایہ میں تغیر و تبدل کیے بغیر اہل

موسیقی کا احساس نہیں کر سکتی۔ بدلتے ہوئے حالات میں قدیم سوائے پر قانع ہو جاتا محض
ہرم احساس کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ یہ ہرم احساس دہر تک قائم نہیں ہو سکتا اور لازمی طور پر
شعور و ذوق کی منزلوں سے گزرنا ہے۔ ماضی ارتقاء کے مختلف عناصر کو پیش نظر رکھا
جائے تو یہ سمجھنا مشکل نہ ہو گا کہ ارتقاء میں یکسانی اور یک رنگی نہیں ہو سکتی۔ بالکل سادہ
کے تمام طبقات کے لیے حاصل طم کے یکساں ذرائع فراہم نہ ہوں۔ اس لیے نئے اسباب
کے ساتھ قدیم اسباب بھی نئے روپ و حمار کر دینا ہے اور یہی موجود ہیں۔

ارتقاء نے تنہا کا تاریخی معیار کرنے والا ان مختلف سطحوں یا تنہائی نظریوں کو کسی
حقیقتوں سے دیکھ سکتا ہے۔ کبھی کسی اہم فائدہ کے گرد لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ کبھی کسی اہم
نظریے کے ترجمان ایک کتب خیال وجود میں آتے ہیں اور ایک ہی وقت میں اہم طاہروں
اور اہم نظریوں کا وجود ممکن ہے۔ جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے اس وقت فارسی کتب
خیال کے مطالعہ اور کسی تنقید نظریے واضح اور نمایاں شکل اختیار نہیں کی ہے۔ انگریز و مشرق
ایسا ہے کہ کوئی واضح نظریہ ہی موجود نہیں ہے (یہ اچھا ہے یا برا؟ اس کا ذکر بعد میں آئے گا)
یا اگر ہے تو اس کو چھپانے کی کوشش کی گئی ہے یا ہر کی قسم کے فائدہ نظر ایک دوسرے میں
مکمل مل گئے ہیں اور ایک طبع کا، تنہائی انداز فکر وجود میں آیا ہے جو ایک تصور نقد کی
ترکبی وقت سے بالکل مختلف ہے۔ ان باتوں کے پیش نظر موجودہ اردو تنہا کو مختلف واضح
دستاویزوں میں تقسیم کرنا خطو سے خالی نہیں ہے۔ بعض طاہر و واضح طور پر مختلف اسباب کی
جانب کھینچے ہوئے معلوم ہوتے ہیں یا اپنی ارتقاء کی راہ میں کبھی ایک کارواں کے ساتھ
ہولے ہیں کبھی دوسرے کے۔ بعض صورتوں میں اسے انفرادیت پسند فائدہ (یا ادب) کی آزاد
خیالی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن ہر ایسے انفرادیت پسند کے ذرائع طم اور تکنیکی شعور کا نتیجہ
کر کے اپنی برداشت اور افکار و خیالات کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ خیر تو کسی حد تک سل پسند اور
میکانگی ہونے بغیر فائدوں کی قطع کردہ بندی آسان نہیں ہے۔ ہر ایسی کچھ نمایاں خدائی کو
میں دیکھتے ہوئے موجود تنہائی ادب کو مختلف قسموں میں بانٹا جاسکتا ہے جن میں سے بعض کو
وجود پلے سے ہے اور بعض حال میں نمود حاصل کر سکتے ہیں۔

موجودہ صدی کی تیسری دہائی کے وسط میں فاضل کا جو گہرہ کسی قدر واضح تصورات اور
نمایاں ادبی مقام کے ساتھ زیادہ ادب پر نمودار ہوا وہ ترقی پسند کہلائے۔ نہ تو اس کا مدد ہے

کہ ان کے علاوہ دوسرے انداز فکر رکھنے والے فادہ سمجھ رہی نہیں تھے اور نہ یہ کہ وہ تمام فادہ کسیں ترقی پسند کہا گیا ایک ہی اسلوب یا نقطہ نظر رکھتے تھے۔ دوسرے مختلف المذاہب فادہ جو پہلے ہی سے لکھ رہے تھے اپنے ہی انداز پر قائم رہے یا جدید تصورات سے کسی حد تک متاثر ہوئے یعنی انہوں نے ادب اور زندگی کے تعلق کو شیم ڈکھا لیکن محض انفرادی و انانیت سے زیادہ تاریخی انداز میں۔ اس کی بھی خاص وجہ یہ تھی کہ تھوڑے ہی دنوں کے اندر شعوری یا غیر شعوری طور پر زندگی اور ادب میں رونما ہونے والے تغیرات کے حصول پر غرض کو بہت سے سوالات سے دوچار ہونا پڑا۔ انفرادی طور پر پسند یا ناپسند کرنے، سمجھنے یا نہ سمجھنے کے علی الرغم یہ تغیرات ہوتے رہے اور بدلتے ہوئے شعور نے خود فادوں کو اس کی جانب متوجہ کیا۔ کسی نے انہیں محض صبح شام کا تغیر سمجھا، کسی نے ناسنے کا اور کسی نے انسان اور اس کے ماحول کا۔ ان تمام تصورات میں بڑا فرق ہے۔ ایک حنظل پر، سکون کے مقابلہ میں حرکت کا احساس ہے اور دوسری حنظل پر قسم کے مقابلہ میں جدید کا۔ تنقید کے دائرہ میں اگر اس کا مضمون یہ ہو جاتا ہے کہ دماغی کے اکثر مظاہر کی طرح ادب میں بھی تغیرات ہوتے ہیں اگرچہ ان کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ اس لیے تنقید کرتے وقت یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ادب اور شاعر کا ذہن بدل سکتا ہے اور بدلنے کے وجہ ہوتے ہیں۔ تنقید نگار کا یہ بھی فرض ہے کہ اس تغیر کے اسباب اور نوعیت اور اہل اصناف اور سالیب سے اس کے تعلق کا تجزیہ کرے۔

جیسا کہ کہا گیا اس وقت مختلف تنقیدی اسالیب رائج ہیں اور ہر اسلوب کے تحت پھرتے ہوئے اختلافات کی نمود ہوتی رہتی ہے۔ کیونکہ انفرادی رجحانات سے قطع نظر ایک طبقاتی سماج میں اور اک حقیقت کے طریقوں اور ذریعوں تک ہر فادہ کی رسائی یکساں طور پر نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اختلاف لائق و شعور کے وجہ آسانی سے سمجھ میں آسکتے ہیں۔ جو فادہ اس اختلاف کے وجہ مادی ارتقاء میں شعور کی سطحوں کا تعین کر کے اذہن دیتے ہیں وہ عمرانی اور تاریخی نقطہ نظر کے دائرے میں آجاتے ہیں اور جو ادب کے شعور کی جستجو اور اختلاف نظر کے اسباب کی تلاش، ادب کی نفسیاتی زندگی میں کرتے ہیں وہ طبیعتی اور ہنرمانی اسلوب نظر کے تریمان بن جاتے ہیں۔

ان دونوں ہی قسموں کے ماتحت تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ کئی کئی نکتے والے تجزیہ کر

لے جاتے ہیں۔ نہ انہوں نے باقاعدہ واضح کتاب خیال کی شکل اختیار کی ہے اور نہ ان کے مقالہ کی تصنیف کے لیے وسائل اخبارات اور کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ پھر بھی انہیں بچانا ہاسکتا ہے۔

تاریخی اخبار سے اصل نقد میں ارتقاء کی شعوری حویلیں بہت جلد نمودار نہیں ہوئیں۔ تبدیلی و تبدیلی کی ضرورت کا احساس خود تاریخ اور سماج میں ایک نیا سوا پیدا ہوئے بغیر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ہندوستان کی بے باک زندگی ۱۹۳۰ء کے بعد سے ہی چالیں چلی گئیں اور بین الاقوامی قصورات نے ان چالوں کو جس حد تک حد ڈر کیا انہیں کا نتیجہ تھا "ادب میں حقیقت پسندی کا ایک حائل شکل کا وجود۔ اس مادے کے پورے پھیلنے کے لیے یہاں کی زمین مناسب تھا اور فضا فراہم کرتی تھی۔ کوئی چاہے تو اسے زندگی کے مختلف مظاہر میں تلاش کر سکتا ہے۔ لیکن یہاں ذکر ہے صرف ادب میں تنقید نگاری کے ارتقاء اور اس سے جدید ذہن کے تعلق کا۔ اس لیے صرف یہ کہنا کافی ہو گا کہ اردو تنقید نے بھی ایک نئی راہ تلاش کی۔ اس سلسلہ کا سب سے پہلا اور بے حد اہم مضمون ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا مقالہ "ادب اور زندگی" تھا جو ۱۹۳۵ء میں لکھا گیا۔ اس کے مطالب اور موضوعات جیسے بہت سے دہوں میں پیچھے پیچھے تھے جیسے یہ بہت سے نئے لکھنے والوں کی ہیم آرزوؤں کا اظہار تھا کیونکہ تخلیقی ادب حقائق اور ان کے اظہار کو جس طرح اپنے دامن میں سمیٹ رہا تھا۔ ان کو سمجھنے اور سمجھانے، اہل روایات میں ان کے مقام کا قیام کرنے اور ان کے پڑھنے اور سمجھنے کی رفتار اور وسعت کا جائزہ لینے کے لیے جس نئے زمانے کی ضرورت تھی اس کے چند ابتدائی گمراہ کتابت اس مقالے میں لیاواں بھٹے تھے۔ جذباتیت، بھٹی، خیال کی کمی، شعور کی غای اور مسائل نقد کی ہر گہری سے واقفیت کے باوجود اس مضمون کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں ادب اور زندگی کے سماجی اور فکری رشتہ کا پتہ ملتا ہے۔ ادب کی طبقاتی بنیادوں کی طرف ذہن جاتا ہے "اس کے افادی ہونے کی نوعیت واضح ہو جاتی ہے اور ادب کی سماجی ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے۔ ادب اور اس کے ماحول کے تعلق پر اس انداز میں اردو میں پہلی دفعہ نظر ڈالی گئی تھی اور اگرچہ اس کی بار کسی بنیادیں واضح اور استوار نہیں تھیں پھر بھی مار کسی تنقید کی طرف یہ پہلا شعوری قدم تھا۔ اس مقالہ میں ماضی کے ادب کے حلق میر تقی میر کی روئے اختیار کیا گیا تھا لیکن اس میں پہلی بار ادب کو وقت کے

قانون کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اختر حسین رائے پوری نے تنقید میں ایک نئی منزل کی نشاندہی کی جس کا اعتراف ضروری ہے۔ انہوں نے اس کے بعد بھی حصہ تنقیدی مضامین لکھے جو وہ مجموعوں کی شکل میں شائع ہوئے لیکن بعد کے مضامین میں وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے گئے یہاں تک کہ اب وہ اپنے ہی خیالوں کی کلی کرتے رہتے ہیں۔

اہلہ کے تنقیدی ادب میں اختر رائے پوری کی تواضعی لیکن ایسے تاریخی تقاضوں کا نتیجہ تھی جسے بہت سے لوگ آہستہ آہستہ من رہے تھے کیونکہ اسی کے ساتھ ہی ساتھ انہیں ترقی پسند مسلمانوں کی بنیاد پرستی جس نے زیادہ واضح سا کھٹک اور مدلل انداز میں ان اصولوں کی اشاعت شروع کی جنہیں اختر رائے پوری نے جذباتی اور ہم دم دھمک سے پیش کیا تھا۔ سجاد ظہیر، احمد علی، ڈاکٹر عبدالعلیم اور سجاد حسن نے اپنے مضامین میں اور راقم الحروف نے اپنی ابتدائی تحریروں میں تنقید کے اس تجربے کو شعوری طور پر وسعت دینے، ہموار بنانے اور جذباتیت سے بچا کر پیش کرنے کی کوشش کی۔ ان تمام لکھنے والوں نے اس سے پہلے تنقیدی مضامین بہت کم لکھے تھے اس لیے ان کے نقطہ نظر کے بدلنے کا سوال نہ تھا لیکن دلچسپ بات یہ ہوئی کہ بعض اور لکھنے والوں کا میلان اس نئے اسلوب کی طرف ہوا۔ انہوں نے کبھی ادب اور زندگی کے سماجی اور طبقاتی رشتے کو حلیم کیا اور کبھی محض اسے تاریخی واقعات کے عکس کی حیثیت دی۔ یہ کیفیت فراق گور کچھوری، بیچوں گور کچھوری، ڈاکٹر اعجاز حسین، نعل احمد، سرور و قار، عظیم، ڈاکٹر ناشر کے تنقیدی مضامین میں پیدا ہوئی جس میں سے ہر ایک نے اپنے رنگ سے جہت کر مرانی اور سماجی تجربے کو اپنی تحریروں کا جلا ڈالا۔ یہ ۱۹۳۰ء سے پہلے کا ذکر ہے جب ترقی پسندی کے دائرے میں مارکسی، غیر مارکسی دونوں ہر دو نے میں شامل رہے ہیں۔ خود مارکسی قاعدوں میں اختلاف رائے کا اظہار ہونا رہا ہے اگرچہ یہ اختلاف اہل اصولوں کے مسئلے میں نہیں جتنا کہ یہ اور مسائل کے سلسلہ میں نمایاں ہوا ہے۔

ترقی پسند تحریک نے تھوڑے ہی دنوں کے اندر اپنے بنیادی اصولوں کی وضاحت کر دی۔ اس سے اس نظریے کے موافقین اور مخالفین دونوں کو آسانی ہوئی کہ وہ مکمل کر اس کے ہم لڑا یا مخالف ہو سکیں۔ یہاں تنقید انفرادی تاثر پذیر اور ذاتی پسندیدگی کے دائرے

سے نکل کر سامی علوم اور مذاہبات فن کی مد سے شعروادب کے پکے کا ایک کلمہ بھی
 تھی۔ محض بعض امت پھر سے یہ بات جانے سے کام نہیں چل سکتا تھا، اس لیے اس کے
 مہاتفوں اور کتابوں دونوں کو ہنگ اور پھٹ رہا ضروری تھا۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ تھا کہ
 مختلف قسم کی تحفیدوں نے استدلال اور عقلی بننے کی کوشش کی۔

نکل اس کے کہ چہ اہم ترقی پسند تحفیدی اصولوں کا ذکر کیا جائے تبدیلی کے بنیادی
 محرکات کا صحیح احساس کر لینا ضروری ہے۔ معاشی، معاشرتی، روحانی میں تھیں طبقاتی شعور اور
 آدیش، تہذیبی، فکری اور فلسفیانہ عقائد میں تبدیلی، مادی اور ذہنی عقل اور جذباتی اصولوں
 کے نئے نظام کی تلاش۔ یہ مادی باتیں بہت سی قوی اور بین الاقوامی صورتوں کا نتیجہ
 تھیں۔ انہوں نے ایک طرف الجھنیں پیدا کیں اور دوسرے طرف اپنے علوم اور ذرائع کو
 ہمہ را جن کی مد سے ان الجھنوں کو سمجھا اور ان کا حل ڈھونڈا جاسکے۔ اس حالت میں
 انسانوں نے اپنے جسمانی، روحانی اور جذباتی کرب کا علاج ہر جگہ تلاش کرنا شروع کیا۔
 ادب اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ذہنوں کو متاثر کرنے کی سب سے زیادہ صلاحیت
 اسی میں نظر آتی تھی۔ ادب اور ادیب اس یہ مطالبہ بے جا نہ تھا۔ کیونکہ ادیب زندگی کے
 اہم سوالوں کا جواب دینے سے بچنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ یہ جواب اپنے
 شعور، علم و ادراک کی مدد سے دیتے تھے اور عرض کیا جا چکا ہے کہ شعور کی تشکیل اور
 ترتیب میں سماج کے مادی عناصر بہت اہم ہوتے ہیں۔ ادیبوں کے تجربوں، خیالوں
 اور انہی خاکوں کو محض نفسیاتی سمجھا درست نہیں۔ طبیعت تو دہرو کے بعد ہمہ لپی ہے
 سانچوں میں ذہنی، بدلتی اور حاس سامی حالات میں خاص شکل اختیار کرتی ہے۔ اس طرح
 ادیب اس تہذیبی اور فکری زندگی کا جزو بن جاتا ہے جس کے حلقہ وہ لگتا ہے جس کی
 ترجمانی کرتا ہے محض چند اوصالی بیانات کا سطر نہیں ہوتا۔

ادب کی اس حیثیت کو سمجھنا اور ادیب کے انہی سرچشموں کا سراغ پانے کی کوشش
 کرنا، سماج کے ذہنی ارتقاء کے مطابق فنی مذاہبات کی توضیح کرنا اور قوم کی تہذیبی زندگی میں
 ادیب اور ادیب کے مقام کا تعین کرنا نتیجہ نکلتا ہے۔ گو فلاسوں اور ادیبوں کا ایک گروہ
 تحفید کی اس حیثیت کا سکر ہے اور آج بھی تحفید کو محض تخریج، محض ماز، محض تسکین ذہنی
 اور محض حسن بیان سمجھتا ہے۔ ایسے خارج بھی منظم نہیں ہیں بلکہ اپنی نظرائی آزادی کے نام

جعفری، اختر انصاری، طبر کا شیری، عابد، منو، ظیل الرحمن، ہا فرصدی سب اس دائرے میں آجاتے ہیں۔ اگرچہ فراق اب بھی اکڑ و پشتر، آڑائی اور محالوائی رنگانات سے اس طرح مطلوب ہو جاتے ہیں کہ اپنے دلائل کی مادی توجید نہیں کر سکتے۔ جنوں بھی ادب اور رنگی، ربح مصر، ماحول اور وقت کے خاصوں کا ذکر کرنے کے باوجود اپنی پھولائی ہوئی حسی کی طرف پلٹ کر دیکھ لیتے ہیں۔ ڈاکٹر طہیم، ممتاز حسین، سردار جعفری، انجمن حسین، عابد حسن منظر، مارکس کے نظریات کو پورے تنقیدی شعور کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ سردار محمد حسن اور عبادت مارکسی اصولوں سے سولہوی تعلق نہ ہوتے ہوئے بھی ان اہم رائج کو نظر انداز نہیں کرتے جن کی طرف مارکس نے حوجہ کیا تھا۔

یوں موجود تنقیدی ادب کا بڑا حصہ کسی نہ کسی شکل میں ادب کے قریبی پسند نظریات سے متاثر ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے باہر تنقیدی ادب یا تنقیدی نقطہ نظر کا وجود ہی نہیں۔ مولانا عبدالحق، نیاز فتح پوری، مسعود حسن رموی، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر زبیر جعفری، خاں اثر، سید عابد علی عابد، پروفیسر سردار، حنیف شادانی اب بھی لکھتے ہیں۔ لیکن اب یہ حضرات تنقیدی ادب کی رفتار، اس کے اسالیب اس کی اصول سازی کی کاوشوں کو متاثر نہیں کرتے۔ صرف رشید احمد صدیقی بھی کبھی چوکا دینے اور پھیلنے والی باتیں کہہ دیتے ہیں۔ ان حضرات کی اہمیت مسلم ہے لیکن اب ان کے ہاتھوں تنقید کے اصول نہیں بن رہے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر عبداللہ، ڈاکٹر ابواللیث، وقار عظیم، اختر اور نبوی، مسعود حسین خان اور خواجہ احمد فاروقی یہ جدا جدا موضوعات پر کلمہ رہے ہیں اور گہری تنقیدی ہمیرت کا پتہ دیتے ہیں لیکن ٹھیکائی تنقید کی محسوس کو سلجھانے کی طرف ان کی توجہ نہیں ہے۔ ان کی تنقید عراقی، فلسفیانہ اور قلمی تنقید کے اصولوں سے اپنے اپنے انداز میں متاثر ہوئی رہتی ہے۔ عزیز احمد، ممتاز شیریں اور طاہر کے ہاتھوں بھی اردو تنقید کے سرمائے میں اضافہ ہوا، مگر ایسے تنقید کی طرف حوجہ ہونے کے اور مواقع ملتے رہتے تو یہ نئے قاعدوں کو متاثر بھی کرتے کیونکہ ان میں سے ہر ایک، ایک خاص انداز کا تنقیدی اسلوب اور گہری نظر رکھتا ہے۔ نفسیاتی تنقید کے چہرہ دلچسپ نوٹنے میرانی اور ریاض احمد نے پیش کیے ہیں یہ رنگ پوری طرح مقبول نہ ہو سکا۔

اس ضمنوں کا مقصد اردو کے تنقیدی سرمائے کا جائزہ لینا نہیں بلکہ تنقید میں اصول

سادگی کے حرکات پر غور کرنا ہے۔ اس حد انتشار میں فکری توجہ میں نے غلطیوں کو جس طرح مٹا دیا ہے اسے سمجھنا ہے اگر عطف اس سبب نقد کو وقت کے منتشر مقامات سے ہم ہٹ کر کیا جائے۔ اسی وجہ سے نہ تمام غلطیوں کے نام لے کر لے دیے ہیں اور نہ ان کی توجہ کی تخریب کی گئی ہے۔ بلکہ ضرورت ان کا ذکر کرنا ہے۔ لیکن پھر بھی محکمہ بالکل احموری نہ ہائے گی اگر وہ محض ہم غلطیوں کا ذکر نہ کیا۔ یہ ہیں: کلیم الدین احمد اور محمد حسن نسکری، ایک دوسرے سے بالکل عطف نہیں اپنی بات فطری اور بات پر حق کے اعتبار سے ایک دوسرے سے قریب، بالکل غیر مطمئن اور مطمئن ہیں۔ ایک خاص قسم کی نظریاتی کا شمار یہ عطف راستوں سے چل کر ادب میں نصیبی اور عوامی پسندوں پر زور دیتے ہیں۔ ایک کے ہاں عہد کی جگہ دکھائی دے دوسرے کے ہاں عہد ہے۔ دونوں کو ترقی پسندی سے سخت اختلاف ہے، دونوں کسی مخصوص ذاتی تصور اور عظیم سے نظر رہیں۔ پھر بھی دونوں تصورات کی ایک ایک دہائی کے لئے والے ہیں۔ کلیم الدین احمد ادب میں ایک ایسی فی خلیل اور احمد کے تجربوں میں ایسی انفرادیت اور پاکیزگی چاہتے ہیں جس کا احساس صرف انیسویں صدی کے ادب کو زندگی کے مادی پسندوں سے نکالنا نہیں ہوتا چاہتے۔ پھر بھی ادب کے ذاتی تجربوں پر بہت زور دیتے ہیں اس طرح ادب کی وقتی دنیا کو اس کی حیاتی دنیا سے بالکل جدا کرنا چاہتے ہیں جو خود انہیں پسند ہے۔ یہ کوئی نیا تھ نہیں ہے۔ ادب و زندگی سے دور رکھنے والے تصور خیال کی ایک شکل ہے پھر بھی کلیم الدین احمد موجودہ دور کے بعض ماہروں کو متاثر کرتے ہیں کیونکہ بہت سے لوگوں کے لئے اس ریاضت کا فائدہ ہے۔ رجعت سے رجعت واپس، رجعت پسند لوگوں میں سے فتنہ فتنہ کے بہت سے وہی مل جائیں گے۔

محمد حسن نسکری کا معادہ اس سے مختلف ہے۔ وہ اشارہ لکھتے ہیں 'السانہ لکار کسانہ' بند نہیں کرتے۔ تخریب نہیں لکھتے ہیں۔ خدا کسانہ لکار لکھتے ہیں۔ اپنی مضامین لکھتے ہیں ادب کا کسانہ لکھتے ہیں۔ یہ محض کسانہ نہیں ہے، رجعت پسندی کی ایک خاص شکل ہے جو بہت سے 'طوائف اقدار' کو گھمبیر اور سماجی نصرت کو حلیم کرنے کے لئے ہر جنات کے داخل نظام کی اہمیت اور ادبوں کے تجربات کی مدد دیتے ہیں اس قدر زور دیتی ہے کہ بنیادی انسانی صورتوں کا تصور بے معنی معلوم ہونے لگتا ہے۔ تاریخ، رجعت اخلاق کی ترجیح اقدار عام انسان

ایک حوالہ اور صحت منہ نظام حیات مرتبہ کرنے کی خواہش سے دلچسپی کے باوجود یہ عقیدہ کہ حقیقت اس وقت تک حاصل نہیں ہوئی جب تک کہ وہ انسان نہ بن جائے یا صرف ایسے خیالات سے دلچسپی لینا جنہوں نے ریاضیوں کے دل و دماغ میں ایسی ایسی دہلی کی طرح کی حرکت پیدا نہ کی ہو، کچھ میں کہنے والے باتیں نہیں ہیں۔ مسکرائی کی کیا ہندویت ہے، انہیں جان بوجھ کر لکھا جائے کہ یہ مجبور کرتی ہے۔ جیسے دوسرے مواقع پر غالباً وہ خود پر دے کر لکھیں۔ مارکسی عقیدہ پر وہ اعتراض کہنے کے لیے عقائد مانع کئے اور حقائق کی تلاش (وجہ کہنے سے بھی پرہیز نہیں کرتے۔ مثلاً کہیں۔ مارکسیت پر واقعی انداز کاغذ ان کے اور ان کی اخلاقی قدروں اور سچے انسان کی جستجو کرنے کی سلی، حاصل کا احترام لگاتے ہیں اور کہیں ہندوؤں والے دوسرے یا کسی فرائض، اعتقاد پند کے یہاں سے اخلاقی تجویزوں سے حقیقت اور سچے قدروں کی تلاش کر رہے ہیں۔ مسکری سے یہ اسیر نہیں ہو سکتی کہ۔ مارکسیت میں "محض معاشی ماحول" کی تبدیلی کو سب کچھ سمجھیں گے یہ اوجھڑ اور سچے بات کہیں گے کہ مارکسی انسان کے اندر صرف بہت کم تعلیم کرتے ہیں۔ مارکیوں پر یہ تفریح کریں گے کہ وہ انہوں کو ملایمیت سنا چاہتے ہیں یا "مراۃ" کے بدلنے کا مطلب یہ سمجھیں گے کہ مارکسی انسان کا جسمانی اور انسانی اچھے برے کے برقی ہیں

مسکری کی جاندار خوبصورت۔ اپنی توجہ ادب کے حلقے بہت سے سوالات اللہ تعالیٰ ہے، سوالوں کا جواب نہیں دیتی۔ ایک قسم کا "کفر" ہے کہ وہ اپنی نہیں سمجھتی کہ میں جھکا کرتی ہے "یقین کے دور" سے نہیں کھڑی۔ کہیں ان باتوں کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ ان کا مقصد نہیں ہے اور کہیں ادب کے دور سے ان خصوصیات تک رسائی دے کر ان کے اثر و ثبات ہے۔ ان کی دہم مقصدیت میں۔ عہد ہے۔ ان کی غیر جاہلاری میں تقصیر ہے "ان کے دلائل میں جھڑپ ہے۔ وہ رہے۔ ان کے دلائل کو قوت دینا ہے کہ بجائے کہہ کر لیتی ہیں

فلسفہ میں۔ مثلاً، ان کا اہم حوالہ "تفہیم" مطلب "وسیع مطالعہ" عزیز زہن اور مسکری لکھار کے مالک ہونے کے باوجود عقیدہ کے بنیادی سچ کو حل نہیں کر رہے ہیں۔ اس وقت عقیدہ کا مسئلہ محض ادب کی پرکھ کا مسئلہ نہیں، اپنی نواز اور اپنے ادب سے دل ہمیں لیے آئے مسئلہ ہو، نہیں ہے۔ جگہ ادب کے حالی میں ایسا کو چھڑھڑک کر ہر اس علم و فن سے تادم

لینے کا مسئلہ ہے جس سے انسانی ذہن 'عمل اور حرکات عمل کو سمجھا جاسکتا ہے۔ ادب کی تنقید زندگی اور زندگی کی قدروں کی تنقید ہے۔ کیا ہے اور کیا ہونا چاہئے کی تنقید ہے۔ ادب کے اندر تنقید ہے اور بحر مقام زندگی کی تلاش ہے تنقید نہ تو تاریخ ہے نہ فلسفہ نہ سیاست ہے نہ سائنس لیکن یہ علوم جس حد تک انسانی ذہن میں داخل ہوتے اسے حاشا کرتے اور شعور کا جزو بنتے ہیں اس کی جستجو ہے۔ کچھ دن پہلے اہل چرواہوں کا پرہیز 'ان سے لطف اندوز ہونا اور ان کے متعلق تنقید کے انداز میں کچھ رائے دیا آسان تھا۔ آج اور مسلم سے لے کر سارے تک سب انسانی ذہن کی کلیات اور تعبیرات پر رائے دیتے ہوئے اگلیت لٹائی کرتے ہیں اور ذمہ داری کا احساس قلمباز کرتا ہے کہ اظہار حالی ادب کے ساتھ ساتھ 'ارسطو' 'ڈرائیڈن' 'کولریج' 'سینٹو آرٹھ' 'ریڈ کرس' 'ایبٹ' 'لیوی' 'پٹامکن' 'ٹیٹ' 'آڈر ہاؤس' 'ولسن' 'برک' 'سیٹ پیٹن' 'ٹارے' 'کافیٹے' 'لاناگ' 'سارتر' 'کوسٹ' 'ارے' 'پارز' 'ہرار' 'ٹک' 'ٹیلر' 'ویگل' 'مارکس' 'فرائیڈ' 'پریگ' 'ملکی' 'تیلوف' 'گورکی' 'بولڈن' 'جس کے تنقیدی خیالات اور اپنی تحریکات سے دنیا اٹھایا جائے۔ اگر تنقید کوئی طبعی کام ہے اور محض تاثرات کا بیان نہیں ہے تو ان تمام جدید علوم سے کام لینا ہوگا جس سے زندگی اور ادب کو سمجھا جاسکتا ہے۔ پھر اصل دشواری یہ ہے کہ ان عقائد اور عقائد نظریہ فکر رکھنے والوں کی تنقید کرنے کی ضرورت بھی ہوگی جو مشکل اور ذمہ دارانہ کام ہے۔

موجودہ نظام کے ذہن پر لائق مصلحتوں کا سایہ چڑھا ہے جسے محض جمناؤ پلوک سے دور نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لیے تیس مصلحت کی ضرورت ہے۔ یہ مصلحت قومی ورثین الاقوامی تعمیرات ان کے پیچھے در پیچ اثرات 'تہذیبی اور فکری ہدایت' قومی زندگی کی خصوصیات کے مطالعہ کے بغیر ممکن نہیں۔ ہاں ایک تعمیر پر کوئی اٹھتا ہے 'انسانی رشتے بدلتے رہتے ہیں' خراب و خیال کے سانچے بدلتے ہیں۔ ایسی حالت میں ادب اور اس کے حرکات کا بدلنا ایک فکری عمل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے تنقید کے بحالیاتی 'نسیاتی' 'عمرانی' اور مقامی 'سالیب' وجود میں آتے رہتے ہیں۔ 'ادب میں تنقید کی ہدایت وہی تو ہے لیکن اسے انجمنوں سے سہارا دینا ہے۔ اس لیے ابھی اس کا بہت سا حصہ اپنے اپنے فناء فکری تحریکات' 'درماز' 'ناول' اور 'فارغ' میں صرف ہو رہا ہے۔ لیکن جس حد تک اور شغف سے کچھ فناء ادب کی لے گئے 'فنا کے منصب کا اہل کرنے' ادب کی آزادی اور سماجی ذمہ داری

میں تامل قائم کرنے، دہ کی بددیواری اور اٹاکی حبشوں میں تعلق پیدا کرنے، ماضی کی
 جھلی فراموشی، اعزاز لگانے، سہارا اور نصیحت کے دھنچکے کو سمجھنے اور تنقید کے درجہ اولیٰ لائق کی
 تربیت کرنے میں لگے ہوئے ہیں اسی سے یابوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ تنقید شعور کا
 اعلیٰ مدفن کرنے اور لائق ادب کی تہذیب میں سرگرم رہی تو وہ اپنا فرض ادا کرتی رہے گی۔

ادبی سہانوں کے آبرو



تعلیم یافتہ اور باشعور قارئین کا پسندیدہ رہنما

105/C. نیشنل آرٹ گالری، مارٹن روڈ، کراچی۔ ۷۴۲۷

”میں کیوں لکھتا ہوں؟“

”میں کیوں لکھتا ہوں؟“ اس سوال کے چند جوابات اس قسم کے ہو سکتے ہیں: میں اپنے لیے لکھتا ہوں، اپنی جذباتی آسودگی اور روحانی تسکین کے لیے، پیسوں کے لیے یا میں نہیں جانتا کہ میں کیوں لکھتا ہوں، کوئی اندرونی لگن، کوئی پراسرار قوت، کوئی مظلوم حالات، کوئی بے نام سی عقلی صلاحیت، کوئی وجدانی کیفیت میرے ہاتھ میں قلم دے رہی ہے اور میرا لکھ رہا ہوں۔ میں عوام کے لیے ایک ایسے صحت مند اخلاقی پیغام کی تبلیغ کے لیے لکھتا ہوں، میں اپنی اللہ دوستی اور غصیت کے اظہار کے لیے لکھتا ہوں اور میرے لیے ادب ہی اس کا ذریعہ ہے۔ میں کائنات کی بعض چیزوں سے متاثر ہوتا ہوں اور دوسروں کو بھی اس سے متاثر کرنا چاہتا ہوں۔ میں اپنے ضمیر کی مددگار دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ میں بعض لوگوں کی باتوں سے اختلاف رکھتا ہوں یا نہیں لکھتا لکھتا ہوں۔ اور اپنا اختلاف اور دوسروں کی عقلی کارکردگی کے لیے لکھتا ہوں۔ یہ تو صرف چند قسم کے جوابات ہیں جو الگ الگ الگ الگ ایک ساتھ دیکھے جاتے ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنے سیاسی مصالح، مالی دواہی، جذباتی تعلقات اور دماغی رویہ پر پردہ ڈالنے یا کم سے کم انہیں ہمہ جہان کے لیے ایسے جوابات بھی دیے ہیں کہ ناظر سرگرداں ہو جاتا ہے اور خیالات کی باریکیوں کی جستجو کرتے کرتے طرہ اپنے کم جالے کا اندیشہ ہونے لگتا ہے۔

”میں کیوں لکھتا ہوں؟“ اس سوال سے یہ دسرا سوال بھی وابستہ ہے کہ ”میں کس کے لئے لکھتا ہوں؟“ اور عام طور سے یہ جواب کہ میں تمام انسانوں کے لئے لکھتا ہوں کی ہوسوں سے مناسب اور سوزوں نغمہ آتا ہے۔ اگرچہ اس کے پردے میں بالکل مختلف قسم کے وابستہ کی کارفرمائی ہو سکتی ہے، یعنی انسان کی اصلی زندگی کو نظر انداز کر کے بھی یہی بات کہہ جا سکتی ہے اور ان کی محبت کے تحت منہ ہر یہی سرشار ہو کر بھی۔ بیحد توفیق مگر اس طرح کے جواب پر سو کر رہے ہوئے بھی کبھی اصل جذبہ تک رسائی مشکل بھی ہو جاتی ہے۔ چونکہ مختلف نظریاتی بنیادیں ہیں اور اہم الطبیعیاتی بھی ہو سکتی ہے۔ اور حقیقی زندگی کو دیکھتے ہوئے انسانیت کو توڑے ہوئے بھی۔ اس کے یہ دسرا سوال اور اس کا جواب لکھنے والے کے انداز نظر کا لازمی جزو بن جاتا ہے۔ ادب کو زندگی سے جدا سے جانے والوں نے ان سوالوں کا ذاتی اڑایا ہے۔ پہلے وہ دنیا تر میر شعوری طور۔ دیکھا ہوا تھا جیل آج اکثر کئے گئے شعوری طور پر ان سوالوں کا جواب دینے سے گریز کرتے ہیں کیونکہ بڑا دھوروں کے باوجود انسان اور اس کی زندگی ان کی نگاہ میں کوئی قیمت نہیں رکھتی۔ فرانس کے ایک مشہور ناول میں جب ایک کردار سے یہ کہا جاتا ہے کہ ”آخر زندہ رہنے کا بھی تو سوال ہے؟“ تو وہ جواب دیتا ہے ”زندہ رہنے کا سوال؟ تم نے بھی خوب بات کہی۔ ہمارے نوکر چاکر ہمارے بے یہ کام کریں گے“ یہ ٹھٹھکی ہوئی بات نہیں اس کے پیچھے زندگی سے حقائق ایک اہم نقطہ نظر ہے جس کی ترویج زندگی سے ہندو تر ہو کر لوگ کرتے رہے ہیں۔ آج بھی ایسے انسان کی کمی نہیں ہے۔

بکھرا ہوا ہونے والے کتابیں پڑھیں۔ یہی کتاب نہیں اگرچہ ان لوگوں کے چند خطوط کا مجموعہ ہے اور ”میں کیوں لکھتا ہوں؟“ (Why do I Write) کے دس کئی عنوان ہیں۔ یہ کتاب میں شائع ہوئی ہے۔ یہ خطوط برصغیر کر دہم ہیں اور فرقہ ہاؤں کے ایک اور سے کو لکھے ہیں۔ دوسری کتاب ہے فرانس کے مشہور نفسی ادیب سارتر کی تصنیف کا ”اگرچہ بڑی ترجمہ“ ”ادب کیا ہے؟“ (What is Literature) دونوں کتابوں کے لئے اپنے پھر ہیں کہ ہر مختصر نئے ادیب سے ملتا ہے اور جو ادیب کے معاملے میں جواب دہی دے رہا ہے انہیں پڑھنے کی خواہش سے منسوب ہو جائے گا۔ میں بھی ادب کا ایک طالب علم ہوں اور مجھے بھی یہ سوالات الجھائے رکھتے ہیں کہ ادب کیا ہے؟ ادب کیوں اور

میں نے لے لیا تھا ہے؟ اور ان منہجین کے خیالات سے اختلاف رہنے کے باوجود میں نے ان کتابوں کا مطالعہ اس امید میں کیا کہ شاید روشنی کی کوئی کرن نظر آجائے، کوئی اشارہ ایسا مل جائے جو آدمی کی عقل اور نظر افزہ ہو لیکن مجھے اس امر نے، میں شرم نہیں محسوس ہوتا کہ دونوں کتابوں میں مجھے ان سوالوں کا جواب نہیں ملا جو ان کے ناموں نے پیدا کئے تھے بلکہ سچ تو یہ ہے ان کا بہت قصور اس حصر میں بھی تھا۔ اکثر مقامات لائقِ مبالغہ ہیں۔ سوال از مسائل و جواب از مسائل کی طرف رجوع جاتا ہے اور مسائل کے حل کی کوشش انکا پروا ہی کی کوشش سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہوتی۔ دونوں کتابوں کے لکھنے والے جس مقام پر واضح خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں وہ ایسے کمزور، بے بنیاد، میرا ہم 'فیر منطقی' اور کمزور کن ہیں کہ جس سے جی ادب کی حقیقت اور نوعیت کے معلوم کرنے پر کچھ مانع سوری کی ہے وہ ان خیالات کو کمزوریوں پر ڈالتے اور مرد گناہ کو کشش سے زیادہ کچھ نہیں سمجھ سکتا۔ دونوں کتابوں کے بڑے بڑے موضوع سے فیر حقیقی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مسائل کی اہمیت نے مصنفوں کو اکتفا خیال پر تھکا کر رکھا لیکن جب واضح باتیں کہنے کا وقت آتا تو ان کی خواہشوں اور تمناؤں نے سارے دلائل سے گریز کر کے اپنی ذاتی منطق اور ابہام کا بھیاں تک چھو سائے کر دیا، یہ بحث نے کہا میں تو اپنے لیے لکھتا ہوں" اور سادہ رہنے کا میں اس کثافتی انسان کے لیے جس کی کسی خاص حد سے توقع نہیں، تاہم جہر قوم، طبقہ اور نسل کے جذبات پر باطنی فتح حاصل کر لیتا ہے۔ ان کتابوں میں بہت سے پانچ آئے ہیں لیکن اس وقت صرف انہیں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ادب کے مقصد پر توجہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

انگریزی ناول نگاروں کی کتابت مختصر ہے۔ بحث برسرِ بحث کے ان دو خطوط سے شروع ہوتی ہے جو الزبتھ ہارن کے نام لکھے گئے ہیں اور جن میں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ "میں کیوں لکھتا ہوں؟" ہارن نے وہ دونوں خطوط مع اپنے خیالات کے گراہم کریں کے پاس بھیج دیئے اور یوں چند خطوط میں یہ بات سلجھانے کے بجائے ابھاری گئی ہے۔ کیا ادب کیوں لکھ؟ یہ آخر بحث نے شرارتی میں کہہ دیا ہے کہ عقیدہ و تعلق دونوں ہیں اور ادب دونوں ہی سے جو کچھ لکھتی ہے اس شخصیت سے نکلتا ہے جو عقیدہ رکھتی ہے۔ یہی وہ خیال ہے جس سے تن کا سراپہ دارانہ غلباتی نظام اپنی بنیاد کے لیے وجہ

جو ادائیگی کرتا ہے۔ اسے یہ دھوکہ کھانا اور دھوکا دینا اس قدر اچھا لگتا ہے جس میں نہ
 کی سوا یہ داری اور اس کے حلیف آج بھی کہیں کہ ایمان داری کے ساتھ سوچتے اور
 لکھتے والا یہ نہیں کر سکتا کہ وہ مانا جاتا ہے اور لکھتا ہے کہ۔ اسے اس دلی ہی میں فرار کا
 راستہ ملتا ہے کہیں کہ ایسے اصحاب کے ہتھیار کی جانچ نہیں ہو سکتی ہے شاید یہ بات میں نے
 لکھ کر 'جانچ تو ہو سکتی ہے لیکن اپنے طور پر وہ کسی کو اس جانچ کا موقع نہیں دیتا جانتا۔ چہ
 ہی کوئی غدار اپنے خیالوں کی چھان بین کرے گا وہ کہے گا یہ میرے ہتھیار نہیں میں نے تو محض
 کہہ دیا ہے اس طرح وہ اپنے لیے حصار بنائیں کہتے رہنے کا حق بھی باقی رکھتا جانتا ہے اور
 تنہید سے بچتا بھی۔ یہی وہ سبب ہے حاکم طبقہ کا طرف داری میں کرم کی حالت کرنے لگے
 اور سبب چاہئے کہ انہی حرام دہشتی کا دم بھرنے لگے۔ اصحاب کے شعور کی یہ خطرناک آزادی کہ
 وہ دہر چاہے کہے 'جب ایک طبقاتی نظام زیر بحث آئے اس وقت یہ سمجھ لینا چاہئے کہ 'بھڑ
 بکریوں کو پھانسی لگانے کا حق مانگ رہے ہیں۔ بریخت خیال اور عقیدہ کی دلی کا یہ مجموعہ
 نظریہ پیش کرنے کے بعد یہ بھی نہیں کر سکتا کہ وہ اپنے لیے لکھتا ہے۔ وہ خود کیا ہے؟
 عقیدے والی شخصیت یا خیال والی شخصیت؟

بریخت نے لکھا ہے کہ یہ حیثیت اصحاب کے ہمارے ہے یہ کوئی اہم سوال ہی نہیں کہ
 نائنیم سے کیا مطالبہ کر رہا ہے ہمیں تو اصحاب کی حیثیت سے صرف اپنے انداز میں اس
 مطالبہ کا جواب دینا ہے اور وہ انداز یہ ہے کہ مبلغ انداز سے اس طرح چٹا چاہئے جسے
 کوئی شیطان سے چٹا ہے۔ اصحاب کو خیالات کے انحصار کی آزادی دینے کے بعد بریخت کو
 عقیدہ کے انحصار پر پابندی لگانے کی ضرورت کا احساس ہوا اسے یہ گوارا نہیں کہ اصحاب
 انسانوں کے قاعدے کی کوئی بات شعوری طور پر کہے۔ اس غیر جانبداری کا مطلب ہر شخص
 سمجھ سکتا ہے۔

یہ بحث اگ ہے کہ کسی اصحاب کا غیر جانبدارانہ اور حالات سے بے تعلق ہونا کہاں
 تک ممکن ہے لیکن اتنی بات تو واضح ہے کہ اکثر اصحاب بے تعلق کے پردے میں 'عوام
 حالت' کا قتل کا ساتھ دیتے ہیں۔ جب ہم موعودہ دور کے مالی ادب پر نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ
 بات صاف ہو جاتی ہے کہ عوام دوست اصحاب اپنی جانبداری کا اعلان کرتے ہیں اور ہر جگہ
 لکھتے ہیں شعوری طور پر عوام کے مفاد کے لیے لکھتے ہیں لیکن وہ اصحاب جو سرمایہ داری کا حاکم

بعد کا ساتھ دینا چاہتے ہیں اپنی غیر جانبداری کا اظہار پہنچتے ہیں یہاں تک کہ جب ان کا
مقابلہ اور تجویز ان سے کوئی ایسی چیز گھرا رہا ہے جس سے عام انسانوں کے عباد کا کوئی پہلو
لگے تو وہ اس کی تائیدیں کرتے ہیں۔ چنانچہ بریخت نے خود لکھا ہے کہ میں نے ایک کمانی
لکھی تھی جس میں ہسپتال کی بھلی خرابیوں پر بے شبہ کی گئی تھیں، ایک برس نے اس
لکھنے کے شریک میں مجھے ایک خط لکھا میں نے اسے جواب دیا کہ جیسا "مجھے اسپتال کی
رابیوں کا تجربہ ہے اور میں نے افسانے میں ان کا ذکر بھی کیا ہے لیکن جب میں افسانہ لکھ
تا تھا اس وقت یہ مقصد میرے سامنے نہیں تھا۔ میں تو اپنی ساری کوشش بہترین الفاظ اور
بہترین تصویر کشی پر صرف کر رہا تھا اگر اس میں کسی سماجی جذبہ کا اظہار ہو گیا ہے تو اس کی
حیثیت محض ذاتی ہے، کیسی حیرت کی بات ہے کہ میری بے مقصد کمانی کو ایک ایسے مقصد کا
تھمار سمجھ لیا گیا۔" بریخت کو پریشانی یہ ہے کہ اگر اس کمانی میں مقصد تلاش کر لیا گیا اور
میں نے اسے تسلیم کر لیا تو پھر اسے اپنی ہر تحریر کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا اور عوام
دوست اسپتال کے سوا آج کسی میں یہ اخلاقی جرات نہیں ہے کہ وہ کلمہ نکلا اپنے ارادے
نیت اور عمل کی ذمہ داری قبول کرے۔

سماجی جذبہ کی نقل کرنے کے بعد بریخت خود ہی یہ سوال کرتا ہے کہ "میں کیوں لکھتا
ہوں؟" اور جواب میں صاف صاف لکھتا ہے کہ میں نہ تو کسی پڑھنے والے کے لیے لکھتا
ہوں نہ عوام کے لیے نہ سماجی کے لیے۔ میں تو بس اپنی ذات کے لیے لکھتا ہوں صرف
اپنی طرفی کے لیے اور ہر بار میری خواہش ہوتی ہے کہ میں پہلے سے آگے بڑھ جاؤں اور ہر
بار میری بار ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ جب کوئی پڑھنے والا یہ نہ ہو تو کیا تم اس وقت
بھی لکھو گے؟ تو میں جواب دوں گا کہ شاید نہ لکھوں لیکن میرا فارغ لکھنا ہرگز بند نہ کرے
گا۔

لیکن کیا کوئی ادب یا غیر ادب، بریخت کے اس جواب سے مطمئن ہو سکتا ہے؟ چنانچہ
جوابی تو معصوم اور پڑھنے والے کے درمیان ایک رابطہ ہے۔ اگر وہ قائم نہیں ہوتا تو ادب
دعویٰ میں بھی نہیں سکتا ہر کچھ زمین میں گزر رہا ہے وہ ادب نہیں ہے، ادب وہ ہے جو ادب
کے عملی اظہار کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ "میں
کیوں لکھتا ہوں؟"

الرحمہ ہونے شریا ان خیالات کی تائید کی ہے۔ اپنے خیالات کا اظہار کرے
 ہوئے خاتون محرم نے لکھا ہے کہ غالباً ادب میں صنعت بہت بڑا ہیم ہے لیکن ڈیرہ ہے کہ
 صنعت کے پکر میں پھنس کر ہم لوگ زندگی کی صنعت کو بھول جائیں بلکہ ہمیں زندگی کے
 مسائل میں حصہ لینے کا شوق ہے ہمیں ان سے بالکل الگ رہنا چاہئے۔ ہمارا کام تو بس لکھنے
 رہتا ہے۔ ادیبوں کو ہر قسم کے غلو اور حربوں پر اپنا نام نہیں دینا چاہئے کیونکہ وہ ان
 چیزوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ وہ ان بھی ادیب
 کی بنیاد محض حیاوں پر رکھنا چاہتی ہے اور زندگی کی تکفل کو سمجھنے میں کسی کی طرف ذرا توجہ
 دینا چاہتی۔ بلکہ ظالموں اور مظلوموں دونوں کی ادیب بنی رہنا چاہتی ہے۔

گرامم گرین بھی بریتن کی طرح اپنی کہانیوں میں وقت کی رجحانات دیکھ کر غوطہ کھانے
 ہو جاتا ہے اور لکھتا ہے کہ میرا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا کہ اس میں اپنے عہد کی جھلک دکھائی
 دے۔ یہ خیاں سارتر کے اس خیال سے گہری مشابہت رکھتا ہے کہ ادیب کو تو تقاضا انسان
 کے لیے لکھنا چاہئے جو زمان و مکان سے دور ہو۔ جس وقت تک دنیا محنت کرنے والوں اور
 محنت سے فائدہ اٹھانے والوں سے بھری ہوئی ہے جب تک متعاد اور مخالف متاد رکھتے
 اسے طبقات موجود ہیں اس وقت تک ایسے انسانوں کی جستجو ایک دہم کی جستجو ہے۔ ہمیں بلکہ
 ظلم و برصت پر پردہ ڈالنے کا مانہ ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ سارتر اس بات کو تسلیم کرتا
 ہے کہ ادیب کسی حالت میں جو نا انسانی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ گرین لکھتا ہے کہ ادیب کو
 غیر اخلاقی نہیں ہونا چاہئے اور بریتن کا خیال ہے کہ وہ اپنی میں تضاد ہونا رہتا ہے اور
 ادیب اس تکفل سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ لیکن وہ واضح لفظوں میں بتانے کا وقت نہ آتا
 ہے کہ ادیب کیوں لکھتا ہے تو یہ لوگ ظلم و اخلاقی اور تکفل کے حلقہ محض ایک تھیں
 وہ اختیار کر کے رہ جاتے ہیں اور واقعی دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی طرف سے آنکھیں
 بند کر لیتے ہیں۔ بریتن لکھتا ہے کہ ادیب اور ساج میں ہم آہنگی ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر ہم
 آہنگی پیدا ہو جائے تو ادیب کے پاس فٹیلی کہانیاں لکھنے کے سوا اور کچھ نہیں رہ جائے گا۔
 چونکہ دوس میں یہ ہم آہنگی پیدا ہو گئی ہے اس لیے بریتن کے خیال میں وہاں کا ادیب بیکار
 ہو گیا ہے۔ اگر آج کے دوس ادیب میں بریتن کو مرل فٹیلو کہانیاں نظر آتی ہیں تو اس
 کے "گے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اس۔ کو نزدیک یہ تکفل

ہر ادب کے لیے مسالہ اکتا کرتی ہے جس شخص سے وہ فرو سے دست ہوتی ہے۔
 واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ ادب کے خیالوں پر چاہے جو اثرات ہوں اس کا تحلیل آزاد
 ہے۔

حقیقت پسندی کے صائب رنگی وہ ہر جہد ہے جو مختلف شعبوں میں اکثر سرمایہ دار ملک
 میں جاری ہے، جہاں ادب اور زندگی کی بے حلقی کا قلمبند بن کر کے حاکم طبقہ کے اقتدار کو
 'سناور رکھنے کی ہر ہر کوشش جاری ہے' یہی بات ادب و سیاست کو لگ رکنے کی تلقین
 کر کے کہی جاتی ہے، یہی ادب کی داخل آزادی کے نام پر تنقید کے لحاظ سے ہر حال میں یہ
 کوششیں ایک ہیں جس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ادب اس طبقاتی عقل، علم و
 ذہن کوٹ کھسٹ کا ذکر نہ کرے جس سے حرام میں حاکم طبقہ کے خلاف نفرت اور بغاوت کا
 جذبہ پیدا ہو۔ ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے ادیب بھی اسی راہ پر چل رہے ہیں لیکن
 یہ گمراہی (شاہد ایک آدمی کے معاملہ میں یہ خود فریبی ہوئی نمایاں ہوتی جا رہی ہے اور ممکن
 ہے کچھ دنوں تک ان کی باتیں اونچے و۔ جوڑ طبقے میں مقبول ہوں لیکن انسانیت دوست
 جو صورت پسند اور ترقی خواہ ان کی حقیقت سے واقف ہو کر ان کے خیالات کا بھانڈا پھوڑ
 چکے ہیں۔ ایسے لوگ بے حلقی کے پس پورا رصحت پر غور کرتے ہیں۔ اگر یہ لوگ کسی
 شخص سے غیر جانبدار رہنے سے جانتے تو ان کے ظلموں میں سے یہ دیکھ میں کہ ہوتی لیکن ان کی
 غیر جانبداری مظلوموں کے لیے ہے یا ان کے لیے نہیں۔ جیسی اصلاحی قدریں کے لیے ہے
 خلاقی اور لاشی کے لیے نہیں۔

"میں کیوں لکھتا ہوں" یہ سوال کسی نہ کسی منظر پر کسی نہ کسی سلسلہ میں ہر ادیب کے
 دماغ میں پیدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بریخت و فیوکی طرح اور لوگ بھی اس سوال کا جواب
 دینے کے بجائے ادھر ادھر کی باتیں کر سکتے ہیں لیکن جو واقعی جواب دینا چاہتے ہیں ان کے
 جواب بھی ایک نہیں ہو سکتے اس سوال کا جواب دینے کے معنی ہیں اپنی پوری شخصیت اور
 شعور کو تنقید کے لیے پیش کرنا، اپنے رجحانات اور پسند و نا پسند کے 'اختیاتی قصور' ان کی
 اور جمالیاتی فنکاروں کو سامنے لانا، اپنی خواہشوں خواہوں اور تمناؤں کو بے ثواب کرنا۔ دنیا
 کے مختلف ملک سماجی ارتقا کی مختلف سطحوں میں ہیں۔ ہر جگہ زندگی کے مطالبات یکساں
 نہیں ہو سکتے۔ غلام ملکوں کا ادب وہ نہیں ہوگا جو خلاقی سے چھکارا پانے کی جہد کرتے

ہوئے ٹکڑوں کا۔ اشتراکی ٹکڑوں میں فنی اور ادبی حرکات سرمایہ دار ٹکڑوں کے مقابلہ میں بالکل مختلف ہوں گے میر جبقاتی سانچ میں وہ مسائل نہ ہونگے جو ایک طبقاتی سانچ میں پائے جاتے ہیں۔ خود مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے ادیبوں کے ذہن ایک ہی ملک میں مختلف تصورات اُمکی رکھتے ہوں گے۔ مادی اور سماجی لحظات ادبی کلیات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اب یہ بات کسی نہ کسی شکل میں لڑاؤ، تروک، لڑنے لگے ہیں کیونکہ دنیا اور دنیا کا ذہن ان لوگوں کے سامنے بدل رہا ہے اس لیے رجعت پسند، سرخ پرست یا صیت پسند ادیب لاکھ کسوں کے انسانی، عقلی مادی حالت سے غوراء اور آزار ہے۔ یہ قبول کرنے کی بات میں ہے۔ دنیا کا ادب اور اس کی تاریخ اس دعوے کی تکذیب ہیں۔ ادیب یہ صورت حال کو تو ہر ادیب اپنے اپنے کونٹریں سکا ہے کہ وہ کیوں لکھتا ہے؟ کس مقصد کی ترویج اور کس عقیدے کے اظہار کے لیے لکھتا ہے؟ کن لوگوں تک اپنے خیال پہنچانے کے لیے لکھتا ہے؟ کسی ادیب کا یہ کہنا کہ وہ صرف اپنے لیے لکھتا ہے بھوت بولتا ہے۔ اور اگر یہ بات صحیح ہے تو صرف اسی حد تک کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے، اسے آسودگی ملتی ہے، شہرت حاصل ہوتی ہے اور پیسے ہاتھ آتے ہیں۔

وہ ادیب جو حرام کے لیے لکھنے کا دئی ہے، محض کہ دسپے سے حوام کا ادیب نہیں بن جاتا۔ جب تک اس کا شعور حوام اور ملت کش طبقے کے شعور سے ہم آہنگ نہیں ہو جاتا۔ رعوں کے باوجود محض ذہنی اور دلی سے وہ ملت کش طبقے کا ترجمان، ادیب نہیں بن سکتا۔ محض طبقے کے ادیبوں کے شعور میں تضاد پلوں کا موجود ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے لیکن اگر وہ چری توجہ سے اس تضاد کو دور کرنا چاہیں تو ایسا کرنا ناممکن نہ ہوگا۔ یہ شعوری طور پر زندگی کے نکتے کی بات ہے۔ قدروں کو اپنانے اور پارے فنی شعور کے ساتھ اظہار کی ساری قوت اور لطافت کے ساتھ اسے پیش کرنے کی بات ہے۔ اس طرح ہر ادیب اس سوال کا جواب اپنے شعور کے مطابق دے گا اور اگر وہ دنیا کو امن، آسودگی اور حسن سے بالامان دیکھنا چاہتا ہے تو اس کا جواب یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے لیے لکھتا ہے یا ان کے لیے لکھتا ہے جو ان قدروں کے دشمن ہیں نئی پسند اور انسان دوست بننے کے لیے ملا ان طاقتوں کا ساتھ دیتا ہے گا جو ان قدروں کو حاصل کرنے یا انہیں برقرار رکھنے کی جدوجہد میں مشغول ہیں۔ اس سوال کا بھی ایک جواب ہے جو ایک اچھا ادیب دے سکتا ہے۔

یہاں پہنچ کر مجھے اپنے اور اپنی خبروں کا خیال آتا ہے کہ میں کیوں لکھتا ہوں؟ کس کے لیے لکھتا ہوں اور کیا لکھتا ہوں؟ شاید کبھی قصص سے اپنے حلقہ کے سامنے آئے تو ان مسائل کے سب سے پہلے اور بحث آئیں گے اس وقت محل اشارے ہی کیے جاسکتے ہیں اور وہ اشارے بھی وہی کی طرفوں میں موعود ہیں۔ میں اس سے بہتر نہیں ہوں کہ جہاں تک کہیں گے فن 'ضہرت' انداز بیان اور 'مضحک' نظر کا خلق ہے نہ صرف تخلیق اور تنقید کی مہمات کے اعتبار میں فرق ہونا ہے بلکہ طرز تخلیق ادب کے اندر شاعر، استاد، ناول نویس اور ڈرامہ نگاروں میں فرق ہو جاتا ہے کیوں کہ اپنی اور اپنے ہاں کی زندگی اور اس کے مسائل ہر جگہ مختلف شکل اختیار کرتے ہیں لیکن میں یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ اس طرح زندگی کے حلقہ مدیہ بھی بدل جاتا ہے قدموں کے حلقہ نظر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ حقیقت کی ماہیت بھی تغیر پر ہو جاتی ہے۔ بیٹا ایک قریب گو مسائل کی زندگی کو اس طرح پیش نہیں کرتا جس طرح ایک نظم نگار یا ڈرامہ نگار ایک شاعر اور ناول نویس کے طریق کار میں امت فرق ہوتا ہے لیکن اس سے زندگی کی حقیقت نہیں بدلتی ہے نہ خیالات کا اظہار ہر بار کرتا ہے نہیں اور اس میں دیرینہ غیر ضروری مضمون ہوتا ہے بلکہ کبھی کبھی بعض مضامین کی جائزہ خاص خود سے توجہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں مثلاً "روایت اور رسالت" میں "اہل تنقید" اور "نثر و حقیقت" ادب اور سوانح میں "اصول تنقید" اور تنقید اور عملی تنقید میں "اسی" مضمون۔ اس کے ساتھ ہی نے اپنی کتابوں کے دیاچوں میں بھی اپنے نقطہ نظر کی وضاحت ہی نہیں کی ہے نہ حقیقی اور تنقیدی ادب کے تعلق پر بھی لگاؤ نہیں ہے۔ انہیں باتوں کو یہاں ہمارے لکھوں پر بھی سوچا ہوں کہ اگر وہ بیگانہ مضامین ہرے خیرات اور مرزے لکھ کر رکات نہیں کہتے تو اس جگہ چند سطریں کس طرح میرے نقطہ نظر کا آئینہ بن سکتیں گی؟ تاہم شاید جو اعتراضات مجھے خود بعض باتوں کے لکھنے میں آئے وہی اس لیے لکھتا ہوں۔

میں نے پہلے شاعری کی دہائی پہنچا۔ شاعر نے شعر پر "میں" اپنی زندگی کا جہاز اور اگر اس سے قسماً نہ ہوئی تو کچھ شعر کہے بھی اس سب میں اکثر بیشتر اپنی ذات ہی کے گرد جاسمین سکا۔ زبان تراشعہ اور قصوں کی حیثیت سوانحی ہے لیکن میں نے اپنے تجربات کو وراثتی زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ میں اور میرے دوستوں کو بھی شیک کر

سکر 'پھر انسانے تھے وہ جیسے بھی ہیں میرے خیال ناقص میں زندگی کے بہت اہم مسائل کے ترمیم ہیں۔ بات 'نہیں' اور 'تم' میں ہے لیکن یہ میں اور تم سماجی حقائق کے ساتھ ہے۔ یہ تو نہیں کہتا کہ میرے 'انسانوں کا مجموعہ' نے بھی وہ لکھے 'لیکن یہ ضرور عرض کر دے گا کہ اس کا وہ چہرہ رکھتا ہے تاکہ میری طرف سے اس سوال کا جواب ہو جائے کہ میں نے انسانے کیوں لکھے 'اور آپ میں زیادہ تر تنقیدی مضامین لکھتا ہوں۔ ان کا مقصد بھی ان حقائق سے بحث ہے جو زندگی کی قیروں تکلیل کرتے ہیں۔ کبھی بد سہول کی قیروں تکلیل سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں آتی ہے لیکن یہ درست اور اسی اور اس کے مسئلوں سے بھی قیور اور تکلیف کے اصول سے الگ ہے۔ 'ہاں' ہے 'بہن' ان حقائق سے حصول نے ان اصولوں کی تکلیف کی لیکن ہر جگہ میں خیال کو بڑھ کر نظر رکھا جاتا ہے کہ ہر نفاذ کے احساس اور ادراک حقیقت کے طریقے مختلف ہو سکتے ہیں لیکن 'نہیں' اور 'نہیں' میں ہونا چاہئے کہ حقیقت کی صورت صحیح اور جاسکے یہ ان بنیادی طور پر میں اور حقیقت کو سامنے رکھتا ہوں کہ ہر ادراک اور شاعر کی کہنا چاہتا ہے 'بد سہول تک' بڑی بات چھوٹا چاہتا ہے 'اس لیے وہ کوئی ایسا صرف کار اختیار کرتا ہے جو اس کے خیالات کو ترسیل میں معاون ہو اور چاہے کوئی ایسا نہ ہو۔ بدی طور پر کوئی مقصد رکھتا ہو نہ رکھتا ہو۔

ایک قادر القلم فنکار، تحریر کوئی نہ کوئی حقیقت سامنے مقصد رکھتی ہے۔ یہ حقیقت "میں اور تک حقیقت کے" اصولوں کو چیل کر رکھتے ہوئے (جو متعدد علوم کی حد سے بڑھتے ہیں) اور 'جنتو کرنا' ہو کہ کسی قیصریت کے تحت واضح کر سکیں خود سمجھ اور سہول کو سمجھ سکیں کہ بلا بداعیہ سے نکلے ہیں 'ان' سلسلہ میں کس طرح قائم رہ سکتا ہے اور کس حد تک۔ لفظ یا جملہ ہے وہ پھر یہ کہ کوئی ایک ایک ادبی دعات میں رہے۔ یہ بات قول اور بین الاقوامی دلوں میں ہوتی ہے 'کون' سے مراد رکھتی ہے۔ ادب کے نئی دور میں کوئی حاصر کا تجربہ اور زندگی کے ارتقاء اور تبدیلی کی ارمی بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کیوں کہ یہ پہلا ادب کی اثر پذیر میں صادر کر کے مصنف اور قاری کے رشتہ کو مضبوط کرتے ہیں میں انہیں مسائل کو جانچنے پکڑنے اور 'میں' کرے کہ لے لکھتا ہوں اور لکھتا ہوں کہ اس سے دوسرے میں قائم اٹھائے ہیں۔ میں یہ علم نہیں دتا کہ یہ لکھو یہ نہ لکھو' لیکن اسے اپنا حق سمجھتا ہوں کہ کسی حکم کوئی چیز کے حلقہ یہ ہر سکون کہ اس میں کہ

ہماری اور وہ کیا ہیں؟ کس طرح لکھا جاتا ہے؟ وہ سہولتے کس طرح لکھا؟ اس کی پشتہ کی
 سر کیا جود ہو سکتے ہیں اور زندگی کی کس قسم کی قدریں کو ایسی چیزوں سے قائم بنیے گا اور
 سے نقصان۔ یہ سارا عمل بہت پیچیدہ ہوتا ہے اس لیے میں اس ذمہ داری کے احساس کے
 ساتھ لکھا ہوں جس کی مدد میں ایک ایسے ادیب اور انسان سے کرنا ہوں۔ میرے خیال
 میں ایسے شاعر اور نقاد تھا کہ ان کی ایک ہی دنیا میں جلتے ہیں اور ان میں اتنا فرق نہیں ہو
 جتنا ظاہر کیا جاتا ہے اور ان کا شعور شعور اور اختصار کا ضمیر ہر ایک ذرا ان کے ساتھ

بہرِ مسدود باعثِ ظہان بن گئے
 وہ لفظ کھوسے مری پہان بن گئے
 تنویرِ سپورا

ہندو کے ساتھ

لفظ
 کونہ

اردو اور پنجابی شاعری
 پبلشنگ کونسل آف پاکستان سے الحام یافتہ

کنزہارا بکس

پوسٹ بکس نمبر ۳۵ راولپنڈی

علی گڑھ تحریک کے اسری پہلو

انیسویں صدی کا ہندوستان، اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کے لحاظ سے سترہویں اور
 اٹھارویں صدی کا زائید تھا۔ لیکن ہرنانی فلسفہ کی طرح نہ تو خاص اور شاکی نہ خط مستقیم
 کی طرح سیدھا 'ردائش' کی سخت جانی 'تدعی' اثرات کے خفاۃ 'معاشرتی' تھیاب اور سیاہی
 حالات نے ایسے عجیبہ 'مرکب' اور متضاد عناصر پیدا کر دیے تھے کہ قصورات اور اقتدار،
 بے سہ ملنے بن گئے تھے جو روال پر معاشرتی حدوں کے اندر اپنے اپنے پارہی رکھتے تھے۔ یہ
 ر چل اور اضطراب، بننے اور بگڑنے کی یہ جدوجہد اور ٹکٹل نہ بے منزل تھی اور نہ افکار
 کہ جس کے اندر سرے اور پیرا ہو۔ یہ کارب تھا کسی سہیپے میں ڈال جانے کی بے چارہ
 تھی۔ بگڑنے کا خوف اور غم اور بچانے کا احساس اور دہول تھا اور یہ سب کچھ صدیوں کے
 کچلے ہوئے اور لوں وں طوایف 'شرقی و مغربی' کے تضاد سے پیدا ہوئے وہ تاریکی
 تانوں کا نتیجہ تھا۔ اس حرکت اور لہو کی لہو کی ایک قفل و تحریک تھی جو "علی گڑھ تحریک"
 کے نام سے سہرم کی جاتی ہے یہ تحریک ہندوستان کے اس عام دور پیرا کی کا ایک جز
 جس جسے کسی بھی لحاظ سے لکھا جاتا ہے مالا کہ حقیقت یہ ہے کہ اپنی ہمہ گیری و سہ
 شعوری اثرات اور مضامینات کے لحاظ سے یہ بے حد تقریباً ہندوستان کی کسی اور تحریک سے
 مماثلت نہیں رکھتا تھا بلکہ اگر کہہ سکیں "تحتیاد اریس" تھا جسے عام متکا میں "دور جدید"

کہتے ہیں۔

اگر ہم ملی گزشتہ تحریک کو ایک نئی تحریک کا جز قرار دیتے ہیں تو منطقی زبان میں ممکنہ کرنے کے لیے ہمیں کل کی خصوصیات کو پیش نظر رکھنا ہو گا تاکہ تحریک کے ہر پہلو پر نگاہ پائے اور حرکات کے سرچشموں کا پتہ مل سکے۔ مگرانی تشدد ہرے دیکھا جائے تو اس دور بنیادری اور تہذیبی تحریک کی بنیادوں کا مطالعہ ہندوستان کی سیاسی، مذہبی، نفسیاتی، تعلیمی، سماجی، سماجی اور نفسیاتی تاریخ کے تمام پہلوؤں کے مطالعہ پر مادی ہے۔ اسی لیے اس کی اپنی اہمیت حاصل ہے۔ اس مختصر سے مقالے میں ملی گزشتہ تحریک کی تاریخ، اس کی وسعت یا اس کے اثرات، ابجد سے بحث نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کے وجود میں آنے اور عہد جدید کے دور امتین میں ایک انقلاب خیز اور عہد آفریں قوت بن جانے کا تجربہ ہے۔ تجربہ خیالوں کا بھی ہوتا ہے اور مادی حقائق کا بھی لیکن اولیت مادی حقائق کو ہی حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ خیال کے دائرہ عمل کے لیے زمان و مکان کے حدود لازمی ہیں۔ انسانی حدود کے اندر رہنے انہیں چھو لینے یا ان سے باہر نکلنے میں خیال، خیال بنتا ہے۔ اس لیے پہلے حقائق کی مادی بنیادوں کو سمجھنا چاہئے تاکہ وہ تصورات بھی سمجھ میں آسکیں جو ان کا عکس ہیں۔ اس طرح جو خیالات وجود میں آتے ہیں وہ مادی حقائق کو بدلنے یا بہتر بنانے میں معاون ہوتے ہیں لیکن ان سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔

جہاں تک مادی حقائق کا تعلق ہے انہیں گرفت میں لانا بھی بہت آسان نہیں ہے کیونکہ مسلسل حرکت ان کو بدلتی اور دوسرے حقائق سے ان کے رشتے میں تبدیلی پیدا کرتی رہتی ہے۔ کوئی شخص جو تھیر لائے والے تمام اہم عناصر، نگاہ نہیں رکھتا اور ان عناصر کے حلق اور مثبت رشتوں کو سمجھنے میں ایک موضوعی تشدد نظر اختیار نہیں کرتا وہ حقائق کی صحیح ترتیب نہیں کر سکتا۔ واقعات کے - کے پڑھنے میں رشتوں کی ترتیب بدلتی ہے، بعض عناصر کی لمبی ہو جاتی ہے، بعض نئے عناصر داخل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح حقیقت اپنے مادی مفہوم میں جی ہو جاتی ہے اور خیالوں کے لیے نیا مواد فراہم کرتی ہے۔

ملی گزشتہ تحریک کو سمجھنے کے لیے اس مختصر تھیر کی ضرورت تھی کیونکہ ہر تحریک ایک مسلسل تہذیبی عمل کی حیثیت رکھتی ہے جس میں قدموں کی آواز لگتی ہوتی ہے اور نتائج کے لحاظ سے اس کی قدر و قیمت کا تعین ہوتا ہے۔ سب سے پہلی چیز جس نے نئے حالات کی

حرف رہنمائی کی وہ تاریخی واقعات کی وہ ترتیب ہے جو اٹھارویں اور انیسویں صدی کے
 ہندوستان میں رونما ہوئی اور جو خود گزری ہوئی صدیوں کا شمار اپنے دور میں رکھتی تھی۔
 ٹھکرا اس کی شکل یہ تھی کہ ہندوستان میں صدیوں سے مسلمان بادشاہوں کی حکومت قائم
 تھی جو ایک منہدم میں تو ظہور اسلامی حکومت کی جاکتی تھی لیکن وہ حقیقت وہ دنیا کی ہر اس
 حکومت سے ملتی جلتی تھی جس کا مرکز بادشاہ کی اتا ہوتی ہے۔ جس میں کسی نہ کسی شکل کی
 جاگیرداری، جاگیرگزار یا ایسا ہی نظام حاصل رہا ہوگا۔

سولہویں صدی میں مغل حکومت کے قیام سے لے کر اٹھارویں صدی میں نادر شاہ کے
 حملے تک یعنی دو صدیوں سے نواح تک ہندوستان جہتی مداخلت سے محفوظ رہا۔ مگر انہوں نے
 انتشار بھی شہسوار ہوا اور جہتی حملے بھی جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ مرکزی حکومت کمزور ہو
 رہی ہے اور وہ قوی عناصر مختلف شکلوں میں ابھر رہے تھے جنہیں دے دے رہا پڑتا تھا یا
 مختلف اراک سے جسوں نے کسی علاقے میں اپنی معاشی تنظیم کر لی تھی۔ اگرچہ بعض صورتیں
 نے اسے مسلمان حکومت کے خلاف ہندو قوم کی پیدائش کا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس
 کی نوعیت یہ نہیں تھی۔ انفرادی طور پر یہ خیالات کچھ لوگوں کے یہاں پائے جاتے رہے
 ہوں تو اور بات ہے "قوی سطح پر ان کی حیثیت فرقہ وارانہ یا مذہبی نہیں تھی۔ انہوں نے مختلف
 نے یہ شکل بعد میں اختیار کی۔ خالص تاریخی نقطہ نظر سے اٹھارویں صدی کے ختم ہوتے
 ہوتے مسیحی طاقت نے سب سے زیادہ اہمیت اختیار کر لی تھی وہ انگریز تھے۔ جو ہندوستانی
 زندگی پر چھانے جا رہے تھے۔ اہمیت کا مرکز قتل اب مغل حکومت نہیں تھی نہ بنگال نہ
 اردھ نہ مرہٹے نہ غلام نہ بیہار نہ سکھ اور نہ کوئی اور۔ اب سیاسی اہمیت سے اہمیت
 انڈیا کبھی حقیقی طاقت رکھتی تھی انیسویں صدی کے اولیٰ نصف حصے میں ہی ہی تاریخی
 تبدیلیاں نہیں ہوئیں لیکن آہستہ آہستہ ساری قوت انگریزی کبھی کے ہاتھوں میں منتقل ہو گئی۔
 اس قوت کا سرچشمہ اگر صرف انڈیائی لڑائیوں اور ان میں فتوحات کو قرار دیا جائے تو یہ
 جہتی لٹل ہوگی کیونکہ اس طرح کی لڑائیاں اور خانہ جنگیاں پہلے بھی تو ہوتی رہتی تھیں لیکن
 ان سے ہندوستان کا معاشی نظام اس طرح نہیں بدلتا تھا کہ قوانین قوت میں اس کی وجہ سے
 فرق آجائے۔ اہمیت انڈیا کبھی کا عمل دخل ہندوستان کی معاشی اور اقتصادی زندگی میں
 بالکل نئی نوعیت رکھتا تھا۔ اس وقت اس سے بحث نہیں کہ انگلستان کا اقتصادی نظام کیا

تھا۔ ہندوستان کے نقطہ نظر سے جاگیردارانہ نظام لوٹ پھوٹ رہا تھا۔ وہی معیشت جو صدیوں سے ہر انقلاب کے ریلے کو ہدایت کرتی تھی، خنجر ہو رہی تھی۔ تھوڑی بہت دشکاری اور منافی جو کسی بڑے صنعتی سانچے میں نہیں داخل ہوتی تھی، ختم ہو رہی تھی اور ہندوستان کچے مال کی منڈی میں تبدیل ہو رہا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارتی سرمایہ داری سے شروع کیا تھا اور دوسری بیرونی سرمایہ دار کہیں سے مقابلہ کر کے ہندوستان میں برطانوی انتظام کی بحال کی تھی۔ خود برطانیہ کا صنعتی انقلاب کس حد تک ہندوستان کی دولت اور خام پیہ دار کا مہیون صفت تھا اور کس حد تک وہاں کی رہنمائی اور اقدام کا نتیجہ تھا۔ یہ بھی برطانیہ کی سماجی تاریخ کا ایک اہم مسئلہ تھا۔ لیکن جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اس صنعتی انقلاب نے ہندوستان کی صنعت کو ختم کر کے اس کی ترقی کی فطری رہنمائی کو بھی روک دیا۔ یہاں کے بادشاہوں، نوابوں، امیروں اور حاکموں کا یہ حال تھا کہ وہ ذوال کے دہل میں پھنسے ہوئے ہونے کی وجہ سے نہ صرف میدان جنگ میں شکست کھا رہے تھے بلکہ اقتصادی لحاظ پر بھی ہار پر ہار مارتے جا رہے تھے۔ زر مٹھی کی یہ داستان بڑی طویل ہے۔ اس کی تاریخ یوں کن اسٹوری بھی نہیں ہے۔ صرف ان نتائج پر نظر ڈالا ہے جو یہاں کے معاشی اور اسی کے اندر جو کر تدریجی ارتقاء پر اثر انداز ہوئے۔

ایسٹ انڈیا کا عد معاشی استحصال کے نقطہ نظر سے دیا کی تاریخ میں کوئی دوسری مثال نہیں رکھتا۔ اگر اس نے مکمل طور پر جاگیرداری اور زمینداری کے نظام کو ختم کر دیا ہوتا تو ہندوستان ترقی کی راہ میں کئی قدم آگے بڑھ گیا ہوتا، لیکن ایسا کرنے کے بجائے اس نے اس کو ایک نئے سانچے میں ڈھال کر برقرار رکھا تاکہ اس کے ذریعہ سے بھی استحصال ہوتا رہے۔ کاشت کاری جس سے ملک کا ایک بڑا حصہ وابستہ تھا، تباہ ہو گئی کیونکہ ایک طرف تو محاصل کا بوجھ غیر معمولی طور پر بڑھ گیا۔ دوسری طرف اس کی دھوڑ پالی میں فوجوں نے وہ مظالم اور بے اعتدالیاں کیں جن کی کوئی مثال نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زمینوں کی درختی ختم ہو گئی اور پھر نظام حرفت اور کاشت کاری وجود میں نہیں آ سکی۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد تک یہ سلسلہ جاری رہا اور زمینداری اس لیے برقرار رکھی گئی کہ رعایا اس کا ایک گروہ ہر وقت مدد کے لیے موجود رہے۔

کاشت کاری کی اس آخری کے ساتھ صنعتوں کی آخری بھی ہوئی۔ گویا ہندوستان اس

حالت میں پہنچ گیا جہاں پچی اور انگاس کی ساری صورتیں بھینک لیں۔ اس میں سرور اور ہر گھسی۔ یہ معاشیات کے طالب علموں کے لیے ایک بحث طلب مسئلہ ہو سکتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے استحصال سے پہلے ہندوستان میں جو صنعتی ترقی ہوئی تھی وہ صنعتی دور کی صنعتی ترقی سے کس قدر مختلف تھی۔ یا یہ کہ اگر ہندوستان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو کیا اس میں صنعتی ترقی کی حیل اپنے فطری ارتقاء کے نتیجے کے طور پر آجاتی؟ لیکن یہاں یہ بحث نہیں ہے۔ تو کتنا صرف اتفاق ہے کہ یہاں کی صنعت جس حیل میں بھی پہنچ رہی تھی اور اس کی جگہ بہت دلوں تک صنعتی صنعت نے لے لی۔ نتیجہ وہی ہوا کہ ہندوستان کی ترقی برطانوی سرمایہ داری کی ترقی کے لیے مدد دی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح کچھ سہ سہا کار میں گئے اور معمولی طور پر سرمایہ داری یہاں بھی شہر ہوئی۔ یہ سرمایہ داری اپنی ابتدائی منطقی میں برطانوی سرمایہ داری سے ٹکر لینے یا مقابلہ کرنے کے بجائے اس کی نگاہ کرم کے سایہ میں چھپ رہی تھی۔ یہ سرمایہ داری قومی دولت میں اضافہ کرنے کے بجائے انگریزوں کی انجمن بن کر معمولی منافع پر خوش تھی اور انگریزوں کے غلے پوتے پر خود اپنے ایمانے وطن کو لوٹنے اور لٹوانے کا جرم مکمل ہندوں کر رہی تھی۔

اس طرح لوٹنے کے ساتھ ساتھ انگریز طاقتور اپنی ذاتی تجارت بھی کرتے تھے یا ہندوستانی جاگیرداروں، نوابوں اور راجاؤں کے چلنے والے بن جاتے تھے اور عوام اور جاگیرداروں کے درمیان واسطہ بن کر غیر معمولی ہٹ کھوٹ کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ کبھی کے بچاس ساٹھ روپیہ کے ٹاؤن جب چار سال کے بعد انگلستان واپس جاتے تھے تو وہاں لاکھوں کی جائیداد فرماتے اور ایک نواب کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ کبھی کی یہ انجمن اور انگریز طاقتور آئندہ واپس کی بے عزتی کرتے، ان کے گھروں میں ٹھس ہاتے اور مارنے پیٹنے کے علاوہ انہیں غریب الٹیں کرتے۔ اس سلسلہ میں بلوے اور غزنویاں بھی ہوتی تھیں لیکن دشواری یہ تھی کہ ہندوستانی ہر انگریزوں کے خلاف مقدمے کی سماعت کر رہی نہیں تھی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ وہی یہاں تک ہندوستانی ہر انگریزوں کی زد میں نہیں آتے تھے۔ اس کے خلاف راجہ رام موہن رائے اور دوسرے لوگوں کے احتجاج کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

حکومت کی توسیع کے ساتھ یہ معاشی اقتدار ہندوستان کے ہر طبقے کو کنزور اور بڑا حال

ہا رہا تھا۔ خواص سے لے کر عوام تک سب مادی حیثیت سے پست اور پہپا ہوتے جا رہے تھے۔ ان حالات میں بھی انہیں اپنا چند مذہبی اور اخلاقی قدروں میں حصہ جس کو وہ عزیز رکھنا چاہتے تھے، دھونڈنا پڑا۔ انہیں کے سارے زہد رہتا چاہتے تھے، لیکن برطانوی اقتدار نے اہستہ آہستہ ان پر بھی ضرب لگائی۔ ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ سولہویں صدی عی سے شروع ہو چکی تھی اور عیسائی کھانے والے پر نکالی، خزانہیں اور انگریزی معنی دے جا رہا تھا اور ان میں کام کر رہے تھے، ملک کے گوشے گوشے میں چمچ کاٹم ہو رہے تھے اور یہاں کی مختلف زبانوں کے ذریعہ مسیحیت کی برتری کا ڈھکا بھایا جا رہا تھا۔ مختلف مشن اپنے اپنے اسکول اور طبی ادارے بھی قائم کر رہے تھے اور انھیں کے بارے میں ہندوستانی مختلف قسم کی مراعات کے لالچ میں رہیں سکتی تھیں کر رہے تھے۔

اس پر طویہ ہوا کہ خود انگریزی حکومت نے اس مذہبی تبلیغ میں مددنا شروع کر دیا۔ انگریز فوجی افسروں نے فوجوں کے اندر عیسائیت کی تبلیغ کی ابتداء کی، اور کئی بادرو کے ملازمین مسیح کے پیارے بن کر مذہبی جماد میں مصروف ہو گئے۔ فوجوں میں عہدوں کی ترقی کا انحصار بہت کچھ مذہب کی تبدیلی پر دیکھا اور یہ تحریریں ایسی نہ تھیں جس کا شمار بہت سے لوگ نہ ہو جاتے ہوں۔ مشن کے پادروں کو عام اجازت تھی کہ وہ دلانا، فوجی چھان بینوں اور دوروں میں جا کر دین مسیح کی خوبیاں بیان کریں اور تبدیلی مذہب پر دینی اور دنیوی فلاح کی بشارت دیں۔

یہ تو ایک مشہور حقیقت ہے کہ ابتداء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستانوں کی تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، حالانکہ مشن اسکولوں کا جال بچہ رہا تھا لیکن انیسویں صدی کی ابتداء ہوئی تو انگریزی حکام انگریزی تعلیم کی طرف توجہ دے گئے اس سلسلے میں وہ اہم مجلس اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ایک تو یہ تھی کہ انگریزی تعلیم دی جائے نہ دی جائے۔ دوسری بحث تھی مذہبی تعلیم کے بارے میں۔ اب تک جو کالج مشن علوم کے لیے جاری تھے ان میں انگریزی کے درجے پڑھا دیتے تھے، لیکن انگریزی تعلیم کو پوری طرح جاری کرنے کے حصول بحث و مباحثے جاری رہے۔ سرکاری اسکولوں میں براہ راست مذہبی تعلیم کے حصول البتہ کمپنی کے ڈائریکٹروں نے اجازت نہیں دی، لیکن اس کا اصل جب یہ تھا کہ وہ ہندوستانوں کو اپنے برابر نہیں دیکھتے رہتا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر لڑکا ہندوستانی عیسائی ہو گئے تو

ہندوستان میں انگریزوں کی برتری کا خاتمہ ہو جائے گا اور ہندوستان کا وہی مشرب ہوگا جو امریکہ کا ہوا۔ یعنی ہندوستان پر جاگتہ قبضہ رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ کہنی کے ڈاکٹروں کا یہ خوف ایک قیاسی تھا۔ اس سے بحث نہیں۔ لیکن ہر ایہ کہ براہ راست مذہبی تعلیم دینے کے بجائے انگریزی ماہرین تعلیم نے انگریزی علم و ادب کے ذریعہ اس کی کو پر کرنا چاہا۔ اس کی تعلیمات پیشکشوں کتابوں میں مل جائیگی۔ لیکن اس سلسلہ کا انتخاب انگیز اقدام وہ خاص کی تھیں لارڈ مکالے کے ہاتھوں ہوئی۔ انگریزی زبان میں تعلیم دینے والے کے متعلق مکالے نے اپنی مشہور رپورٹ میں لکھا کہ:

”میں ایک ایسی جماعت مانی جاسیے جو ہم میں اور ہماری کھیلوں و عباد کے درمیان حرجم ہو اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستان ہو مگر مذاق اور رائے القاد اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔“

یہ القاد غیر مسلم ہیں لیکن مکالے کے دل میں جو کچھ تھا وہ رپورٹ میں نہیں بلکہ اس خط میں تھا جو اس نے اپنے باپ کو لکھا اور جس میں یہ القاد ملتے ہیں:

”اس تعلیم کا اثر سب سے زیادہ ہندوؤں پر ہے۔ کوئی ہندو جو انگریزی دال ہے کبھی اپنے مذہب پر صداقت کے ساتھ قائم نہیں رہتا۔ بعض لوگ مصلحت کے طور پر ہندو رہتے ہیں مگر بہت سے زیادہ سودہ ہو جاتے ہیں یا مذہب عیسوی اختیار کر لیتے ہیں۔ میرا مذہب عقیدہ ہے کہ اگر تعلیم کے حلقے ہماری تجربہ پر عمل درآمد ہوا تو تیس سال کے بعد بنگال میں ایک بہت پرست بھی پائی نہ رہے گا۔“

اس کا لاری نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں میں دونوں نے تلف شکوں میں اس کے خلاف احتجاج کیا کیونکہ بہت بہت ہے۔ کہ سرکاری ملازمتوں میں انگریزی جاننے والوں کو ترجیح دی جائے گی۔ قدیم مشرقی طور اس سے سنی اور بے سہ ہوتے جا رہے تھے اور ان کی طرف سے بے انتہائی بوجھ رہی تھی۔ دوسری طرف نئے علوم اور انگریزی تعلیم مذہب اور اخلاق کے لیے خطرہ بننے جا رہے تھے۔ مختصر یہ ہے کہ نئی تعلیم نے ماہی اور ردعالی راہی میں شدید متکثر پیدا کر دی تھی۔ سارے ماہی و سر کی پھین لینے کے بعد ہندوستانیوں سے ان کا مذہب پھینا جا رہا تھا۔ ”وٹا“ ”فول“۔ یہ احکام بھی فحشوں میں نافذ ہوتے تھے کہ فحش کے پاس مانتے پر کوئی نشان نہ لگائیں ’رازمیاں منڈائیں اور کالوں میں کچھ نہ پھینیں۔“

اس کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی تانہیں بھی جو تھیں۔ اس تعلیم سے بہت سے انگریزی حکام اور ماہرین تعلیم کی یہ امیدیں وابستہ تھیں کہ اس سے تمام ہندوستانیوں میں سبکی اخلاق اور برطانیہ سے وفاداری کا جذبہ پیدا ہوگا۔ ان لوگوں نے یہ نہیں سوچا کہ یہ معاشی اور اقتصادی کلام دھند میں آگیا ہے اس میں یہ جذبات دیرپا نہیں ہو سکتے۔

انگریزوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی تفریق کر کے معاملات کو اور زیادہ پیچیدہ بنا دیا۔ بہت دنوں تک مسلمانوں نے پہلے کلام تعلیم سے قانع نہیں تھا بلکہ ان کے خیال میں وہ ان کی رسومات اور ضروریات کے خلاف تھا۔ انگریزی حکومت میں تعلیم حاصل کرنے اور ملازمتیں اختیار کرنے کا مسئلہ علماء کے برائے ذمہ بٹھا دیا۔ اور جب تک اجتماعی طور پر کوئی تشدد فکروں میں گہر کرے مسلمان تعلیم میں پیچھے ہوتے گئے۔ ان کو ہندو ہی تعلیم ہی تھی وہ بھی اوقات کے خبط ہو جانے کی وجہ سے کم ہوتی گئی۔ یہی نہیں تھا بلکہ یہ مسلمان انگریزی پڑھ بھی لیتے تھے بعض اوقات انہیں صرف اس بنا پر نوکریاں نہیں دی جاتی تھیں کہ وہ مسلمان ہیں۔ یہ صورت حال پہلے بھی تھی لیکن قدر کے بعد تو اس نے ایسی شدت اختیار کر لی کہ ان کی ذہنی دشوار ہو گئی اور بھول ڈاکٹر ہنٹراٹھ کے مسلمانوں نے اس قسم کی عرضداشت پیش کی:

”بہ حیثیت وقادار رعایا حضور مکہ معظمہ میں سرکاری ملازمتیں پانے کا یکساں حق ہے۔ اصل یہ ہے کہ انڈیہ کے مسلمان اس قدر نہیں دینے گئے ہیں کہ اب ان کے ابھرنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی۔ نسل کے اعتبار سے شریف، پیشہ کے اعتبار سے غریب، سرکاری سرپرستی سے محروم، عادی حالت ان پچھلیوں کی مانند ہے جو پانی سے ٹال کر باہر پھینک دی گئی ہوں۔ یہ مسلمانوں کی بدترین حالت ہے جو حضور کے سامنے اس لیے پیش کی جاتی ہے کہ حضور مکہ معظمہ کے قائم مقام ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ بلا لحاظ رنگ و ملت سب قوموں کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا جائے گا۔ سرکاری ملازمتوں کے قانع ہونے کے بعد ہم نفسی اور مالیاتی کے اس درجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ اگر میں روپیہ باہر کی نوکری پر خرچ ہو جائے تو ہم دنیا کے سب سے غار دراز مقامات تک سفر کرنے، ہالیوڈ کی برقی چٹخوں پر چڑھ جانے اور سانپوں کے سندن عذابوں میں جھگٹنے پھرنے کو بھی خوشی سے جہاز ہیں۔“

یہی حال کم و بیش اور علاقوں کا تھا۔ امیدوں اور غریبوں کی حالت تو خراب تھی ہی وہ

متوسط طبقہ بھی مصیبت کا شکار ہو گیا جو نئے حالات میں پیدا ہوا تھا۔ ہندوستان کی کیا حالت تھی اور انگریزی اقتدار نے اس میں کیا تبدیلیاں پیدا کی تھیں؟ اس کا کچھ اعلاہ مندرجہ بالا صفحات کے مطالعہ سے ہوا ہو گا لیکن یہ تصور اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے اور پہلوؤں میں بھی رنگ نہ بھرا جائے۔

انگریزی حکومت کی برکتوں میں جو چیزیں گنتی جاتی ہیں وہ سائنس اور ٹیکنالوجی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ نظریہ ادا کرنے کی چیزیں نہیں ہیں۔ انگریزی عہد ہی میں ہندوستان ریل 'تار' برقی تل اور پریس سے آشنا ہوا۔ ہندوستان ماضی نجوم 'ہندو سر' فنی قیصر دیشیہ میں صدیوں سے ترقی کی غیر معمولی حوصلے کر چکا تھا۔ ذرائع نقل و حمل میں 'ڈاک' اور خبر رسائی میں اپنے طور پر دنیا کے بہت سے ممالک سے آگے تھا، لیکن مشینی ایجادات اور ان سے فوائد حاصل کرنے کے لیے اسے وہ سب کچھ درکار تھا جو نہایت جہاں تک پریس کا تعلق ہے، اگرچہ ہندوستان میں پرنٹنگ نے اس کا استعمال سولہویں صدی ہی سے شروع کر دیا تھا لیکن عام ہندوستانی اس سے بے خبر تھے، برقی تلوی اثر کے مانتے نکلے اور بجلی میں متعدد پریس اشاعتیں صدی میں قائم ہو گئیں۔ لیکن کچھ کی اور سرکاری ضروریات کے بارے میں اس کا اصل استعمال انیسویں صدی کی ابتداء میں شروع ہوا، اور پھر ہندوستانی زندگی پر اس کے اثرات کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح تلوی، برقی تل اور تار برقی جس نے مرزا قاسم تک کی آنکھیں کھولا کر دی تھیں، ہندوستان کے لیے عہد آفرین وسائل ترقی کے جاسکتے ہیں۔ انگریزوں نے ان چیزوں کو اپنی ضروریات کے پیش نظر ہندوستان میں استعمال کرنا چاہا تھا، لیکن ان سے جو فوائد مرتب ہوئے وہ عام تھے۔ بہت اعلاہ کچھ کے دائرہ کار اور بہت سے انگریز حکام جس طرح انگریزی تعلیم کے 'براء' سے خائف تھے کہ ان سے ہندوستانیوں، ذہن پر اوپ کے جذبہ قومیت اور احساس آزادی سے واقف ہو کر انہیں خود چھٹی ممالکوں کے خلاف استعمال کرے گا اسی طرح وہ پریس کے عام ہونے سے بھی خوف زدہ تھے کہ کسی اس کے ذریعہ سے کسی وقت انگریز دشمنی اور وطن پرستی کے جذبات کی اشاعت ہونے کا ہے۔ ہونے لگے۔ کیا حالات اور واقعات کہ وہ پہلو ہیں جو ناگزیر طور پر اپنی ضد بھی اپنے اندر دیکھتے تھے۔

خیر تو ریل 'تار' اور پریس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن چونکہ یہ چیزیں ہمارے

سے لائی گئی تھیں اور ان کے پیچھے وہ سائنٹفک شعور نہیں تھا جو ان کے مابین اور قومیت کو سمجھتا ہے اس لیے عام طور سے ہندوستانیوں کے دہن میں ان کی جگہ پارسی طرح نہ بن سکی۔ سائنس کی تعلیم معمولی طور پر ہو رہی تھی اور کچھ کتابوں کے ترجمے بھی انیسویں صدی کے سائنٹفک ہو چکے تھے۔ لیکن پھر بھی سائنس ابھی شعور کا جز نہیں بنی تھی اور ان ترقی یافتہ ممالک سے عام ہندوستانی کو فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل نہ تھا۔ جس چیز نے فوری طور پر اس شعور کے بننے میں مدد دی وہ پریس تھا کیونکہ انقلاب ۱۸۵۷ء تک پہنچتے پہنچتے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں اہلکارات کافی تعداد میں لکھے گئے تھے اور سیاسی بیداری میں مدد کر رہے تھے۔

جو لوگ سائنسی علوم سے واقف ہیں وہ اسے جانتے ہیں کہ مخصوص قسم کے معاشی نظام میں مخصوص قسم کا شعور وجود میں آتا ہے، مخصوص قسم کے سائنسی فلسفیانہ، ادبی اور تعلیمی ادارے وجود میں آتے ہیں اور تہذیبیاں ہوتی ہیں وہ کمرے معاشی اور تاریخی اسباب کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ جن تاریخی اور معاشی حالات کا جو کہ ہوا وہ کسی خلا میں نہیں ہوئے اس لیے انہوں نے موجود اور روایتی مذہبی اور فلسفیانہ اقدار کے لیے چیلنج کی شکل اختیار کر لی۔ اس کے جواب کی سب سے زیادہ واضح اور موثر صورت تو یہ ہوئی کہ پہلے مذہبی، فلسفیانہ اور سائنسی علوم اور موقف کا خاکہ پیش کیا جائے پھر تاریخی عمل نے جو تغیرات پیدا کیے ہیں ان پر نگاہ ڈالی جائے اور اسباب و محل کا رشتہ تلاش کرنے کے ساتھ ان کی تعبیر اور توضیح بھی کی جائے لیکن یہ طریقہ کا تفصیل کا مطالعہ کرنا ہے جس کی مختصر نہیں ہے لیکن کچھ اشارے ضروری ہیں۔

مختصراً اس دور کی مذہبی صورت حال پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اٹھارویں اور انتہائی انیسویں صدی تک ہندو مذہب میں بھگتی تحریک کے بعد کوئی قابل ذکر تغیر نہیں ہوا تھا۔ بھگتی تحریک کسی قسم کے تصورات کا مجموعہ تھی، وہ برہمنی نظام کے خلاف ایک عوامی رد عمل کی حیثیت بھی رکھتی تھی اور بدھ مت اور اسلام کی متعدد خصوصیات کو جذب کر کے ہندو مت کو ان دونوں نظاموں میں جذب ہوئے سے بچانے کا اہم کار بھی تھی، اور ان سب سے بچہ کر اس کی قومیت ایک سائنسی احتجاج کی تھی جس کا مقصد ایک خاص طرح کی روحانی مساوات قائم کر کے املا اور ادب کے فرق کو مٹانا تھا۔ بھگتی تحریک کی بنیادیں تو ویدانت

فلسفہ پر تھیں، لیکن اس کے انعکاس میں اسلامی تصور و افکار کے واضح اثرات شامل تھے۔ مسلمان بادشاہوں کے عہد میں ہندو مسلم اختلافات نے سیاسی اہمیت کبھی اختیار نہیں کی۔ اس لیے ہندو مذہب اور فکر کو مسلمانوں کے آنے اور ہندوستان میں پھیل جانے کے وقت تصادم کی جو اصل نظر آئی تھی اب اس سے اندیشہ نہ تھا لیکن انیسویں صدی کی بات اور تھی۔ مغربی اثرات کا رد عمل کیسے تشدید حالات کی صورت میں نکلا ہوا انہیں اسے عمل طور پر تسلیم کر لینے کی صورت میں۔ ان کے علاوہ ایک حوالہ اہل اہل بھی تھی جو ہندو مذہب کی ایک کو برقرار رکھتے ہوئے نمودار ہوئی۔ مذہب کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ بنانے، شعور کی مختلف سطحوں پر جو سوالات شکوک کی قسم میں پیدا ہوئے ہیں ان کا جواب دہی منتظر نظر سے دینے کی کوشش ہر عہد میں ہوتی رہی ہے۔ اس لیے نئے حالات میں ہندو مذہب بھی اصلاح کے دور سے گزرا اور چونکہ اس وقت مسیحی تصورات مذہب و اخلاق کا زور تھا اس لیے راجہ رام موہن رائے، رابندر ناتھ ٹیگور اور کیشپ چندر سین کی اصلاحی تحریک میں اس کے متوش نظر آتے ہیں۔ خود ہندوئیں کی یہ حالت ہو رہی تھی کہ سرکاری تعلیمی کمپنی نے اپنی رپورٹ ۱۸۸۶ء میں یہ خیالات پیش کئے ہیں اور جن کا خلاصہ سید محمود نے اپنی تاریخی تعلیم میں دیا ہے:

”زبان انگریزی کی واقعیت میں شوق کے ساتھ اخلاقی اثرات بھی نمایاں ہوئے اور ایسے خاندان اور قابلیت کے بہت سے نوجوانوں میں ہندو مذہب کی بدشعور سے آزاد ہونے کے لیے بے چینی اور اپنے رسوم کی طرف سے بے اعتنائی کا اظہار کیا جا رہا ہے اور قابو دہری نسل میں ملک کے ہندوؤں کے خیالات اور محسوسات میں بڑی مادی تبدیلی ہو جائے گی۔“

یوں مذہبی اصلاح کے لیے زمین تیار تھی اور عام سماجی حالات اس تبدیلی کے معاون تھے۔ نئے شعور کی بنا پر جو تبدیلیاں ہو رہی تھیں ان میں رہنمائی کی ہانگ پیش در مذہبی پیشواؤں کے بجائے دانشوروں کے ہاتھ میں پہنچ رہی تھی۔ یہ بات ابھی جب ہم مسلمانوں کے یہاں مذہبی اصلاح کا ذکر کریں گے تو اور زیادہ واضح ہوگی کہ یکے بعد دیگرے سماج کی کل بدن رہی تھی۔

جوں جوں مسلمانوں کا تعلق ہے دقتاً ”فوقاً“ مذہبی اصلاح کی تحریکیں جنم لیتی رہتی

تھیں۔ ان تحریکوں کو بھی بھیجی تھی یا احیائے دین کہا گیا ہے۔ مسئلوں کے حوالہ دال میں اس کا سب سے اہم منظر علی اللہ ہی تحریک تھی جس نے کئی دور رس کام کئے۔ ایک طرف شاہ ولی اللہ نے یہ چاہا کہ اسلام میں میرا اسلامی عناصر مختلف راستوں سے ہو کر کس طرح داخل ہو گئے ہیں (اس ضمن میں انہوں نے اسلامی حکومت اور مسئلوں کی حکومت کے فرق کو بھی طوطا رکھا) دوسری طرف اجتہاد پر زور دیا۔ یہ اجتہاد مختلف مسئلوں کی تقلید کھس کے خلاف ایک اہم اعلان تھا۔ تیسری طرف انہوں نے اسلامی معاشرہ کی بنیاد پر ایک عمل نظام معاشرت اور معیشت مرتب کرنے کی کوشش کی۔ انہیں چند اہم اور بنیادی صورتوں سے خیالات بھی پیدا ہوئے جو بعد ستانی مسئلوں کی عام زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ محققین شاہ ولی اللہ کو جدید علم الکلام کا بانی سمجھتے ہیں۔ شیخ محمد اکرام نے رود کوثر میں جنت الہیہ کے دریاچہ سے یہ قول نقل کیا ہے:

”مستطویٰ شریعت کے لیے وقت آگیا کہ یہاں اور نیل کے پیراں میں لباس کر کے اسے میدان میں لایا جائے۔“

اور انہیں تقلید کا مخالف قرار دے کر ہندوستان کے علماء میں سب سے اونچی جگہ دی ہے۔ یہ افکار دہریں صدی کا ذکر ہے جب مشرق و مغرب کی مختلف اجتماعی طبع ظاہر نہیں ہوئی تھی لیکن مسئلوں کی مادی اور روحانی زندگی کے حوالہ کی ابتدا کو پہنچ رہی تھی۔ اسلام کو پھر طاقتور بنانے کی کوشش کوئی اہم مادی بنیاد نہیں رکھتی بلکہ یہی جو مشکلات اور تضاد عامر کئے گئے تھے پہلے طور پر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے ان کی وجہ سے مذہبی اور معاشرتی اصلاح کے اس جذبہ کو دائمی عمل باق رہا تھا اگر ہندوستان کی سیاسی حالت فقیر کی رو سے گزر رہی ہوئی تو اس اہم اصلاحی اقدام کی حیثیت بھی شک میں کی رود قلع سے لڑا نہ ہوئی۔ مگر وہ کہ شاہ ولی اللہ کے انتقال کے چھاس سال کے اندر ہی اندر وہ تحریک شروع ہو گئی جسے عام طور سے دہلی تحریک کہا جاتا ہے اس تحریک کا ایک پہلو تو محض سنت رس کا احیاء تھا لیکن دوسرا پہلو جو جارحانہ فعل اختیار کرنے پر مجبور کرتا تھا یہ تھا کہ اس کے لیے مناسب نفاذ پیدا کرنی چاہئے اور اس کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہوں تو انہیں دور کرنے کے لیے جہاد کیا جائے اس سلسلہ میں سب سے اہم نام سید احمد شہید اور سید اسماعیل شہید کے ہیں جنہوں نے عسکوں کے خلاف جہاد کیا۔ اس تحریک کا ایک رخ انگریزوں سے جہاد کی طرف بھی

انحطاطی کیفیت' نئے حالات کا مقابلہ کرنے سے بچے رہنے کی خواہش کو بہت نمایاں کر دیا اور ان کے لیے فیصلہ کن گزری آگئی۔ انہوں نے جو کچھ کہو یا تھا اس کے فوراً واپس لے لے کی کوئی صورت نہ تھی جس اس سے ترک موالات اور علیحدگی بھی ممکن نہ تھی۔ اس کو قبول کرنے اور اس سے بچکارا حاصل کرنے' دونوں صورتوں کے لیے اس کا جانا ضروری تھا۔ انسانی شعور یا اپنے مواقع پر کوئی۔ کوئی پہلو اپنا پیدا کر لیتا ہے کہ وہ بدلنے والے حالات میں اپنی جگہ بنا سکے۔ چنانچہ مذہبی' عقلمندانہ اور اخلاقی نقطہ نظر سے بھی مسلمانوں اور ہندوؤں کو تقبیحات کی بنیادوں کو سمجھنا پڑا۔ جہاں مقابلہ ہو سکتا تھا وہاں مقابلہ کیا گیا' جہاں سمجھوتے سے کام چل سکتا تھا وہاں سمجھوتہ ہوا اور جہاں شکست کے بغیر چارہ نہ تھا وہاں بار بار قبول کر لی گئی۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہو گا کہ اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں سے بہت کچھ نوٹ چکا تھا اور انہیں جو کچھ بھی راہنمائی مل سکتی تھی وہ مغرب سے آئی ہوئی انگریزی سیاست اور انگریزی خیالات کے ذریعہ ہی سے مل سکتی تھی۔ اس کے علاوہ تمام اسلامی ممالک آہستہ آہستہ یورپ کی روشہ دوائیوں کا شکار ہو رہے تھے اور جیسے ہی ضرورت پڑے انگریزوں کا اقتدار قائم ہوا' برطانیہ کا اقتدار سارے مشرقِ بیہ میں پھیل گیا اور ہندوستان پر اس کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ یہ ایک طویل کمانی ہے۔ صرف یہ بات واضح کرنے کے لیے اس کا ذکر ہوا کہ ہندوستانی مسلمان اپنے ہی ذرائع سے اپنا مستقبل سوچ سکتے تھے اور جو طاقت انہیں اپنے چنگے میں دوائے ہوئے تھی اس کے حوصلے اور ذرائع بہت وسیع تھے۔ انگریزوں نے اہماء معاشی اور سیاسی اقتدار سے کی تھی اور اب آثار اس کے تھے کہ ہندوستان' مذہبی' اخلاقی اور تہذیبی حیثیت سے بھی بالکل غلام ہو جائے گا۔ اس مسئلہ پر ملی گزہ تحریک نے ایک صمیمی اہل اختیار کی جو درحقیقت اس اور بیداری کا جزو تھی جس کی اہماء ہو چکی تھی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ تحریک کن حیلوں سے بنیادی طور پر ایک ایسی تحریک تھی جس نے ہندوستان اور خاص کر مسلمانوں کی سیاسی' معاشی' مذہبی اور ادبی زندگی کو حاد کیا۔ تقریبات کا جو پس منظر اوپر دیا گیا اس سے اندازہ ہو گا کہ مقررہ اقتصادی نظام ایک متحرک نظام میں بدلا تھا۔ دولت اب محض جاگیردار زمیندار سامان آرائش کا نام نہیں تھا بلکہ نئے طبقات کے ہاتھ میں پہنچ کر یہ نئی شکل اختیار کر رہی تھی اور نئے مسائل اس سے پیدا

تھا اور ہندوستان کے دارالحرب یا دارالسلام ہونے کی گنجی بحث سے اس کا کمر نکل گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ بنگال کی اس گوانٹھی تحریک کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے جو نہایت اصلاح کے بغیر میں ایک عوامی زور کی تحریک تھی جس کا مقصد مساوات، غریبوں سے امدادی اور زمین دلوں کی مخالفت تھا۔ یہاں ان کی تعلیمات میں جانے کے بجائے محض یہ یاد دلانا ہے کہ مسلمانوں کے اندر عام ہے پٹنی اور بدلت پٹنی ہوئی تھی اور اس اہم انقلابی جدوجہد کے لیے لٹا ہوا ہوری جی ۱۸۵۵ء میں دونا ہوئی۔

اس وقت تک جو نہ ہی اور گھنٹہ۔ تصورات دعو میں آئے تھے وہ مشرق و مغرب کے تصادم کا نتیجہ نہیں کے جاسکتے۔ نکلوتی سلسلہ یہ محض شروع ہو چکی تھی لیکن اس کا مقابلہ کرنے میں ان علوم سے کام نہیں لیا گیا تھا جو جدید سائنس اور جدید استدلالی فلسفہ کے ساتھ آئے تھے۔ سائنس سے انفرادی طور پر دلچسپی کا پتہ دہلی کانگریس میں تعلیم پانے والوں کے ہاں، اور وہ کے شاہ غازی الدین حیدر اور شاہ نصیر الدین حیدر کے ہاں و حیدر آباد کے جس الامراء امیر کبیر کے ہاں ملتا ہے۔ پھر اس سے قبل اکبری عہد میں یا اورنگ زیب کے دور حکومت میں دانش مند خان کے ہاں چلتا ہے جس کے حلقہ برائے اسچہ سرفرازے میں لکھا ہے کہ دانش مند خان کو انکھارث اور گھنٹہ کے فلسفہ اور ہادی کے نظریہ دور ان خون سے دلچسپی تھی اور اس نے بعض مقالات کا ترجمہ کرایا۔ یہ انفرادی دلچسپیاں نہیں لیکن انیسویں صدی کے وسط تک مغربی فلسفہ اور سائنس کے اثرات کافی پھیل چکے تھے۔ سائنس اور مذہب کی مکمل شروع ہو چکی تھی۔ عقلیت اور دایمت کی طرف میلان بڑھ رہا تھا اور جس طرح نثارہ اثر کے بعد روپ کے لیے مکمل تھی یا مذہب سائنس سے مطابقت پیدا کرے یا پھر وہ میں سے ایک کی برتری تسلیم کی جائے۔ یہی صورت حال ہندوستان کے دور ہادی میں نظر آتی ہے اسے چاہے جس پہلو سے دیکھا جائے یہ سوائے اہمیت اختیار کرنا چاہتا تھا کہ مسلمانوں کی اصلاح کی جو تحریکات چل رہی ہیں وہ اسی طرح چلتی رہیں گی یا نہیں۔ شہر کی دشمنی میں کسی نے سانچے میں ڈھالا جائے گا۔ خود کے بعد اس کے لیے بھلا بہت سادہ کار ہو گئی کہ خود نے ہادی حیثیت سے مغرب کی برتری کا فیصلہ کر دیا اور نظام حیات کے وہ نقوش واضح کر دیے جو تقریباً سو سال سے ہندوستان کے اخلاقی زندگی پر ابھر رہے تھے۔ خود نے ہندوستانیوں اور غاص کر مسلمانوں کے اندر بھی ہوئی پیش پندی، کالی،

ہو رہے تھے ریاست اب ایک منظم وحدت اور مضبوط ادارہ جس کی تعلیم اور اصلاح شعوری طور پر حاکم طبقہ سے تعلقات قائم کر کے اپنی حیثیت کو بہتر اور مضبوط بنانے کی فکر میں تھا۔ حاکم طبقہ کو بھی اس کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے یہ تعلقات اب بھی مفاد کی بنیاد پر آسانی سے قائم ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ زندگی کی نئی شکل میں تاخیر اور تاثر کے مرکز بدل گئے اگرچہ اس کا رشتہ ماضی اور اس کی روایات سے نہیں ٹوٹا۔ ملی گزہ تحریک کی یہ خصوصیت کہ اس میں

۔ کتب مرے پیچے ہے کیسا مرے آگے

کی آویزش اور کشش شامل تھی اسے بہت عجیب و غریب تھا۔ اس میں جو بعض مفاد پسند نظر آتے ہیں وہ بھی اس بات کا نتیجہ ہیں کہ نفع اور نقصان کی حدیں واضح نہیں تھیں۔ قوری مفاد و رویا اخلاقی اقدار میں جنگ تھی اور دوا دواؤں بٹ گئی تھیں۔ اس لیے ملی گزہ تحریک کا کوئی مفاد کسی بنے بنائے تصور کی روشنی میں نہیں کیا جاسکتا یہاں تک کہ خود سر سید کے سیاسی مذہبی اور معاشرتی تصورات میں جو تبدیلیاں دلا "فول" ہوتی رہی ہیں آسانی سے ان کی تائید اور توجیس بھی نہیں کی جاسکتی۔

اس میں شک نہیں کہ ملی گزہ تحریک کے راہنما سر سید تھے اور اس کا نام ملی گزہ کے اس عزم انگیز اور بخل کاغذ کی وجہ سے ملی گزہ تحریک چڑا جو سر سید نے شہناہ میں قائم کیا تھا اور سر سید اس سے پہلے بھی مرے سے قائم کر چکے تھے اور سوسائٹیوں کی بنیاد رکھ چکے تھے کیونکہ وہ جن ہوئی فضا کا اندازہ لگا رہے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سر سید کے ساتھ بہت سے تخلص "علم پرور" اعلیٰ اور پرجوش کام کرنے والے تھے جو ہوا کا مرغ پھونکتے تھے اور وقت کے تقاضوں کا احساس رکھتے تھے اور ملی گزہ کاغذ محض ایک طاقت تھا جو اس نئی زندگی میں داخل ہونے کی دعوت دے رہا تھا۔ اس دور ارے کے اندر عطف حم کے کارواں داخل ہو رہے تھے کہمے تو یقینی آنکھ بند کیے ہوئے "کچھ گرد و پیش کا اندازہ لگاتے ہوئے سر سید جس کارواں کو لیے ہوئے چلے رہے تھے اس میں عطف حم کے لوگ تھے لیکن ہمیں طور پر سبوں کے دل میں یہ خواہش تھی کہ وقت لے راہ میں جو رکاوٹیں واں رکھی ہیں انہیں مہر کر کے اپنی راہی اور روحانی زندگی کو بہتر بنایا جائے یہی جستجو اور آگے بڑھنے کی یہی کوشش ہے جسے ملی گزہ تحریک کہا جاتا ہے اس میں فتح مندی کے سبب میل بھی ہیں اور

ہوائی کے نشانات بھی۔ صلیبت آمیز مخالفتیں بھی ہیں اور ناروا سمجھنے بھی اور سرسیدی
 ہمد گیر اور عظیم الشان شخصیت کی ہوائی اس میں ہے کہ تحریک کے سارے خلیفہ و فرزان
 کے افکار و اعمال میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس لیے سرسیدی کے آئیے میں اس کے ضد و غالب
 کو دیکھنا مفید ہو سکتا ہے۔

سرسیدی کی زندگی کے ابتدائی چالیس سال بڑی بڑی علمی خدمات سے خالی ہیں۔ گوان
 میں علمی کاموں کی کمی نہیں ہے۔ آثار السنۃ کی تصنیف، آئین اکبری اور تاریخ فیہاد
 شافعی کی تصحیح طو اپنی جگہ پر اہم کارنامے ہیں لیکن وہ سرسید ہر علمی گزہ تحریک کے روح
 ہواں ہیں وہ رسالہ اسباب بغاوت ہند، تمہین الکلام، مطالعین تہذیب الاخلاق، مجموعہ پیکر
 خطبات احمدیہ اور مختصر قرآن کے سرسید ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا ابتدائی علمی اور
 تحقیقی ذوق ہی ان کی بعد کی تصانیف میں کام آیا۔ سید احمد شہید اور سید اسد علی شہید کے
 یہی تصورات سے وابستگی ہی نے ان کے ذوق اجتہاد کو پروان چڑھایا اور اشاعت تعلیم اور
 خدمت کے شوق ہی نے ان سے علمی گزہ کا عجیب قائم کرایا۔ پھر بھی قدر اور قدر کے عام
 اثرات کو نظر انداز کر کے سرسید کے ارتقاء ذہن کو سمجھنا مشکل ہے۔

سرسید نے مثل حکومت کا چراغ بجھتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ مسلمانوں کی بد حالی
 اور زوال کا نظام کیا تھا۔ ننانے کی بد علمی اور بد احسنی کا مشاہدہ کیا تھا۔ قدر نے جس طرح
 رہی مٹی ان بھی فتح کردی تھی اس نے ان کے قلب کو بے حد متاثر کیا اور ان میں جو علمی
 صلاحیتیں سو رہی تھیں وہ جاگ اٹھیں، وہ اس وقت کے مسلمان راہبازوں میں سب سے
 زیادہ جری، دامل، جلد لیلہ کرنے والے، دکی القلم، پر جوس، حوصلہ مند اور عقل پرست
 تھے۔ انہوں نے بسبب یہ دیکھا کہ قدر نے انگریزی حکومت کو مستحکم کر دیا اور وہ مسلمانوں
 کے لیے یہ مستقبل تاریک ہے تو پہلی دفعہ انگریزی سرکار کے ملازم ہونے کے باوجود قدر کے
 نازک سیاسی پہلوؤں پر اپنا رسالہ اسباب بغاوت ہند لکھا۔ ان کی ہندوستانی مسلمانوں کی
 سیاسی زندگی میں داخل ہونے کی یہ پہلی کوشش تھی اور پھر یہ تھی۔ انہوں نے درود مندی اور
 جرات کے ساتھ انگریزی حکومت کی بعض چیزیں دیکھیں کہ بے طاقت کیا اور طاقت کرنے کی
 کوشش کی کہ چونکہ انگریزوں نے ہندوستانیوں پر کبھی مجبوراً نہیں کیا اس لیے وہ ان برکتوں
 کو نہ تو اچھی طرح محسوس کر سکے اور نہ ہی ان سے فائدہ اٹھا سکے جو انگریزی حکومت اپنے

ساتھ لائی تھی۔ اس کے بعد سے ہندوستانی سیاست میں سرسید کی جگہ بن گئی اور انہوں نے اپنی ساری قوت اس بات پر صرف کر دی کہ انگریزوں اور مسلمانوں میں دوستی ہو جائے۔ سیاسی مخالفت کی تکمیل کے لیے یہی مخالفت کے بغیر ممکن نہ تھی اس لیے انہوں نے وہ تمام ذرائع اختیار کئے جن سے انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان تصورات 'ظلم اخلاقی' اہل کتاب ہونے کی وجہ سے انہیں کی معاشرت میں یکساٹی اور اشتراک پیدا ہو۔ لیکن اس کوشش کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ قوم سمجھتے تھے بلکہ جب وہ اپنے سیاسی تصورات کی ترویج کرتے تھے تو دونوں کا نام ساتھ لیتے تھے۔ اس نائنے میں انہوں نے انگریزوں اور ہندوستان کی مساوات پر پناہ دے دی۔ بار بار یہ کہا کہ جو وعدے انگریزوں کو ملتے ہیں وہ ہندوستانیوں کو بھی ملتے چاہئیں۔ کونسلوں اور لوکل بورڈوں کے لیے انتخاب کے اصول کی تائید کی اور ہندوستانیوں سے کہا کہ وہ ایسی تعلیم حاصل کریں جو انہیں حکومت کے قابل بنائے لیکن جیسا کہ حکومت کے غور و فکر سے سمجھ میں آسکتا ہے یہ ساری سیاست حوصلہ جلد کے رجحانات کی نشاں تھی کرتی ہے اور حوصلہ جلد اگر اپنے مناد کے لیے حمہ اور حق ہو سکتا ہے تو اپنے مخالف یا فرقہ وارانہ مناد کے لیے دوسرے فرقوں کا مخالف بھی بن سکتا ہے۔ چنانچہ سرسید اگر ایک طرف ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے آواز بلند کرتے تھے تو دوسری طرف پھر مسلمانوں کے حقوق کو بھی پیش نظر رکھتے تھے۔ انگریزی سیاست اس جذبہ کو مسلسل ہوا۔ اے ری قومی 'صرف وہ اقتباس اسے واضح کر دیں گے' اسکا چرن مہدار نے اپنی کتاب 'انڈین نیشنل موومنٹ' میں لکھا ہے:

"اہل اول انگریزی عمل داری کے ابتدائی نائن میں مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کو بڑھا دیا گیا" اور اس کے بعد ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں کو اٹھایا گیا جو اسی رجحان اور ہر اور کا موجب ہوا۔"

جس ارکلی نے کلکتہ ریویو میں لکھا کہ:

"ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مسلمانوں کی بے اطمینانی بے بنیاد ہے۔ سالہا سال سے مسلمانوں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے یا انہیں ایسی رعایا سمجھا جا رہا ہے جن کی اطاعت شیعہ ہے۔ ان کی تعلیم کی طرف سے غفلت کی جا رہی ہے۔ حتیٰ کہ ان کے اوقاف کی آمدنیوں کو جو اسلامیہ کالجوں کے قیام کے لیے تھیں دوسرے کاموں میں صرف کیا جا رہا ہے۔"

اس پالیسی کا شکار ہندو اور مسلمان دونوں ہوتے تھے جس لیے کبھی ہندی ہندو
ہندوستان کا نواں لگایا جاتا تھا۔ کبھی یہ کہا جاتا تھا کہ ہندو اور مسلمان دونوں ہیں لیکن سر
سید کی ابتدائی سیوی زندگی میں اس نکتہ فکری کا پتہ نہیں چلتا۔ اگر وہ مسلمانوں کا یہاں
نیل رکھتے تھے تو اس لیے کہ انگریز مسلمانوں کو نذر کا جانی سمجھ کر نہیں رہے تھے تاہم اس
وقت ہندوستان اپنے غیر متوازن اور ناممکن قومی ارتقاء کی وجہ سے مذہبی اختلاف کے
جرائم کی پدوشی بھی کر رہا تھا۔ چنانچہ مولانا حالی 'سر سید کے یہاں جب اس بات کا پتہ
لگنا چاہے ہیں کہ ان کے نقطہ نظر میں تبدیلی کیسے پیدا ہوئی تو یہ واقعہ ان کے سامنے آتا ہے

۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سرکردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن
ہو تمام سرکاری عہدالتوں میں سے ہندو زبان اور فارسی رسم الخط کے موقوف کرانے میں
کوشش کی جائے۔ سر سید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو
مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلتا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے مشترک کوشش کرنا
محال ہے۔ ان کا بیان ہے کہ انہیں دونوں میں جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا، ایک دور مسٹر
کلیئر سے جو اس وقت بنارس میں کیشنر تھے، میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو
کر رہا تھا۔ اور وہ حجب ہو کر میری گفتگو من رہے تھے۔ آخر انہوں نے کہا کہ آج یہ پسند
واقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ عام
ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں
قومیں کسی کام میں اس سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے، آگے آگے اس سے
نوادہ طاقت اور تعداد ان لوگوں کے جب یہ تعلیم یافتہ نکلتے ہیں، پھر نظر آتا ہے، جو زمین
سے گا وہ دیکھو گا۔"

اس طرح سر سید کے ذہن میں مسلمانوں کی علاحدہ تعلیم، ان کی علاحدہ حقوق و فرائض کے
خیالات نے جڑ بکڑا شہد کیا۔ اتفاق سے اس کے بعد ایسی صورتیں پیدا ہوئی تھیں کہ سر
سید کا مسلح نظریہ D کیا۔

۱۸۶۸ء میں سر سید انگلستان گئے اور تقریباً ڈیڑھ سال بعد واپس ہوئے۔ اس سفر نے
ان کے ذہن میں بہت سے مسائل واضح کر دیے اور انہیں اپنا حسب العین مدش نظر آنے

لگا۔ یوں تو انہوں نے ہر کے ہر سے انگریزی معاشرت اختیار کر لی تھی جس پر مذہب پرست مسلمان ان سے بدظن ہو گئے تھے۔ لیکن انگلستان سے واپسی کے بعد انہوں نے جب اس کی تبلیغ شروع کی تو پالی سر سے اونچا ہو گیا۔ معاشرت میں ظاہری تبدیلیاں بھی سرسید کی نفسی تحریک کا جزو تھیں لیکن ان کا اصل کام انہوں کو بدلتا تھا جو ان کے مذہب، اجتہاد و تہجد کا نتیجہ تھا۔ اسی کے لیے انہوں نے انگلستان سے واپس آنے کے قہورے ہی دنوں بعد تہذیب الاخلاق نکالا جو ان کے حوصلوں اور خیالوں کا آئینہ ہے۔ سرسید نے اسلام کے اصل اصولوں سے کس حد تک انحراف کیا، کس حد تک، معجزہ انداز نظر اختیار کیا اور کتنا جدید سائنس اور فکری علوم سے مستارے کر اسلام کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔ کہاں تک یہ سب کچھ محل تادیب اور نفی تشریع کی حیثیت رکھتا تھا اور کہاں تک مغربی عقلیت کی برتری تسلیم کرنے کے مترادف تھا۔ ان تمام باتوں پر وہ شخص تفصیل سے بحث کرے گا جو ان کے علم کلام کا مقابلہ اسلام علم کلام سے کرے گا لیکن ایک سرسری مطالعہ کرنے والا بھی یہ بات آسانی سے سمجھ لے گا کہ وہ مسلمانوں کو پستی سے نکالتا چاہے تھے اور انہیں تہجین ہو گیا تھا کہ ان کے ذریعے جدید تعلیم، انگریزوں سے وقاداری، معاشرت میں تبدیلی، مذہب اور عقل کی ملاقات، تہذیب سے نجات اور اصلاح رسوم ہیں۔ ان کے ہر اقدام میں نہیں درائع سے کام لینے کی کوشش نظر آئے گی۔ تہذیب الاخلاق میں سرسید کے مضامین پڑھتے جائے آپ کو بار بار یہ خیالات واضح یا دھکے چھو الفاظ میں دکھائی دیں گے:

”علم سے مراد علومِ غیبیہ نہیں ہیں، کھل مدد، انماز، دیوبہادت نہیں۔ جس طرح علومِ غیبیہ کا پڑھنا فی سب عبادت میں اسی طرح علومِ دینی کا پڑھنا عبادت نہیں، لیکن علومِ دنیوی اس لیے پڑھے جائیں کہ ان سے مذہبی علوم سمجھنے میں مدد ملے گی تو ان کا پڑھنا عبادت ہو جاتا ہے۔ اس وقت مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ امورِ معاش و تمدن و حسن معاشرت اور علم کی اتری و غرابی کے سبب روزِ ہمار، ذلیل و حقیر ہوتے جاتے ہیں۔ اور واقعہ و مولوی صاحب و دینی حد اور رسول کے دشمن اور کو روزِ ہمار، ہمارا کرتے جاتے ہیں۔ مذہب اسلام کے دوستوں کا یہ کام ہے کہ اپنے تئیں دینی و حضرت صاحب یا مولوی صاحب کہلانے یا دعا بازی سے دنیا کمانے کے لیے انہیں باتوں کا جن کی ضرورت نہیں ہے، بیضا ہوا دھکا کما کرے یا جن کی ضرورت درحقیقت مسلمانوں اور خود اسلام کو ہے اس کی تدبیر

اور کوشش کرے۔ مسلمان عام طور سے یہ سمجھتے ہیں کہ انگریزی تعلیم سے صدمہ خراب ہوتا ہے اس لیے مسلمانوں کو یہ لگ رہا ہے کہ انگریزی پڑھنا تو مذہب و ضلالت کا باعث ہے۔ یہاں مذہب کو کیا کریں اور کیسے بچائیں۔ ہم (سرید) اسی خیال پر رہتے ہیں کہ اگر اسلام ایسا ہی بد مذہب ہے تو اس کو چھوڑنا اچھا۔ ہمیں جدید علوم سے خوف نہ ہونا چاہیے اسے سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ شیعوں کا یہ عقیدہ بالکل درست ہے کہ ہر عہد میں مجتہد کا ہونا ضروری ہے۔ شاہ ولی اللہ نے بھی مسرت سے حواہیوں سے یہ بات کہی ہے۔ عقائد مذہبی کو ہمیشہ علوم کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور ہمیشہ ان کوششوں کو الحاد و زندقہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل کے زمانے میں ہی ہوا اور بھی حلقے عباسیہ کے دور میں جب مسلمان مالکوں نے معتزل و معتزل کی تعلیم کو لاری سمجھا اور چھین کیا کہ بغیر اس کے ایمان کامل نہیں ہوتا تو ضرور اس کی طرف مائل ہوئے اس فن میں امام عزالی کی احیاء العلوم اور شاہ ولی اللہ کی جنت اللہ بالانوار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اب ضرورت یہ ہے کہ جس طرح قدامت نے یونانی علوم سمجھے تھے ہم آج جدید علوم سمجھیں اور انھیں کی طرح معتزل جدید اور معتزل اسلامہ قدامت کی تعلیم کی کوشش کریں۔ قدامت یونانی معتزلات گمراہ کرنے والے ہیں اور جدید علوم حقیقت اشیاء بتاتے ہیں۔ یہ چند جملے تفصیل الاطلاق سے بے ترتیب طور پر نقل کر رہے ہیں۔ پیچیدوں کے مجموعوں میں بھی ایسی ہی باتیں ملتی ہیں مثلاً دینی علوم دینی دولت و حشمت سے اسلام کو مدفق ہوگی دین چھوڑنے سے دنیا نہیں جاتی مگر دنیا چھوڑنے سے دین جاتا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے علم کی حقیقت کو اس قدر جاننا کہ ایک شے اصل ہے و خیال اور حافظہ میں رہتی ہے مگر اس زمانے میں اصلی علم اسی کو کہتے ہیں جو دیکھنے اور تجربہ میں آوے۔ رسالت خاصہ کا موجد ہونا اس کا ثبوت ہے کہ رسالت کو توڑنا اور تبدیل کرنا اور ترقی دینا نہایت ضروری ہے مجھے (سرید کی) تعبیر کے فوائد کا اثر نہیں کیونکہ ایسا ہی غوث الاعظم امام عزالی اور مجدد الف ثانی کے ساتھ کیا گیا۔ حکمت مسلمان کے لیے کم شہ چیز کی طرح ہے جس میں کسی پادے اسے لے لے۔ ہاری (سرید کی) سمجھ میں کوئی مسئلہ غیث اسلام کا یا جو کچھ قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے کسی قدامت یا جدید علم کے برخلاف نہیں ہے۔

طویل اختیارات دینے اور ان پر بحث کرنے کے بجائے یہ چند جملے ادھر ادھر سے لے

لئے ہیں جو اپنی کمانی کپ کھتے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچاتے ہیں کہ سرسید وقت کے تقاضوں سے مطابقت رکھنے والا ایک علم الکلام مرتب کر رہے تھے جسے پوری طرح وہ قوم سمجھ نہیں سکتی تھی جس کی وہ رہنمائی کر رہے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کی جو مثالیں ہوئیں ان کے تلفظ پسو تھے۔ کوئی انہیں مذہبی خیالات کی بنا پر کارٹر میر مسلم اور ہنس نیچری سمجھتا کوئی مصالح معاشرت کی وجہ سے کرستان اور صیالی سمجھتا تھا۔ کوئی مذہبی اصلاح کے اس سارے ادب کو محض ایک سیاسی دھوکہ سمجھتا تھا جس کے درپوش مسلمانوں کو انگریزی حکومت کا دھارہ دہانے کی کوشش کی جارہی تھی چنانچہ جمال الدین غلامی نے ایک جگہ لکھ ہی دیا کہ:

”تفسیر کا تجزیہ کرنے کے بعد مجھے مسلم ہو گیا کہ مسلمانوں کے اعتقادات کو رائل کرنے کی جو کوشش مصر (سرسید) نے کی ہے اس کا مقصد وحید یہ ہے کہ مسلمانوں پر غلامی مسلط کی جائے اور ان کو الیاد میں فہم کر دیا جائے۔“

حقیقت یہ ہے کہ سرسید ہندوستانی تاریخ اور عالمی سیاست کے اس دور میں رہنمائی کے لیے اٹھے جب اسلامی جوش اور غلوں کے باوجود ان کے خیالات نے انگریزی حکومت کے دست و پاؤں مضبوط کیئے اور اگر مسلمانوں کو نفی کی راہ پر چھ قدم آگے بڑھایا تو چند قدم پیچھے گھسیٹ دیا۔ ان کی ایک دشواری یہ بھی تھی کہ مذہب کے مسائل میں قدیم علماء اور عوام سے بدعقلی تھی وہ خود یہ نہیں سمجھتے تھے کہ سیاسی مسائل کے حل کرنے میں مذہب سے کس طرح کام لینا چاہئے چنانچہ ایک طرف تو وہ دہانت کے بعض پہلوؤں کو سراہتے تھے:

”ہری طرف سے کہتے تھے کہ:

”مگر اہل کتاب ہیں خدا نے فرمایا ہے (کوئی غیر مذہب والے مسلمانوں کے دست نہیں ہرکتے۔ اگر ہرکتے ہیں تو صیالی ہیں)۔“

دوسرے موقع پر ایک لکچر میں انگریزوں کا دھارہ دہانے کی تحقیر کرتے ہوئے کہا کہ:

”مسلمانوں کے لیے محض عقل اور انسانی نہیں خدا کا علم ہے راصل کا علم ہے کہ حاکم کی اطاعت کرنا۔“

اس طرح محض پرستی اور اعتماد ٹھکانے واقعی مصالح سے ساز کر کے انہیں بھی سکھایا کہ مذہب کا سارا لے کر نکالی کو حق یہ جانب دہانت کریں۔

علی گڑھ تحریک اپنی مکمل شکل میں ۱۸۵۷ء کے بعد نمودار ہوئی ہے۔ اس وقت تک سر سید کے ذہن میں اس تحریک کے واضح نقش ہوں تو ہوں، عام طور پر اس کی مدد گیری اور ہندوستان کی تاریخ خاص کر مسلمانوں کی داخلی اور سیاسی تاریخ پر اس کے جو اثرات پڑنے والے تھے اس سے زیادہ نوک و ناقد نہیں تھے لیکن نئی زندگی کا جو دلولہ تھا اس نے قہورے ہی دلوں کے اندر اس کا رخ حسین کر دیا۔ ۱۸۵۷ء ۱۸۵۸ء تک اس کے مثبت اور مفید پلو ابھرتے رہے۔ نئے علوم حاصل کرنے، لے بہب کو علوم عقل کی مدد سے قابل قبول بنانے، سائنسی اصلاح کرنے اور ہندوستانوں کو ایم سی کے نسیم سے نکال کر زندگی کی بدولت میں شریک ہونے کا آواز دینے، اپنی زبان اور ادب کو سربلند بنانے اور سنجیدہ علمی و عقلی کاموں کی طرف متوجہ کرنے میں علی گڑھ تحریک نے ہندوستان کے عام دور پیداری کو وسیع تر اور وسیع تر بنا دیا۔ اس وقت تک سر سید نے ہندوستانوں کو زیادہ تر ایک قوم کہا اور اگر کبھی ہندو دور مسلمانوں کے لیے الگ الگ قوم کا تصور استعمال بھی کیا تو انھیں ایک دہن کی دو غصہ رسی کی طرح دیکھنے سے تشبیہ دی ہے۔ لیکن جتنا وقت گزرتا جاتا تھا ان کے یہاں ہندو مسلم کی تفریق بڑھتی جاتی تھی۔ یہی سبب تھے کہ وہ انگریزوں کو بھی ایک ہندوستانی قوم کہنے لگے تھے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء میں اپنے ایک لکچر میں کہتے ہیں:

”صدیوں سے ہندو مسلمان یہاں آباد ہیں۔ ہندو سال سے خدا کی مرضی یہ ہوئی کہ ایک تیسری قوم (انگریز) بھی یہاں آباد ہوئے اب یہ تینوں کا ملک ہے۔“
اور اسی کے قہورے دلوں میں انھیں یہ احساس بھی ہو گیا کہ وہ قوم ہندوستانی قوموں سے بڑھ کر ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

”میں کلی جگہ کہ چکا ہوں کہ ہندوستان کے لیے ممکن ہے کہ ہندو مسلمان میں سے کوئی حاکم ہو اور امن قائم رکھ سکے۔ پھر یہی ہونا ہے کہ کوئی دوسری قوم ہم پر حکمران ہو۔“
شروع میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اس مقالہ میں علی گڑھ تحریک کی مکمل تاریخ بیان کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔ بلکہ جس حالات نے اسے جنم دیا اور اسے ایک راہ پر لگایا، ان کا تجزیہ کیا جائے گا۔ اس لیے ان تمام وجوہ کی جستجو جس سے یہ تہذیب ہوئی یہاں نہیں کی جائے گی۔ تاہم یہ کتنا ضروری ہے کہ انگریزی حکومت نے غور کے بعد اپنے انتظام کے لیے جو کوششیں کیں اور جو ذرائع اختیار کیے ان میں ہندو مسلم اتحاد کو روکا بھی تھا۔

دو قوں فرقوں میں اس عناصر سے ساز باز کرنا بھی تھا جو اس کے معاون اور حلیف بن گئے۔ یہ بھی ظاہر کرنا تھا کہ ساری دہلیا حکومت کی نظر میں یکساں ہے اور اس کے لیے ترقی کی راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ اس معاشی استحصال اور لوٹ پوٹ بھی والا تھا جو ایزہ صدی سے جاری تھا۔ اس طرح خود کے بعد مغربی اثرات سے پیدا ہونے والی بیداری کے ہاورد ہندوستان میں اصل کلکتہ یہ تھی کہ یہاں غیر ملکی حکومت ہوگی کہ ان قومی عناصر کا اتحاد ہو گا جو ہندوستان کی ترقی انگریزوں کے مفاد کے لیے نہیں ہندوستان کے مفاد کے لیے چاہتے ہیں۔ اس میں دفا داروں کی تقسیم واضح نہیں تھی اور سیاسی شعور جس خطہ میں تھا اس کو دیکھتے ہوئے ہو بھی نہیں سکتی تھی لیکن معاشیات اور تاریخ کے ہر طالب علم کو وہ نشانات نظر آسکتے ہیں جو انگریزی ساد کے مابوت میں کیوں پر کلیں ٹھوکر رہے تھے۔ ہندوستانیوں کی کونسی باشعور انگریزوں کو انگریز دشمنی کے بحوت دلاتے نظر آ رہے تھے۔ ۱۸۵۶ء میں ٹیکہ دل لارڈ کیسنگ نے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالتے ہوئے کہا:

”میں اپنے عہد حکومت میں امن چاہتا ہوں لیکن میں اس بات کو اپنے ذہن سے نہیں نکال سکتا کہ کیس ایسا ہو کہ ہندوستان کے افق پر جو یہ ظاہر نہایت ہر سکون اور خاموشی نظر آتا ہے ہاں کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ابھر آئے۔ شاید یہ ٹکڑا آوی کی جھیلی سے بڑا ہو لیکن جھیلی جیسے جھیلی ہی جائے۔ یہاں تک کہ طوفان کی طرح پھٹ پڑے اور ہمیں بہادر کدے کی دشمنی دیکھنی پڑے۔“

اور سال بھر کے اندر ہی اندر یہ ہاں اٹھا کر جا بڑا سا اور انگریزوں کے لیے جانی کی دشمنی بن گیا۔

مل گزہ تحریک کے ابتدائی دور اور بعد کے ادوار میں جو فرق ہوا چلا گیا اس کی جڑیں ہندوستان کی قومی تحریک کی تاریخ اس کی غامضیوں اور طبعیوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ دہلیا میں اکثر کمی جاتی ہیں اور خود فکر کا مطالبہ کرتی ہیں۔ اول یہ کہ ہندوستان میں قومی احساس کا گریس کے قیام (۱۸۸۵ء) سے شروع ہوا اور دوم یہ کہ اس کی ابتداء انگریزوں کے ہاتھوں ہوئی کیونکہ انگریزوں کی بنیاد اولین کھجوریم نے رکھی اور دائرہ اسے لارڈ آفرن نے اس کا کسائی کا پیسہ سمجھا۔ گویا اس احساس کے لیے انگریزوں کا منت کش ہونا چاہئے۔ اس خیال میں اتنی صداقت ضرور ہے کہ قومیت کا احساس اسیویں صدی میں پیدا ہوا اور یہ رد عمل

قہ انگریزوں کے وجود کا۔ یہ بھی درست ہے کہ اس میں طلبہ طرز فکر سے مدد ملی لیکن اسے
 انگریزوں کی دین سمجھنا لگا ہوگا۔ ہندوستان میں قومیت کا ارتقاء اس معاشی پختی اور غلامی
 کے احساس کا نتیجہ ہے جس کا پیدا ہونا لازمی تھا چنانچہ اگر ہم سراج برٹش انڈیا سوسائٹی
 (۱۸۳۳ء) برٹش انڈیا ایسوسی ایشن (۱۸۵۵ء) یعنی ایسوسی ایشن (۱۸۵۵ء) بنگال نیشنل لیگ
 انڈین ایسوسی ایشن لکھنؤ سوجیک سما پانا (۱۸۷۵ء) نئے ایسوسی ایشن مدراس سماجن سما
 مدراس (۱۸۸۳ء) جیسے اداروں کی صورت میں نمودار ہو چکی تھیں در ہندوستان کے کسی سر
 طبار نری اور گرمی کے ساتھ ہندوستان کے قومی جذبات کا اظہار اور قومی احساس کی تشکیل
 کر رہے تھے۔ اس لیے نیشنل کانگریس کو پہلا قومی ادارہ کہنا درست نہیں۔ یہ مفہوم ہوا کہ
 اس نے دوسرے قومی اداروں کی اہمیت کم کر دی۔ اب رہا یہ کہ ایک انگریز نے کانگریس کی
 بنیاد ڈالی اس کی داستان بھی دلچسپ ہے۔ مسٹر بیوم کے سوانح نگار مردیم ڈورین نے اس
 کی تفصیلات دی ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ جب بیوم نے سات بیوی بیوی جلدیں صرف ان
 رپوں سے بھر ہوئی دیکھیں جو گاؤں ’قبیلوں‘ ’شہروں‘ ’صلوں‘ سے اکٹھا کی گئی تھیں اور جن
 میں لوگوں کی باطنی نہ بات چیت کچھ کر گزرنے کے ارادے ہر حالت میں جھڑپنے کے عہد
 ’جان‘ اسٹون کی درستی اور بقاوت کے حرم کی کمایاں تھیں ’تو نہ حیرت زدہ اور خوف زدہ
 ہو گیا اور اس نے انگریزوں کی مخالفت کے اس جذبہ کو ’’سٹوری اور آئینی‘‘ شکل دینے کے
 لیے ایک قومی ادارے کی تجویز پیش کی۔ اس لیے یہ رائے قائم کرنا ٹھیک نہیں ہوگا کہ قومی
 تشکیل کی ابتداء انگریزوں کے ہاتھوں ہوئی۔ یہ تو واضح ہے کہ ’اپنے سارے ارتقاء میں
 ارتقاء بالحد کا اصول کار فرما ہوا ہے۔ اور فیروز تحریک کا عمل ساتھ ساتھ چلتا ہے۔
 یہاں اس سوچنے کا مقصد یہ ہے کہ قومیت کی نشوونما کے لیے نقد تیار تھی اور ’انگریزی
 حکومت یا ملکہ وکنورج سے وفاداری کے اعلان کے پردے میں اس کی تشکیل ہو رہی تھی۔
 اس کا ثبوت یہ ہے کہ ابھی نیشنل کانگریس کی مردم سال کی بھی نہیں ہوئی تھی اور اس کے
 اجلاسوں میں وفاداروں کے اطلاعات کی شدت میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی کہ حکومت اور
 اس کے حلیف عناصر نے اس کی مخالفت شروع کر دی۔ کانگریس کی ابتدا کی کارروائیوں میں
 ہندوستان کے ابھرتے ہوئے حوصلہ اور سرمایہ دار طبقہ کے مقاصد اور مفاد کی جھلک دیکھیں
 جاسکتی ہے۔ معمولی جاننے پر کسی یہ مفاد فیر لگیوں کے مفاد سے متصادم تھا اس لیے تھوڑے

ان دنوں کے اندر حکومت نے سرکاری ملازموں کو کانگریس کے جلسوں میں شرکت ہونے سے روک دیا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ملی گزہ تحریک یا سرسید کا اس سے کیا رشتہ تھا۔ ۱۸۸۸ء تک کانگریس کی کارروائیاں دیکھی جائیں تو اندازہ ہوگا کہ اس میں کوئی ایسی چیز نہ تھی سرسید جس کے مخالف ہوسکتے۔ یہ بھی نہیں کہ سرسید کو ہندوستان کی معاشی ترقی کا احساس نہ تھا لیکن ملاحظہ ہو ایسی کہ سرسید کا نقطہ نظر محدود ہوتا چلا گیا۔ انہوں نے کانگریس کی مخالفت شروع کی۔ مسلمانوں کو سیاسی امور میں حصہ لینے سے روکا۔ انہیں درجہ درجہ کے لوگوں کی تفریق پر اندر دیا تو کل بورا کے انتخاب کی مخالفت کی سیاسی شور سے خوف نہ ہو کر مسلمانوں کو سمجھا کہ ہم کو الگ رہنا چاہئے۔ ہم کوئی انتخاب بجز بے ہودہ فعل کرنے کے پیدا نہیں کر سکتے بنگالی راہنماؤں کی سیاسی جدوجہد کو مسلمان قوم پر بے جا دست بردازی سے منسوب کیا۔ اس بات پر اندر دیا کہ اگر انگریز چلے گئے تو ملک میں امن نہ رہے گا مسلمانوں کو بار بار یہ بتایا کہ صرف انگریز تھامے دست ہیں۔ اور یہ سب کچھ تقریباً دو تین سال کے درمیان۔ بعض لوگوں نے اس تبدیلی کو فیوض پر نہیں ملاحظہ کیا کہ کانگریس کی سیاسی چار کا نتیجہ قرار دیا ہے اور ایسا نتیجہ نکالنا کچھ بہت غلط بھی نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کانگریس کی ایک خاص منزل پر "فیڈرل جادوئی" اس لیے "مادہ" ہو گئی کہ سرسید نے مسلمانوں کی فوری مدد پر غور کیا۔ یہ فوری مدد سرکاری ملازمت حاصل کرنا تھا سیاسی یا قومی تحریکوں میں شرکت کے ساتھ یہ بات ناممکن ہو گئی تھی۔ فزقی کی دوا میں مسلمان بچتے تھے دولت میں کم تھے اتحاد میں کم تھے بڑی دشواریوں کے بعد حکومت نے ان پر بھروسہ کرنا شروع کیا تھا۔ عبادت اور شورش پسندی کا دھماکا کے دامن سے دھوا گیا تھا اور سرسید جب فزقی کا تصور کرتے تھے تو ان کے دامن میں "زور ملی دوا" پنے کر سکتے اور بھر جاتے ہوئے "مسلمان" بن کر ہوتے تھے۔ انہماک سے حاصل کرنے والے تعلیم یافتہ لوگ ہوتے تھے اسی لیے سرسید نے تعلیم و تربیت کے ان پہلوؤں پر اندر دیا شروع کیا۔ آخر کوئی غلط اس مسئلہ کے نتیجائی شعور کو سمجھنا چاہیے تو اس کے لیے ان کے ایک لیکچر (۲۱ مارچ ۱۸۸۸ء) کی یہ پھر سنیں کافی ہو سکتی۔

"ہم علم میں کم ہیں دولت میں کم ہیں" — ہندو چاہیں تم ہم کو چاہیں کیسے میں جاد

کریں۔ امدادی تجارت پائلٹ بندوں کے ہاتھ میں ہے۔ جہتی تجارت پر مگریزوں نے قبضہ کر لیا ہے جو تجارت بندوں کے پاس ہے وہ انیس کے ہاتھ میں رہنے دو کیوں کہ یہ ہم دکان پر بیٹھ کر آٹا وال چھکتے ہیں نہ سوت کپاں۔ ہمارے ملک کی پیداوار کی تجارت جو مگریزوں کے ہاتھ میں ہے اور جس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس کو ان کے ہاتھ سے پیسے کی کرشش کرو ان سے کہہ دو آپ آپ تکلیف نہ کریں ہم خود اپنے ملک کا بڑا نقصان ہے۔ جاتیں گے اور وہاں پیسے گئے 'بڈا امریکہ لے جائیں گے' لفظ اور مدنی کی تجارت کریں گے 'انگریز اس میں دخل نہ دیں گے۔ مگر یہ سب باتیں تعلیم پر موقوف ہیں۔"

یہاں وہ کھٹک لیاں ہے جو اس عہد کے دوسرے رہنماؤں کے یہاں بھی تھی لیکن اس کا لب و لہجہ اس کا مقصد 'اڈا بھائی لورڈس' سرحد راجہ منی لال موہن گھوش 'ریش چندر دت کے لہجہ اور مقصد سے مختلف ہے 'ہاں کہ ان میں سے کوئی ایک نہ تھا جو انگریزی حکومت کی برکتوں کا شفا خواں نہ ہو۔ اس میں شک نہیں کہ سرحد انگریزی حکومت عملی کا شمار ہو سکے۔ ان کی نگاہ محدود ہوتی تھی 'یہاں تک کہ تہستہ تہستہ صرف مسلمانوں اور وہ بھی ہندوستانی مسلمانوں کے ایک چھوٹے سے طبقے مفاد کو اپنے تمام عملی خیالات کا مرکز بنالیا اور انگریزوں کی حمایت میں یہ بھی بھلا دیا کہ یہی انگریز شرق قریب اور شرق وسطی کے مسلمانوں کا خون بھی چوس لینا چاہتے ہیں۔ علی گڑھ تحریک اس طرح تہستہ تہستہ تھا کہ انکار ہوتی تھی اور سرحد کے غیر معمولی ذہن نے اپنی کان سے قتل کے تیر نکال کر راجہ ہندی کے تیر نکال لیے جس سے خود ان کی تحریک رخی ہو گئی۔

جیسا کہ کہا گیا علی گڑھ تحریک ایک ہم گیر تحریک تھی۔ یہ ہندوستان کے دور بیداری کا ایک اہم جزو تھی۔ اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو حالات کا ساتھ دینا 'دلت کے تقاضوں کو سمجھنا اور دوسروں کے چنگ سے نکلنا سکھایا تھا۔ اس کے اصلاحی مشن نے طراکین پر اڑنے اور تعلیم نو سے ڈرنے سے بچایا تھا اس نے کسی حد تک جاگیردارانہ تصور حیات سے نکال کر جدید صنعتی دور کی طرف متوجہ کیا تھا لیکن اس کی ضمیر میں خرابی کی جو صورت ظہور تھی وہ یہ تھی کہ اس میں ضرورت سے زیادہ تھم طبقہ سے مدد لگی تھی اور اسے عام کی پہنچ سے باہر رکھا گیا تھا۔ جس خاصہ کی مدد سے اس تحریک کو چلانے کی کوشش کی گئی انہوں نے اس کے صحت مند پیروں کو دبا کر محض دفعتی فائدہ پہنچانے والے پہلوؤں کو ابھارا

لیکن پھر بھی اس نے جو کچھ حاصل کیا وہ ہندوستان کے آریہ اور سماجی ارتقاء میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ سرسید کے ادبی کارنامے تنقید، اخلاق اور اس جائداد نثر علمی اور ثقافتی مسئلہ پر بحث و مباحثہ، 'اکثر خیر' اور 'نایب' اور 'لیکچروں کے مجموعے' خواجہ الطاف حسین حالی کی شاعری اور جنتی ہیرویت، 'حسن الملک'، 'اکام' اور 'چراغ ملی' وقار الملک سید علی بکراہی کے ادبی کارنامے تحریک کی تعلقہ کے باوجود قلی کے ادبی اور علمی تہاہار اور ان سب سے پہلے کرن ذمہ 'تحریک اور قلی' پر نظر اوجھان بزرگوں کے کارناموں سے وجود میں آئی۔ یہ ساری چیزیں علی گڑھ تحریک کے دفتر عمل میں نکلی جائیں گی۔ بحرحب کے نتائج اٹھانے کے لیے کہ جاتا ہے کہ اس نے قومی زبانوں کو رہن سے اٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا۔ معمولی بول چال کی زبانوں کی ادبی خزانوں سے مالا مال کدیا۔ یہ بات ہندوستان کے ادبی ارشاد کے لیے بھی کئی جاسکتی ہے۔ یہاں کی سب سے پہلی زبانوں میں شعروادب موجود تھے لیکن اس دور بیداری نے حقیقت پسندی، غنیمت، اسلوب بیان ادب اور زندگی کے رشتہ پر نور دے کر ادب کو جاندار بنا دیا۔ سرسید اور ان کے ساتھیوں کے ہاتھوں میں اردو ادب نے ایک نئی کائنات حاصل کی۔ جس کے حسن میں رعنائی کم محنت مہنتی لڑنا ہے۔ ان لوگوں نے جن چوں کو تھیں کیا اسے مصلحان یا تھیلہ نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ نئی زندگی میں داخل ہونے کا شعوری احساس تھا۔ جس نے ادب کو سماج اور تنقید کے ارتقاء کا ایک اہم آلہ کار بنا دیا۔ شعروادب کے گہرے توبیخ و تہلیل کے منہ پر رہتے ہیں۔ آرائش علم کا کل کا سلسلہ جاری رہتا ہے لیکن سرسید کے درسی علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اردو ادب کی ایک حیل تلی در ایک نئی حیل کی طرف ادب کا کامداں روانہ ہو گیا۔ نئے لیکن اور نئے حیلوں کے ساتھ 'نئے امکانات اور نئے جذبے کے ساتھ۔ علی گڑھ تحریک کی یگانہ و ستاد خصوصیت ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں نہیں بلکہ اسے اس تحریک کی بہت سی خامیوں کا کٹاؤ قرار دیا جاسکتا ہے۔

ان تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر اگر علی گڑھ تحریک کے وجود میں آنے کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جن عناصر نے اس کی تکمیل میں مدد کی تھی ان میں سے بعض دور تک اس کے ساتھ نہیں چلے۔ بعض صورتوں میں یہ تحریک، اسلوب کی غلطی اور سستی طالی بن کر رہ گئی اور بعض صورتوں میں دیر اور دور دراز نتائج کی تحریک اہل ثابت ہوئی۔ ایسی ہر

تحریک تاریخی جبر اور روایت کا تصور ہوئی ہے یہ بھی اس سے بچ نہ سکی لیکن اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ جس حقیقت جس اصلاحی جوش اور ترقی کے دلولہ کو لے کر اس نے اپنی ابتداء کی تھی وہ آہستہ آہستہ ظاہری پنک دھک ملازموں کے لیے ہمدردی، انگریزوں کی رضا جوئی کے جذبے کے نیچے دھت چلے گئے۔ پھر بھی علی گڑھ تحریک اپنے اساسی پہلوؤں میں ہندوستان میں اس عالمگیر دور کے داری کا ایک حصہ تھی جس نے مسلمانوں کو جگاڑا اور ان میں نئی راہوں کی طرف پلنے کی سکت پیدا کی۔ انیسویں صدی کے وسط میں جب مسلمان کی راستوں کے مقام اتصال پر پہنچ کر راستہ دھوڑنے کی ہمت نہ کئے تھے نہ پیچھے پلٹ سکتے تھے نہ آگے بڑھنے کی جرات تھی اس وقت علی گڑھ تحریک نے انہیں آگے بڑھنا سکھایا لیکن پوری طرح یہ نہ تھا کہ کسی کو کوسا راستہ دکھا دیا ہے۔ سر سید نے جدیدیت کی طرف متوجہ کرنے کے ساتھ انگریزوں سے دوستی، تعاون یا وقار داری کا جو سبق پڑا یا وہ اس حالت میں بھی جاری رہا بلکہ زیادہ شدت اختیار کر گیا۔ جب حالات بدل رہے تھے اور ہندوستان کا سیاسی مزاج کسی اور سانچے میں ڈھلنے اور سیاست کا کارواں کسی اور خط کی جانب بڑھنے پر آمادہ تھا، اسی تضاد کی حالت میں علی گڑھ تحریک سر سید کے آخری زمانے میں پھر ایک دور اپنے پہنچ گئی جہاں راستہ سمجھانے والوں نے اسے تضاد سے باہر نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے نتائج بیسویں صدی میں ظاہر ہوئے اور علی گڑھ تحریک کے پورے راہوں کے انتخاب میں تقسیم ہو گئے لیکن اس مقالہ میں اس حد سے بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔

شفیق احمد شفیق

مجموعی سہائین کا پہلا مجموعہ

اوراک

صفحات ۱۲۴ - قیمت پچاس روپے

پتہ محلہ آبنگ نو DT/118 ڈیڑل بی ایریا کراچی

توازن اور نشانات کے بعد
 بہرِ صغیر پاک و ہند کے ممتاز مفکر
محمد علی صدیقی کے
 تاحسریہ زندگی کا ستارہ مجسمہ و عکاس

مضامین

چھپ گیا ہے

ہذا: ادا رتہ عصر نو ۵۹۱ سے بلاگجے، شہل نظام آباد ————— کرچی ۲۲

نماز عوام دوست شاعر
واحد بشیر

کے نظموں کا مجموعہ

کرن پھول

زیرِ طبع

پاکستان کی سیاسی صورتحال

روح مسعود

وقت بے گروٹ ہوئی ہے گزشتہ شمارے میں صورتحال کا تجزیہ کرتے ہوئے ہم نے دعویٰ کیا تھا کہ "۔۔۔ اس صورت حال میں صرف ایک بات برقی حد تک۔ جن میں سے کئی جاسکتی ہے کہ حکمران گروہوں کی نئی درپٹے سے مختلف مٹھادی تشکیل پاری ہے ملک کے جسد سیاسی پر اس سے گہرے اور گہرے اثرات مرتب ہوں گے " اور یہ کہ "۔۔۔ ملکی سیاست کے رخ اور مقلد گروہوں کی مٹھادی میں تبدیلی یا گریہ ہو چکی ہے اور موجودہ سیاسی خراں ای کا عمل ہے یہ ظاہر جنرل میاں الحق کے عہد سے قتل پر قاضی سینیٹسٹ۔ صرف ملکی معاملات بحیرہ جنوبی چلائے اور مسائل سے فیصلے میں نا کام رہے۔ جو چکی ہے ملک اپنے نا اطمینان امریکی انتظامیہ کی مدد شدہ عالمی اور علاقائی حکمت عملی میں بھی اپنی طاقت کھو چکی ہے عہد کے واقعات سے ہمارے تجربہ کی مدد قوت پر مرثیت آ رہی ہے۔ یہ صرف ہے جو ہے کہ عہد میں واقعات کے دواں مٹھوں ملکی اعلیٰ حلقوں اور شریف عمارت و وزارت ملکی کے حساب سے عہد کے جاپٹے میں عہد سول انتظامیہ میں سے بھی اس عہد کے مقلدوں کو نکال باہر رہے کی جیل کی حدی ہے قوتی کو۔ شانی میں پٹا ہی رہا جیسا ہے یہ عہدوں ہو چکی ہے اس سے دور آ رہا عالمی بینک سے دھارہ حاصل ہے وہ دور آ عظم کی سربراہی میں ہیں اقوامی مالیاتی اداروں اقوامی ایم ایف اور بینک اور سرمدیہ کے معین مملکت کے پسند کی معاشی پالیسی کو رائج کرے و مستحکم کرے کے مادی یا بھی۔ جسے معیار اور ناقد

جمع دوست کا ۱۵ بعد پھوسنے کھاتے داروں کا اثنا ہوتا ہے۔ مگر اس سے دیے جانے والے قرضے کی ۱۵ بعد سے زیادہ رقم چند بڑے کھاتے داروں کے حصے میں جاتی ہے۔ عوام کو معلومات کا یہ حق تو حاصل ہونا ہی چاہیے کہ ان کی جمع پونجی سے قرضے دیے جانے والے اسے لوٹاتے بھی ہیں کہ میں سال دو سال کے مناسب وقت سے بان بندوق کی ضرورت کی اشاعت ایک معمول بن جاتا چاہے مگر کھلے پن اور جواب دہی کو صرف اسی حد تک محدود کریں رہنا چاہیے۔ اعتدالت کے تمام تر استعمال اور قوی دوست کے تمام تر اخراجات کے لیے حکومتی اور ادارہ جاتی ماموں اختیار کو بڑا ہمارے عوام کو تفصیلی طور پر مطلع کرنے اور رکھے کے لیے قانون سازی کی بھی ضرورت ہے اور روایت کی تفکیک کی بھی۔ پچھلے قدم کے طور پر سولہیت کے تحقیقاتی کمیٹیوں اور کمیٹیوں کی رپورٹوں کی کھلی اشاعت کو لازمی قرار دیا جانا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی غیر سرکاری سطح پر تحقیقاتی کمیٹیوں کی قبولیت اور بہت فرازی کی جان چاہیے۔ اس ضمن میں ذریعہ ابلاغ کی ملکیت کا مسئلہ بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ عوام دوست اداروں اور تنظیموں کو صرف معلومات کے اپنے "ادارہ ذرائع" تکلیل دینے ہوں گے۔ مگر ان کے بھلق کے وسائل بھی خود ہی مہیا کرے ہوں گے۔ اس سمت میں ارتقاء کے دوسرے شمارے میں شامل جبب ایر، ایم جیو کا مقصود "سماجی انصاف کے لیے جدوجہد" گہری بصیرت کا حامل ہے اور ٹھوس رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس مقصود کو عوام دوستوں کے وسیع تر حقوق میں ہمیں ترجمان میں رہ کر جوڑ لایا جائے۔

نے دے دور پر مختلف پہلوؤں سے جوڑ کر کے ہے "رقاء سنی ٹیوٹ آف سوشل سائنسز اینڈ ریسرچ" کے راجہ اجسام ایک دورہ قوی سیمینار ۱۹ اور ۱۱ خسر کو رچی میں منعقد کیا جا رہا ہے اس میں چائیس کے قریب رہنما علم و دانش جن میں اساتذہ، کارکن، استاد، ویس اور عملی سیاست کار شامل ہوں گے "پاکستان میں جمہوریت امکانات اور دشواریاں" کے مودی عنوان کے تحت آٹھ مختلف ورکشاپوں میں اسے میاات، افکار، پیش کریں گے اس سیمینار کی سفارشات ملک کی سیاسی ماحولوں تک پہنچان چاہیں گی۔ حقیر سمجھتا ہوں کہ اس عمل کو شعوری طور پر متاثر کر کے کی ہر کوش اور تمام دوستوں کا اگلا قدم ہے۔ یہ بھی راہ ہے کہ اس سیمینار کے مقالات اور بحث کو جلد ہی مکمل شکل میں مرتب کر کے وسیع تر حلقوں تک پہنچا دیا جائے۔

کر چکی ہے جس سے روگردانی آنے والی کسی حکومت کے لیے آسان بات نہ ہوگی۔ ان اقدامات کے ذریعہ پہلے ہی آسان کی جھوٹی برقی مچھلی میں مزید اضافہ کر کے عوام پر بڑھ چڑھا کر بیرونی قرضہ جات کی ادائیگی کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔۔۔ کچھ اور اقدامات کے ذریعہ غیر پیداواری اخراجات میں کمی کی سہیل کی جارہی ہے۔ مگر سب سے بڑھ کر یہ ہوا ہے کہ چھلانگ نظم حکومت کی شکست اور بھت اب ایک حقیقت بن چکا ہے۔ اب سیاسی حلقہ کار اور بکران کا عمل نظم و نسق سے سیاست کاروں کی بے دخلی اور فوجی آمریت کے نکلنے کے بجائے انقلاب، نمائندوں کے چناؤ اور ان ہی میں سے حکومت کی تشکیل کی راہ ہموار کرنے میں تلاش کیا جا رہا ہے۔ یہ امر خوش آئند بھی ہے اور بہت افزا بھی۔ مستقبل میں محکمہ عدالت، سیاسی و معاشی پالیسیوں کے استحکام کا بھی یہی راستہ ہے۔ ابھی اس راہ کو اختیار نہ کرنے کی ہم بہت بھاری قیمت ادا کر چکے ہیں۔ اس دور کے اثرات کی زنجیروں کی بہت سی کڑیاں اب بھی ہمارے پائوں میں لگی ہوئی ہیں۔ ان کے رفتہ رفتہ زچہ دارانہ نظام کے پیداواری، ثقافتی اور نظریاتی نتائج ابھی بہت عرصے تک ہمارے سیاسی و سماجی حصار پر اثر انداز اور معاشرتی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنے رہیں گے۔ زراندوزی، زبان، علاقے، نسل، مذہب اور فرقوں کی بنیاد پر سیاست کاری اور غلط فہمی اثر و رسوخ کی بنا پر دھنکی کی حداری کا تسلسلہ بھی ابھی کافی عرصے تک چلتی رہے گا۔ مگر مال دولت کے بڑھتے ہوئے رسوخ و اثر اندازی کے سامنے عدل گرشت کی سرور آوردگی سپر انداز ہوئی چلی جارہی ہے۔ سرمایہ داری نظام نے میدان بہت لیا ہے مگر زچہ دارانہ نظام نے ابھی اعلیٰ طور پر ہار نہیں کھائی ہے۔ ہمارے ملک میں نیچتی ہوئی سرمایہ داری کے پچھچانے اقدامات اور شکست کھاتے ہوئے زچہ دارانہ نظام کی طرف سے جنگ مخلوق کے بائیں کشش سے یہ عہد عبارت ہے۔ عارضی حکومت کی طرف سے زرعی آمدنی پر ٹیکس کے نکلنا کا اعلان سرمایہ داری کا زچہ دارانہ نظام پر ایک تازہ حملہ ہے۔ دیکھا جائے کہ کیا پچھلے دو اعلانات کی طرح یہ اعلان بھی واپس لے لیا جائے گا؟ امکان یہ ہے کہ شاید اس بار ایسا نہ ہو سکے بلکہ شاید ذراعت کو صنعت قرار دینے کے لیے اٹھتی ہوئی تحریف کو از سر ماضت دور بھی ہو جائیں اور پھر اثر بھی۔

جمہوریت اگر کھلے پن اور جواب دہی سے عبارت ہے تو پٹانوں کی لاشٹ اور بینکوں کے نوادہ قرض لوگوں کی فلاح کی طاقت اسی سمت میں پھیلاؤ ہے۔ اس قدرت میں سیاست کار نوادوں کے ہاتھوں کی پٹک دیک میں یہ حقیقت اوچھل ہو گئی ہے کہ قرضوں کی کثیر رقم چھاتی، مصیبتی اداروں اور تھراؤوں کے نامہ واجب الادا ہے۔ تاہم ہر صورت میں یہ ایک صاحب قدم ہے۔ بینکوں میں

نیشنل بینک آف پاکستان اعلیٰ ترین کارناموں کو سراہتا ہے

منافع ۲۲۶ کروڑ روپے

ڈپازٹس میں اضافہ ۲,۲۹۳ کروڑ روپے

اثاثہ جات میں اضافہ ۳,۶۶۶ کروڑ روپے

۱۹۹۲ میں نیشنل بینک آف پاکستان نے ہر ایک سہولت گاہی کو حاصل کی ہے۔

قبل از ٹیکس منافع ۲۲۹ کروڑ روپے تک پہنچ گیا، جب کہ گنت شدہ ڈپازٹس میں ۱۲۹۳ کروڑ روپے کا اضافہ

مجموعی اثاثہ جات کی اہمیت میں ۳,۶۶۶ کروڑ روپے کا اضافہ ہوا۔

PRE-TAX PROFIT	
1991	1992
95	226
Increase during 1992	
131 - 138%	
Rupees in Crore	

DEPOSITS	
1991	1992
10,575	12,848
Increase during 1992	
2,293 - 22%	
Rupees in Crore	

TOTAL ASSETS	
1991	1992
16,333	19,999
Increase during 1992	
3,666 - 22%	
Rupees in Crore	

نیشنل بینک ہر شعبہ دیگر میں اپنے ۳۹ ملک خدمات، اداروں کی خدمات، بھارت کے کارپوریٹ اداروں، انکار، بھارت کے پاکستانی روپے پر بزنس کرنے والوں کے لیے ڈپازٹس پر نیشنل بینک شریعت منافع پیش کرتا ہے۔

ایک بلدیہ میں آپ کی رقم اور ان کے منافع کو حکومت پاکستان کی مکمل ضمانت حاصل ہے۔

آپ کی خدمت جہاں احتیاج
نیشنل بینک آف پاکستان
آپ کی خدمت مکمل ہے



میلنگ : آئی ایم سی سی سی ڈی ڈی پاکستان
Telephones: 2016/10 lines 2016/14 lines
Telex 27034 20730 20037 20133 20179 22180 ABBP/PK Fax: 2418789

خوبصورت - مضبوط - آرام دہ
منڈا



ہسٹریا کی سیریز میں
کی نمایاں خصوصیات

- خود شہادت گنہگار۔
• طاقتور اور کم فرائی و ذلیل انجمن
• غیر مسلم اور کفار کا وجود
• دشمنی کے ساتھ۔
• جینین اسپرٹس ملک بھر
• میں آسانی دستیاب۔



میتواند به عنوان یک منبع درآمد برای خانواده ها و به عنوان یک منبع درآمد برای دولت و به عنوان یک منبع درآمد برای مردم و به عنوان یک منبع درآمد برای...

تلفون: 0212 233 1234
فاکس: 0212 233 1235
e-mail: info@...
www.

[illegible]

گزارش سالانه ۱۳۹۵
سال مالی ۱۳۹۴

ارتقاء

کے خصوصی گوشے

ارتقاء کے ا شماروں میں اب تک چھ قومی اور بین الاقوامی اہمیت کے موضوعات پر خصوصی گوشے شائع کئے گئے ہیں جو ساٹھ سے زیادہ دانشوروں ادیبوں اور شاعروں کے طبع زاد مقالات، تراجم، شعری تخلیقات اور تبصروں پر مشتمل ہیں، پاکستان کو درپیش مسائل کی تفہیم اور بدلتی ہوئی عالمی صورت کے ادراک کے لیے ارتقاء کے یہ گوشے حوالہ جاتی اہمیت کے حامل ہیں۔

شمارہ نمبر ۱	آزادی سوہوم	—
شمارہ نمبر ۲	پاکستان میں جمہوریت	—
شمارہ نمبر ۳	آزادی انظار	—
شمارہ نمبر ۵، ۶، ۷	لسیت، تناظر و تجزیہ	—
شمارہ نمبر ۸، ۹، ۱۰	اشرکیت کا بحران (نظریہ و عمل)	—
شمارہ نمبر ۱۱	سندھ - مسائل، تناظر اور تجزیہ	—